مشہور زمانہ تمباکو کی دوکان

صاف اور عمدہ تمباکو

ہمارے تمباکو کی خصوصیات

(۱) کوئی ایسی نشیلا [illegible] نہیں کی جاتی جس سے کوئی نشہ [illegible] پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

(۲) کوئی ایسا مسالہ یا ایسی خوشبو شامل نہیں کی جاتی جس سے تندرستی کے لئے خطرہ ہو۔

(۳) کشیدنی تمباکو میں ان اجزاء کے ملانے سے پرہیز کیا جاتا ہے جن سے پھیپھڑے کو نقصان پہنچے

(۴) پیلی مرچ ملاکر زیادہ سستا بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔

لہٰذا ہماری دوکان کا "پتہ یاد رکھئے" اور ہمیشہ تمباکو ہمارے یہاں سے خریدئے۔ کبھی دھوکا نہ کھائیے گا۔ ہمارے لیبل پر بانیٔ فرم کا فوٹو ہوتا ہے۔ یہی ہمارا ٹریڈ مارک ہے۔ تمباکو خریدتے وقت **شیخ منظور حق** کا **فوٹو** دیکھکر خریدیے۔ نقلی فرم سے نقلی مال خرید کر نقصان نہ اُٹھائیے۔

نرخ

تمباکو باریک قسم اوّل	تمباکو باریک قسم دوم	تمباکو موٹا قسم اوّل	تمباکو موٹا قسم دوم
ایک روپیہ کا آدھ سیر	ایک روپیہ کا ایک سیر	ایک روپیہ کا تین پاؤ	ایک روپیہ کا ایک [illegible]

خمیرہ مشکی	خمیرہ زعفرانی	خمیرہ لونگیا	یاد رکھئے: مرادآبادی سیر کا وزن
ایک روپیہ کا ایک سیر	ایک روپیہ کا دو سیر	ایک روپیہ کا تین سیر	ایک سو روپیہ بھر ہے

شیخ شمس الدین منظور حق تاجرانِ تمباکو بازار چوک مرادآباد (یو۔پی)۔

ڈاکوؤں کو بھگانے والا
خوفناک امریکن پستول
خوفناک لمبی نالی
اصلی پستول کی طرح اس میں کارتوس رکھنے کی چرخی بنی ہوئی ہے اور اس کے اندر چھ
خانے بنے ہوئے ہیں ان چھ خانوں میں چھ کارتوس آجاتے ہیں گھوڑا دبانے سے
چرخی خود بخود گھومتی ہے اور کارتوس کی اس زور سے چھوٹنے کی آواز آتی ہے کہ خود چھوڑنے والا
بھی حیران رہ جاتا ہے اپنی جان و مال کی حفاظت کیلئے اس پستول سے بہتر اس وقت کوئی
ہتھیار نہیں ہے اس میں ½ انچ لمبے کارتوس چلتے ہیں اس پستول کا وزن ۱۵ اونس
ہے۔ لمبائی ۶ انچ ہے انسان دور سے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے قیمت ایک پستول کی
چار روپیہ آٹھ آنے اس کے ساتھ ۲۵ کارتوس
ملیں گے محصول ڈاک ایک پستول پر گیارہ آنے
ملنے کا پتہ:
ایجنٹ بی۔ کے برادرس اینڈ کو نمبر ۵ دہلی
دو منٹ میں طاقت
امریکن ڈاکٹر کی حیرت انگیز ایجاد "رجوینیٹنگ آئل"
یہ وہ حیرت انگیز ایجاد ہے جس کے ایک قطرہ میں مردی طاقت
لگائیے اور فوراً دیکھئے
امریکن ڈاکٹر
قیمت فی شیشی دو روپیہ سات آنے۔ محصول ڈاک
آنے خرچ ہونگے پتہ:۔
اکسیری دواخانہ کلاں محل نمبر ۵ دہلی
نصف گھنٹے تک
امساک کی ایسی دوا جو حقیقتاً بے ضرر اور فائدہ میں زود اثر ہو بڑی مدت کے بعد ہم کو
دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں مضر صحت یا نشہ آور جزو ذرہ برابر نہیں
اکسیری دوا تسلیم کرلی گئی ہے کہ جس کی مثال نہیں مل سکتی
تک اثر رہتا ہے
دور کرنے اور شرمندگی سے بچانے میں بے مثل ایجاد ہے۔ قیمت
فی شیشی ایک روپیہ محصول ڈاک سات آنے۔
پتہ
اکسیری دواخانہ کلاں محل نمبر ۵ دہلی
محبوب آپکا غلام
پر اسرار مست خوشبو
ایک قسم کا روغن ہے جسکو اگر کوئی عورت سونگھ لے تو مست ہو جائے
تمہاری تلاش میں رات دن ایک کردیگا۔ خوشبو میں ایسی تاثیر ہے کہ جو سونگھتے ہی مطلوب بے چین ہو جاتا ہے اور
دن رات ایک کر دیتا ہے اسکو محبت کا جادو
ذاک خرچ آٹھ آنے علاوہ۔
گڈ لک ٹریڈ ایجنسی دریا گنج دہلی

ماہنامہ مسافر مراد آباد

جلد (۳)　فہرست مضامین بابتہ ماہ جولائی ۱۹۴۰ء　نمبر (۱۱)

عادل ادیب مہتمم اسلامیہ مسافر خانہ نے یونین الیکٹرک پریس [illegible] میں چھپوا کر دفتر رسالہ مسافر متصل ریلوے اسٹیشن سے [illegible]

ادبیات اردو کا مستقبل

اردو ادبیات کا مستقبل کسقدر شاندار اور درخشاں ہے اسکا اندازہ اُن نوجوان ادیبوں اور انقلابی مفکروں کی کاوشِ دماغی اور تحریک ادبی سے کیا جا سکتا ہے جو "ستائش کی تمنا" اور "صلے کی پروا" سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن فکر و تخئیل کی ایک نئی دنیا بنانے میں مصروف ہیں۔ یہ نئی دنیا نوجوان دماغوں کے اوجھل گوشوں اور پرجوش دلوں کے خاموش زاویوں میں بن رہی ہے۔ گو اسوقت اردو ادب رومان و حقیقت یا تخئیل و واقعیت کے ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے اور بظاہر ماضی بعید و مستقبل قریب کے سماجی، فکری اور ادبی رجحانات دست و گریباں نظر آتے ہیں مگر کشمکش اور نزاع کے اس دھندلے غبار کے پیچھے نئی ادبی زندگی کا سورج پوری درخشانیوں سے چمک رہا ہے، جس کی تابناک شعاعیں جہل و ظلمت کے دبیز پردوں کو چیر کر ہماری سرزمینِ تخئیل کو برابر روشن و منور کر رہی ہیں

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ہمارا ادب ترقی کی صدہا منزلیں طے کر چکا ہے مگر ابھی ملک حد منزل تک پہونچنے کے لئے چند بنیادی قدم اُٹھانے کی اور ضرورت ہے۔ وہ چند بنیادی قدم کیا ہیں۔۔۔؟

ہماری سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم ادبی میدان میں زندگی کے نئے تقاضوں اور معاشرت کے تازہ ترین مطالبوں کا ساتھ دیں۔ نثر ہو یا نظم۔۔۔ فکر و بصیرت کے ہر گوشے میں ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ اب ہمارے سامنے نئے نئے مسائل در پیش ہیں نئے نئے فکری رجحانات سے ہمیں عہدہ برآ ہونا ہے۔ انصاف کیجئے کیا قدیم ماضی کے بوسیدہ تصورات اس منزل میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں؟ گل و بلبل کا دور گذر چکا۔ شمع و پروانے کا عہد ختم ہوا، ناز و نیاز کی راتیں بسر کی جا چکیں، ہجر و وصال کے دن بیت گئے مگر ہم ہیں کہ ابھی تک ماضی کے ربابِ شکستہ سے زندگی کے نئے نغمے سننا چاہتے ہیں

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ! نشانِ جگر سوختہ کیا ہے (غالب)

اردو کی ادبی تحریک کے موجودہ مرحلے پر اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر سردست ہم انھیں چند معروضات پر اکتفا کرتے ہیں

کہ نغمۂ نازک و احباب پنبہ در گوش اند

موجودہ جنگ اور صحافت

موجودہ جنگ کی تباہ کاریوں اور ہلاکت باریوں کا اندازہ فقط میدانِ جنگ ہی میں نہیں کیا جا سکتا بلکہ تجارتی بازاروں معاشرتی مرکزوں اور صحافتی اداروں سے بھی اس عظیم ترین انسانی حادثے کی آشوب انگیزیوں اور بربادیوں کا افسانہ سنا جا سکتا ہے۔ ہم کیوں کہیں کہ اس عالمِ آشوب و تشویش میں مسافر پر کیا گذر رہی ہے؛ ہر اخبار اور رسالہ زبانِ حال

سے اپنی تباہی کی داستان سنا رہا ہے۔ اگر آپ اس مصیبت بھری داستان کو نہیں سنتے تو یہ آپ کا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملکی صحافت اسوقت حد درجہ نازک حالات میں محصور ہے۔ کاغذ کی گرانی، سامانِ طباعت کی گرانجانی اور پھر قدردانانِ ادب کی تغافل سامانی، غرض

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

قدردانانِ مسافر

مگر ہم اِن حالات پر مایوس نہیں، مسافر گذشتہ دس ماہ سے برابر ترقی کر رہا ہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ہماری وہ امیدیں ہنوز تکمیل کی محتاج ہیں جنکی گرمی آغاز کار میں ہمارے لئے نشاطِ حیات اور ولولہ کار کا سامان تھی

آں قدر تلخی کہ از غم خواستم در غم نہ بُد

انیس کا سالنامہ

انیسؔ الہ آباد کا ایک معزز ترین اور رنگین ترین ادبی ماہنامہ ہے جس پر کسی گذشتہ اشاعت میں ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ حال ہی میں اسکا ضخیم سالنامہ جو اپنی ظاہری اور معنوی رعنائیوں کی وجہ سے حد درجہ جاذبِ نگاہ اور جالبِ ذوق ہے دفتر مسافر کو وصول ہوا ہے۔ اس بلند پایہ نمبر کے تمام افسانے، تمام مضامین اور تمام نظمیں مدیر محترم کی بلندیِ ذوق اور رفعتِ فکر کی آئینہ دار ہیں۔ بلاشبہ انیس اسوقت شمالی ہند کے تمام نوجوان رسائل میں امتیازی خصوصیات کا مالک ہے۔

دو کتابیں

صنفِ نازک کی مدیرۂ محترمہ بہن عنایت مجید بیگم کے مرحوم برادرِ عزیز کی دو طبعزاد کتابیں:۔ فردوسِ افکار اور مزدور کی بیٹی بغرض تبصرہ دفتر کو موصول ہوئی ہیں۔ یہ درحقیقت ترقی پسند افسانوں اور سرگذشت کا مجموعہ ہیں۔ جواں مرگ مصنف کا اندازِ بیان ہر جگہ بے انتہا شگفتہ اور دلآویز ہے

امید ہے کہ قدردانانِ ادب دفتر مسافر سے ہر دو کتب طلب فرماکر اپنے ادبی ذوق کی تسکین فرمائیں گے۔

چند نئے رسائل

اس کے علاوہ چند نئے رسائل و جرائد دفتر کو بسلسلۂ نقد و نظر موصول ہوئے ہیں مثلاً ہفت نامہ "ظفر" بمبئی، مجاہد و کیلی لاہور، رائی گزٹ کانپور، وغیرہ امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس طرف توجہ کی جا سکے گی

معاصرین سے

مسافر پر اکثر معاصرین تبصرہ فرما چکے ہیں مگر ابھی تک چند معاصر رسائل نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ کیا انھیں اس ضروری فرض کی ادائگی کے لئے کسی مستقبل بعید کا انتظار ہے؟ (مدیر)

ضرورت رشتہ ایک بست سالہ شریف خاندان اور تعلیمیافتہ شیعہ نوجوان کیلئے جو ایک سو دس روپیہ ماہوار کا مستقل سرکاری ملازم اور ایک ترقی پذیر عہدے سے وابستہ ہے۔ ایک ایسی خوبصورت تعلیمیافتہ، شریف النسل دوشیزہ کی ضرورت ہے جو امورِ خانہ داری میں ماہر ہو۔ تمام خط و کتابت بصیغہ راز رہیگی

ضرورتِ رشتہ ایک شریف خاندان تعلیمیافتہ حنفی المذہب نوجوان سرکاری عہدیدار کیلئے جسکی ماہانہ آمدنی تقریباً ۱۵۰ روپیہ ہے ایک خوبصورت تعلیمیافتہ اور امورِ خانہ داری میں ماہر دوشیزہ کی ضرورت ہے۔ تمام خط و کتابت راز میں رہے گی۔

ضرورت رشتہ ایک شریف و معزز تعلیم یافتہ دوشیزہ کیلئے ایک ایسے رفیقِ حیات کی ضرورت ہے جو معقول حیثیت والا اور تعلیم یافتہ ہو۔ جملہ خط و کتابت بصیغہ راز رہے گی۔

تمام خط و کتابت (معرفت ایڈیٹر رسالہ مسافر مرادآباد) ہونی چاہیے

——— سن لو اے دو جگ کے داتا منگتا مانگے جائے ——— بابا

——— لے کے حیات آیا ہے کاسہ کچھ قسمت کا پائے ——— بابا

سبز رہے یہ کھیتی ہمیشہ پھولے پھلے گلزار ———

آیا ہوں میں دیکھ کے در پر اونچا سا دربار ———

نورِ خدا سے جگمگ جگمگ ہے ساری سرکار ———

بھیک ملے کچھ بھیک، بھکاری بھیک ملے تو جائے ——— بابا

——— بابا منگتا مانگے جائے ——— بابا

جوگ گنوا کر سننے پڑے ہیں اک دنیا کے بول، ———

پھرتا ہے آزاد بھکاری سارے بندھن کھول ———

بھر دو دُر مقصد سے بھر دو آشا کا کشکول، ———

کب سے کھڑا ہے در پر لو نذرانہ امن کو پھیلائے ———

______ بابا منگتا مانگے جائے ______ بابا

دیسوں دیسوں خلقت دیکھی کوئی نہ پوچھے بات ______
عشق و وفا کے جوگی بنکر پھرتے ہیں دن رات ______
لطف و کرم کا صدقہ، دید و رحمت کی خیرات ______
آکے تمہارے در پہ سوالی جو مانگے سو پائے ______

______ بابا منگتا مانگے جائے ______ بابا

ہاتھوں کا چمٹا، آنکھوں کا چمبل، کنٹھ گلے کا راگ ______
شرم کا کمبل، من کا نشہ، وحشت کا بیراگ ______
اشکوں کی مالا، آہ کی دھونی سوزِ نہاں کی آگ ______
راکھ ملی درگاہ کی تن پر، سادھو بن کر آئے ______

______ بابا منگتا مانگے جائے ______ بابا

حق نے رکھا ہے سر پہ تمہارے جود و سخا کا تاج ______
حرص و ہوا کی جھولی لے کر آیا ہے محتاج ______
صدق و صفا کے ٹکڑے دیدو، صبر و رضا کا ناج ______
حسن کی چٹکی، عشق کا آٹا، آگے سخی کی رائے ______

______ بابا منگتا مانگے جائے ______ بابا

"میک اَپ" یا صورت گری موجودہ فلمی وتمثیلی دنیا کا ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے اور اس فن نے اب اتنی ترقی کرلی ہے کہ اسٹیج پر اصل ونقل کا امتیاز مشکل ہوگیا ہے۔ ایک اداکار بیک وقت اتنے عجیب وغریب بہروپ بدل لیتا ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ امتیاز مشکل ہوجاتا ہے کہ آیا یہ وہی ایکٹر ہے جو چند لمحے پہلے ایک جوان رعنا کی شکل میں ڈرامے کے اندر کام کر رہا تھا یا درحقیقت کوئی شکستہ کمر بوڑھا ہے جو زندگی اور پیری کی تمام نحوستوں اور شوریدہ سریوں کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوگیا ہے۔ لیکن ابھی تک ہندوستانی تھیٹر فن صورت گری کی اس بلندی اور نفاست سے آشنا نہیں ہوا اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان "میک اَپ" (صورت گری) کی ابجد سے بھی واقف نہیں اس فن کا کمال تو یہ ہے کہ شناخت وامتیاز کا احساس ہی باقی نہ رہے ہم ذیل میں امریکہ کے مشہور اداکار مفنی لیگ کے خیالات وتجربات ذیل میں درج کرتے ہیں۔ مفنی یورپ وامریکہ میں صورت گری کا استاد تسلیم کیا گیا ہے ضرورت ہے کہ ہم اس شہرۂ آفاق اداکار کے تجربات کی روشنی میں ہندوستانی صورت گری اور میک اَپ کا مطالعہ کریں یہ دلچسپ مضمون درج ذیل کیا جاتا ہے مفنی لیگ لکھتا ہے کہ:۔

جب میں بچہ تھا تو مجھے ہمیشہ متنبہ کیا جاتا تھا کہ شریر پریاں رات کے وقت میرے پاس آئیں گی اور مجھے ایک خوفناک شکل میں تبدیل کردیں گی

اور چونکہ صورت گری کے فن سے غیر معمولی دلچسپی رکھنے کی وجہ سے مجھے بعض اوقات خطرناک بھیس بدلنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا اکثر اوقات مجھے اس پیشین گوئی کے کچھ نہ کچھ صحیح ہونے کا تجربہ ہوا ہے۔ میک اپ کے فن میں کوئی نہ کوئی چیز ساحرانہ ضرور موجود ہے آپ غور تو کیجئے کہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی رنگین چھڑیوں (جن سے

بھیس بدلا جاتا ہے) کی بدولت ایک ماہر فن صورتگری کس قدر چابکدستی اور مہارت سے چند لمحے میں اپنی شکل تبدیل کرلیتا ہے اور آپ دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ آیا یہ وہی شخص ہے جو چند لمحے پیشتر دوسرے رنگ وروپ میں ہمارے سامنے موجود تھا۔

لباسوں کی تبدیلی کے معاملے میں میری مہارت قابل رشک ہے اور بغیر کسی تامل کے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اس آرٹ میں کامیاب رہا ہوں۔ اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ

میں بچپن ہی سے فنون لطیفہ کا شیفتہ تھا۔ خصوصاً رنگ آمیزی اور صورت گری میں میرا جواب نہ تھا۔ آغاز جوانی میں کچھ مدت میں نے معماری کی ٹریننگ میں صرف کی اور واقعہ یہ ہے کہ فن تعمیر سے قریبی رابطہ رکھنے کی وجہ سے میک اَپ کے معاملے میں مجھے کافی مدد ملی

اس فن کے سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ قیمتی مدد مسٹر نیٹ لوئی لیکورٹ کی مصاحبت سے ملی مجھے ابتدا میں کوئی خاص کام تو تھا نہیں، لہٰذا جو وقت بھی مجھے ملتا میں ڈریسنگ روم میں چلا جاتا۔ اور میک اَپ کی مختلف شکلوں کی کوشش کیا کرتا۔ لوئی لیکورٹ نے اس چیز کو محسوس کر کے میری امداد شروع کر دی اور اس فن کے رموز و نکات کی تعلیم میں اُنھوں نے اپنی بہترین قوتیں صرف کر دیں سب سے زیادہ مشکل "میک اَپ" جو میں اَب تک کر سکا ہوں وہ "مسٹر وُو" کے کردار کے سلسلے میں پیش آیا تھا۔ یہ صورت گری، تقریباً دو گھنٹے کی شدید محنت کے بعد عمل میں آئی تھی معمولی میک اَپ میں تو آپ مختلف رنگوں کے ہوشیارانہ استعمال سے چہرے پر سایہ اور روشنی کو کامیابی سے پیدا کر سکتے ہیں مگر یہ میک اَپ ان تمام صناعیوں سے جداگانہ نوعیت رکھتا تھا "مسٹر وو" کو اسٹیج پر ایک ادھیڑ عمر چینی کی حیثیت سے پیش کیا جانے والا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے یورپی چہرے پر چینی خد و خال اور رنگ روپ پیدا کر لینا کس قدر مشکل ہے مگر میری مہارتِ فن اور دقت پسندی نے اس مشکل کو بھی حل کر لیا۔ پہلے میں نے انتہائی محنت اور حد درجہ نزاکت سے اپنے چہرے پر سیاہ بھاؤں پینٹنگ کیا۔ اور اس کے بعد چند دوسرے رنگوں کو استعمال کیا۔ اس طرح میرے چہرے پر وہ بے کیف چمک پیدا ہوگئی جو ان مشرقیوں (چینیوں) کی خصوصیات میں داخل ہے۔ کہنے کے لئے تو یہ ایک معمولی سی بات ہے مگر درحقیقت اس کو صرف ایک ماہرِ فن ہی سمجھ سکتا ہے کہ مختلف رنگوں کے امتزاج سے کس طرح چہرے تبدیل کئے جا سکتے ہیں؟

ایک دوسرے موقعہ پر اس سے بھی زیادہ پر لطف واقعہ پیش آیا۔ صورت یہ ہوئی کہ میں ایک کیمرے کے سامنے کام کر رہا تھا۔ میرے کردار کی خصوصیات کے پیش نظر تجویز ہوئی کہ میرے سر کے لمبے لمبے بالوں کو اس طرح تراش دیا جائے کہ دور سے یہ محسوس ہو گویا میں ایک لانبا ہیٹ لگائے ہوئے ہوں۔ پروڈیوسر (فلمساز) نے قہقہہ لگا کر اس تجویز کی تائید کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرانسیسی حجام کی مدد سے میں اپنے بالوں کو اس طرح ترتیب دینے میں کامیاب ہوگیا نگار خانے سے فارغ ہو کر جب میں گھر پہونچا تو تاخیر کی وجہ سے میری بیوی سخت پریشان تھی، اس نے چھوٹتے ہی کہا

"پیارے تم نے ڈنر کا وقت بھی گذار دیا!"

میں معذرت کر کے کھانے کی میز پر جا بیٹھا اور ابھی ہم دونوں نے لقمہ بھی نہ اُٹھایا تھا کہ اس نے تعجب سے دریافت کیا:-

"آخر یہ آج تم اپنا یا ڈلبر (لانبا گول ہیٹ) کیوں نہیں اُتارتے؟"

اس کے اس سوال پر میں ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ اور جب یہ راز میں نے بتایا تو اسے حیرت کیا تھی کافی ناگواری بھی ہوئی میں تقریباً چھ ہفتے تک اسی طرح رہا اور کسی نے بھی مجھے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ ہے میک اَپ کا کمال اور معجزہ!

تھیٹر اور سنیما کے میک اَپ میں فرق

تھیٹر اور سنیما کے میک اَپ میں کافی فرق ہے۔ تھیٹر میں

آپ بڑی بڑی لائنوں (خطوط) میں پینٹنگ کرسکتے ہیں۔ وہ اسٹیج پر یہ چیز بھی جاتی ہے مگر سینما کے سلسلے میں عکاسی کے کیمرے کی تیز آنکھیں اس قسم کی کمزور اور عارضی رنگ آمیزی (پینٹنگ) کو پسند نہیں کرتیں۔ یہاں رنگ آمیزی کا طریقہ غیر معمولی طور پر پیچیدہ ہے جس طرح ایک آرٹسٹ کسی مومی مجسمے یا تصویر میں انتہائی نزاکت سے مختلف رنگ بھرتا ہے اسی طرح ایک فلمی اداکار کو بھی اسکرین پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے انتہائی فن کاری اور صناعی سے پینٹ کرنا چاہئے چہرے پر کھردرا پن اور خشونت قطعی نہ رہنی چاہئے۔ بلکہ جلد انتہائی نرم اور ملائم ہونا کہ رنگ چہرے پر نکھر سکیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسٹیج پر کام کرنے والا دھندلی روشنی میں، تماشائیوں سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر رہتا ہے اور اسی لئے میک اپ کی اندرونی خامیاں بمشکل نظر آسکتی ہیں مگر پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہونے والا اداکار کیمرے سے صرف چند سنٹ کے فاصلے پر طاقتور روشنیوں کے سائے میں کام کرتا ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا بعض اوقات اسٹیج پر بھی ایسے حیرت انگیز معجزے دکھانے پڑتے ہیں جنکو میک اپ کا کمال کہا جاسکتا ہے۔

مسخرہ اور شاہزادہ

اس سلسلے میں آپ کو میں اپنا ہی ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں:-

"میں لائسم تھیٹر میں کام کررہا تھا اور اتفاق سے مشہور ڈرامہ مغرور شہزادہ' اسٹیج پر آنے والا تھا۔ اس شہرۂ آفاق تمثیل میں مجھے دو کردار سپرد کئے گئے تھے۔ ایک مغرور شہزادے (ولی عہد سسلی شہزادۂ رابرٹ) کا۔ دوسرا دربار کے مسخرے کا آپ آپ ان کرداروں کے تضاد پر غور کیجئے، کہاں ایک عالی مرتبت شاہزادہ اور کہاں ایک درباری مسخرہ۔ ان دونوں کرداروں کا بیک وقت نبھانا کس قدر مشکل ہے۔ اس کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے، جن لوگوں نے وہ کھیل دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ مغرور رابرٹ کو ایک فرشتہ بددعا دیکر ذلیل مسخرے کی شکل میں تبدیل کردیتا ہے۔ منظر یہ تھا کہ فرشتہ آندھی اور طوفان کے ساتھ ظاہر ہوا، اس وقت بجلی بڑے زور سے چمک رہی تھی۔ شہزادے کو عاجزانہ زمین پر گڑگڑاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اسٹیج پر پتھر کی چٹانیں اور منظر کو بھیانک کردینے والی دوسری چیزیں موجود تھیں۔ انھیں مصنوعی، چٹانوں کے پیچھے نقلی داڑھیاں، مختلف رنگ پیدا کرنیوالی چھوٹی چھوٹی چھڑیاں اور بھیس بدلنے کے دوسرے سامان موجود تھے۔ اور یہ سب سامان میرے لئے طیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ مجھے اس منظر میں شاہزادے کے روپ سے مسخرے کے روپ میں منتقل ہونا تھا۔ میرا ڈریسر لباس تبدیل کرنیوالا چٹان کے پیچھے تمام سامان سے لیس تھا۔ اور جب میں بجلی اور طوفان کے ڈر سے لرز رہا تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ منظر کی ہیبت ناکی سے میرا بند بند کانپ رہا ہے تو ٹھیک اس وقت میں شہزادہ کا ڈریس اتار کر مسخرے کا لباس پہن رہا تھا۔ صورت یہ تھی کہ شاہانہ لباس کے نیچے مسخرے کی چست ریشمی قبا میرے جسم پر موجود تھی۔ اس ریشمی قبا میں ربڑ کی دو نلکیاں پیوست تھیں۔ ایک کا سرا میرے منہ کے قریب تھا اور دوسرا سرا پشت پر۔ جب میں اُن نلکیوں کو پھونکتا تھا تو اُن میں ہوا بھر کر وہ پھول جاتی تھیں اور اس طرح سینے پر اُبھار اور پشت میں خمیدگی کی بے ہنگم کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔ چنانچہ جب طوفان ختم ہوا تو بھیس بدلا جاچکا تھا اور اب اسٹیج پر خوبصورت شہزادے کی بجائے ایک بیوقوف کبڑا اور بدصورت مسخرہ موجود تھا۔ لیکن تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس کارنمایاں نے

اصل مقصد فوت کر دیا یعنی تمام تماشائی چلا اُٹھے کہ "ارے یہ تو کوئی دوسرا آدمی ہے یہ تو مبتھن لیگ کسی طرح بھی نہیں"۔

اگرچہ یہ بھی میرے کمال کی ہی داد تھی مگر ان کا یہ سمجھ لینا کہ میرے بجائے کوئی دوسرا شخص سائڈ سے نکل آیا ہے درحقیقت میرے میک اَپ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے تھا تقریباً اسی قسم کا ایک واقعہ دوسری مرتبہ بھی پیش آیا۔

فولادی نقاب

ہوا یہ کہ "لائسئم تھیٹر" نے ایک کامیاب ڈرامہ طیار کیا "فولادی نقاب" اس کھیل میں بھی مجھے دو کیرکٹر دئے گئے ایک لوئی چہارم کا اور دوسرا ایک ایسے شخص کا جو فولادی نقاب ڈالے رہتا ہے۔ اس شخص کے متعلق یہ فرض کیا گیا تھا کہ بچپن ہی سے فولادی نقاب ڈالے ہوئے ہے۔ یہاں تک کہ اسکی داڑھی مونچھیں نکلکر اس آہنی نقاب میں پیوست ہوگئیں۔ یہاں بھی تمام میک اَپ اسٹیج پر ہی کیا تھا۔ انتظام یہ کیا گیا تھا کہ اس منظر میں اسٹیج کے اوپر ایک لانبا ستون قائم کیا گیا تھا اس ستون کے عقبی حصے میں ایک خفیہ دراز تھی۔ اس دراز کے اندر صورتگری اور رنگ آمیزی کا تمام سامان موجود تھا۔ ہم نے اسی خفیہ دراز کے قریب ستون کی آڑ میں ایک دوسرے شخص کو بھی لوئی چہاردہم کے لباس میں چھپا دیا تھا، یہ میرا مثنیٰ تھا اور مجھے چند لمحے کے لئے اس سے کام لینا تھا، اتنی دیر کے لئے کہ میں ستون کی آڑ میں لوئی چہاردہم کا لباس اتار کر دوسرے شخص کا لباس پہن لوں اور یہ شخص اتنی دیر کے لئے اسٹیج پر لوئی کا لباس پہنے ہوئے میری قائم مقامی کرے۔ سب سے پہلے میں لوئی چہاردہم کے لباس میں اسٹیج پر آیا اور موقعہ پر حد درجہ صفائی کے ساتھ ستون کی آڑ میں چھپ گیا اور میرا قائم مقام اچانک میری جگہ آ گیا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ یہ کیا تماشا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے دوسرا بھیس بدل لیا اور پھر میرا مثنیٰ اُسی صفائی سے میری جگہ آ کر چھپ گیا۔ اور میں دوسرے کیرکٹر کے روپ میں تماشائیوں کے سامنے آ گیا۔ اس وقت پورے تھیٹر ہال پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اور لوگ یہ نہ سمجھ سکے کہ اُن کی نظروں کے سامنے لوئی چہاردہم کس طرح نقاب پوش بن گیا۔ اس منظر میں سب سے بڑی، صفائی میرے میک اَپ کی تھی کیونکہ چند سکنڈوں میں لوئی کے بھیس سے نقاب پوش کے روپ میں آ جانا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ ہزاروں تماشائیوں کی نگاہیں حیرت و استعجاب کے عالم میں اسٹیج کے کونے کونے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

آوارہ گرد یہودی

سب سے زیادہ مشکل صورت گری اور رنگ آمیزی، مجھے "آوارہ گرد یہودی" نامی کھیل میں پیش آئی۔ اس ڈرامے کے ہر منظر میں مجھے از سر نو میک اَپ کرنا پڑتا تھا اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہ ہر روپ جو میں بدلتا تھا اس میں ہیرو (یہودی) کی عمر کے مختلف مدارج اور جس طرح مختلف تجربات سے اس کی روح ترقی کر رہی تھی اسے ظاہر کرنا تھا۔ یہ یقیناً ایک دقیق اور مشکل ترین ذمہ داری تھی جس میں مجھے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی

"اسکارلٹ پمپرنل کی فتح" نامی کھیل میں میں نے پمپرنل اور ریٹیو کا پارٹ ادا کیا۔ ریٹیو جہاز سے کوئلہ اٹھانے والا ایک دِق زدہ مزدور معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف "سر پرسی بلیکی" کا کردار تھا جو ایک فیشن پرست نواب زادہ تھا۔

ظاہر ہے کہ دونوں کیمرہ آپس میں مختلف تھے۔ یہ میک اپ میں جب بھی کرتا تھا پورا ایک گھنٹہ صرف ہوتا تھا اور مجھے مجبوراً فوٹوگرافی سے کام لینا پڑتا تھا تاکہ بال کی برابر بھی صورت گری میں فرق نہ آئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو ڈرامائی مناظر فلمبند کئے جاتے ہیں ان کی فوٹوگرافی متعدد دفعوں کے بعد مکمل ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر میک اپ میں ذرہ برابر بھی کمی رہ گئی تو کیمرہ اس کو کہنہ ریکارڈ کرے گا۔ اور میک اپ کا تمام اثر زائل ہو جائیگا۔ اب میں ناصحانہ حیثیت سے ان لوگوں کے لئے کچھ کہنا چاہتا ہوں جو اس فن میں کمال پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

پہلے اپنے چہرے کی ساخت اور خد و خال کا گہرا مطالعہ کرو اور پھر اسی کی مناسبت سے پینٹنگ کرو اس سلسلے میں تقلید بیکار محض ہے ذاتی طور پر میں جب کبھی کسی فلم میں حصہ لینا چاہتا ہوں تو نیشنل میوزیم میں چلا جاتا ہوں اور پرانے تصویری شاہکاروں کا بغور مطالعہ کرتا ہوں اور ان کا ایک ایک نقش اپنے ذہن پر مرتسم کر لیتا ہوں اور پھر اپنے اوپر اس کی مشق کرتا ہوں یاد رکھو ماہر صورت گری پیدا نہیں ہوتا۔ پیدا کیا جاتا ہے لیکن یہ راستہ آسان نہیں بلکہ حد درجہ دشوار گذار ہے۔

اس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے زبردست قوت مشاہدہ تیز نظری اور چابک دستی کی حد درجہ ضرورت ہے اور جب اداکار یہ محسوس کر لیتا ہے کہ رنگ آمیزی کے آلات اس کے اشاروں پر کام کر رہے ہیں تو ناقابل بیان مسرت ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ایکٹر میں یہ لیاقت پیدا ہو جانی چاہئے کہ وہ مجمع میں ہر شخص کو متاثر کر دے۔ ظاہر ہے کہ کامیاب اور حقیقت آمیز میک اپ کے بغیر یہ چیز محال ہے۔

اب ہم ہیں اور جلوۂ جانانہ ان دنوں
دونوں جہاں سے ہو گئے بیگانہ ان دنوں
پھر دل کو اضطراب ہے نظریں ہیں بیقرار
چھیڑا ہے کس نے درد کا افسانہ ان دنوں
پھر دل ہوا ہے محوِ خیالِ رخِ بتاں"
پھر ہر گھڑی ہے ذکرِ صنم خانہ ان دنوں
اک میں کہ شوقِ دید میں پھرتا ہوں دربدر
اک وہ کہ ہو کے پھرتے ہیں بیگانہ ان دنوں
گھبرا کے پوچھتا ہوں کہ کیا آگئی بہار!!
قابو میں کیوں نہیں دلِ دیوانہ ان دنوں
پھر عشق نے دئے سبق حسن کو دئے،
پھرتا ہے گردِ شمع کے پروانہ ان دنوں
چھیڑے گئے ہیں بادۂ عرفاں کے تذکرہ
کس جوش پر ہے محفلِ رندانہ ان دنوں
شادابیٔ بہار کا نظروں میں کیف ہے
ہے لب پہ ہر گھڑی مے و میخانہ ان دنوں
بس اک یہی امید تھی رضوی متاعِ زیست
شاید کہ ہونگا دہ کریمانہ ان دنوں"

وہ مسلسل قہقہوں کے درمیان مجھ سے مخاطب ہوا . . . . . ستائیس اٹھائیس سال کی عمر، میلے کچیلے کپڑے، نم آلود ویران آنکھیں، بڑھے ہوئے بال اور نحیف و نزار جسم۔ اسکے قہقہے عجب وحشت آمیز گونج پیدا کر رہے تھے۔ میں نے اسے دیکھا اور اس نے مجھے . . . . . . اور ہم دونوں ایکدوسرے کو . . . . دیکھنے . . . میں . . . . .

کاکریا تالاب ایک مردہ بے حس لاش کی طرح میرے قدموں پر پڑا تھا۔ پانی کی سطح پر ایک بھیانک اداسی چھائی ہوئی تھی . . . . اور دور چٹیل پہاڑوں کے سلسلے اس خاموش و بے کیف منظر میں سر اٹھائے نیچے میدانوں کو گھور رہے تھے

شہر کو میں دور چھوڑ آیا تھا۔ اتنی بے ہنگامہ اور اداس شام میں کون آخر اپنے دل و دماغ پر قابو رکھ سکتا ہے؟ مجھ پر ایک عجب قسم کی مضطربانہ کیفیت طاری تھی ابھی مجھ کو بیٹھے ہوئے چند منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ یکایک پشت کی جانب سے ایک خوفناک مگر مدہم اور ہوا میں لرزتے ہوئے قہقہہ کی آواز آئی، میں چونک پڑا، مڑ کر دیکھا کوئی بھی نہ تھا میں سوچنے لگا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمسخر اور قہقہوں میں زندگی گذار دیتے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ زندگی کو اس قدر سنگین اور گراں پاتا ہوں کہ ہنسکر بھی ٹال نہیں سکتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک دوسری بار قہقہہ بلند ہوا اب کی بار آواز بالکل میرے قریب ہی سے آئی تھی، میں نے سر گھما کر دیکھا، ایک شخص . . . . انسان . . . ہاں ہم ہی آپ جیسا انسان بالکل میرے قریب کھڑا تھا کوئی چھبیس ستائیس سال کی عمر، چہرے سے وحشت برس رہی تھی، اس کی حرکات سے معلوم ہو رہا تھا۔ اس دنیائے رنگ و بو سے قطعی نفرت رکھتا ہے، ننگے پیر، بوسیدہ پاجامہ پھٹی ہوئی قمیص، گویا دنیا والوں کی نگاہ میں وہ انسانیت سے ہی خارج تھا۔ اس کی اس ظاہری حالت کا معائنہ میں نے نہایت سرعت کے ساتھ کر لیا۔ اس کو خواہ آپ کچھ ہی کہیں میں ہر چیز کو نہایت عمیق نگاہوں سے دیکھنے کا عادی ہوں یہ اس کی ظاہری حالت اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ ایک مافوق الفطرت انسان ہے، خدا معلوم میری روح کیوں اس میں سمائی جا رہی تھی . شاید وہ میری ہونے والی زندگی کا نمونہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں اپنی قوت ارادی سے اس کے دل کی گہرائیوں میں پہونچ کر اس کی نفسیات کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس نے پھر ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اس بار اس کا قہقہہ بالکل ایسا تھا جیسے کسی نیم پژمردہ بند گلاب کے پھول کو زبردستی انگلیوں سے کھول کر دیکھا جائے۔ اس نے میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا تم کیوں نہیں ہنستے

میں اس عجیب وغریب استفسار سے گھبرا گیا لیکن اب مجھ
کو کامیابی کی جھلک دکھائی دیتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے
فوراً خیال کیا۔ میری جانب اس کے خیالات کا مرکوز ہونا
اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مجھ سے دلچسپی لے رہا ہے۔
میں اس کو بظاہر دیوانہ ہی سمجھ رہا تھا اور ایک دیوانے
کا کسی ہوشمند انسان سے دلچسپی کا اظہار کرنا اس بات کا
یقین دلاتا ہے کہ اس پر صرف دیوانگی کا پردہ پڑا ہے اور
اگر کسی خاص موضوع سے اس پر سے یہ پردہ ہٹا دیا جائے
تو کیا عجب کسی راز سربستہ کا اظہار ہو جائے۔ جس نے اس
کو اس حالت پر پہونچا دیا۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ
کوئی دیوانہ عاشق ہے میں نے اس کی نفسیات کا مطالعہ
اچھی طرح کرتے ہوئے کہا " میری زندگی میں ایک لمحہ بھی
ایسا نہیں ہے کہ جس کو میں ہنس کر ضائع کردوں۔ میں
تو رو رو کر زندگی گذار رہا ہوں "

رو رو کر ۔۔۔ ہہ ۔۔۔ ہہ ۔۔۔۔ میں کسی کو روتا
ہوا نہیں دیکھ سکتا، میں سننا بھی نہیں چاہتا کوئی روتا
ہے۔ یہ دنیا اسی قابل ہے کہ قہقہہ لگا کر اڑا دی جائے۔
اس نے ایک بار پھر ایک غیر فطری قہقہہ لگایا ۔۔۔۔ اُف
کتنی وحشت ناک تھی اس کی ہنسی

میں نے محسوس کیا کہ دیوانہ کچھ کچھ ہوش میں
آرہا ہے میں نے اس کی ۔ اس کی تبدیلی سے فائدہ
اٹھاتے ہوئے کہا، چلو میرے ساتھ گھر چلو، تم مجھے اپنی
داستان سنانا۔ اور میں تمام رات سنتا رہوں گا مجھے
یقین ہے تمہاری زندگی میں کوئی اندوہناک حقیقت پوشیدہ
ہے۔

اس کی آنکھیں زمین میں ایک خاص نقطے پر گڑی
جا سی تھیں گویا وہ کوئی بھولی ہوئی بات یاد کر رہا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کی دیوانگی کے اثرات دور ہونے لگے ۔۔۔
۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔ اب رو رہا تھا ۔۔۔۔ اب وہ اپنی
اصلی حالت پر تھا۔ سچ ہے زندگی نام ہے رو رو کر عمر گذارنے کا

وہ آخر ایک بے تکلفانہ ادا سے میرے برابر بیٹھ گیا اور
جس طرح نشتر کی ذرا سی جنبش سے پکا ہوا زخم پھوٹ جاتا ہے
میرے ذرا سے برتاؤ سے اس کے تمام جذبات ابھر آئے اور
اس نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔ آہ اس کے الفاظ
میں کتنا درد اور کتنا سوز تھا وہ بے تکان بول رہا تھا کہ

" ہاں تو اب سے آٹھ سال قبل جب میری عمر انیس ۱۹
سال کی تھی، میں ایک آسودہ حال گھرانے کا فرد تھا اور ایک
حد تک اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا کیونکہ میں کسی کی ضرورت
ہی نہ رکھتا تھا۔ اسی سال میں تعلیم سے بھی فارغ ہو گیا تھا مگر
تم جانتے ہو کہ آج کل تعلیم حاصل کر لینے کے بعد یہ امید
رکھنا کہ ملازمت مل جائے کتنا مضحکہ خیز اور مہمل خیال ہے
مجھ کو رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا میری زندگی میں ایک خلش
پیدا ہو گئی ہے اور یہ تھی فکر معاش۔ آپ جانتے ہیں مصیبت
جب آتی ہے تو ہر چہار طرف سے آگھیرتی ہے۔ چند یوم کو
میرے مکان کے دوسرے حصے میں کچھ لوگ بلند شہر سے
آکر مقیم تھے لازمی طور پر چند دنوں میں میرا ان سے تعارف
ہو گیا۔ یہ بزرگ قریب پینتالیس سال کے ایک باوضع
اور شریف آدمی تھے۔ ہماری ملاقات تو علیک سلیک
تک محدود تھی، مگر میرے گھر والوں اور ان کے گھر والوں
میں کافی ربط وضبط پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ تعلقات
اس قدر مستحکم ہوگئے کہ ہم لوگ گویا ایک ہی خاندان کے
رکن معلوم ہونے لگے۔

اختر جہاں ان بزرگ کی اکلوتی لڑکی تھی، میں نے اسکو
"اپنے یہاں ایک خاص تقریب کے موقع پر دیکھا کوئی

چودہ سال کی ایک حسین دوشیزہ گویا بہار کا پہلا پھول کنول کی نودمیدہ کلی، کاش میں اس کے حسن کو الفاظ کی قید میں تمہارے سامنے پیش کرسکتا۔ کہیں چاند کی ٹھنڈی اور نظر نواز چاندنی کو باکمال سے باکمال مصور کی رنگ آمیزی اور چابک دستی بھی صفحہ تصویر پر دل آویزی کے ساتھ منقوش نہیں کرسکتی ہے آخرکار عشق نے زندگی کا رباب اٹھایا اور اس کے تمام تاروں پر زور سے مضراب لگائی۔ یہ تھی ہماری پہلی نظر۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ جذبۂ پسندیدگی نے انسیت، محبت اور آخرکار عشق کی صورت اختیار کرلی۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی شباب کی پرجوش امنگوں کے ساتھ میں نے بھی عمر میں پہلی بار محبت کی تھی۔ اور محال تھا کہ کوئی رکاوٹ اس محبت میں رخنہ پیدا کرسکتی۔

جب دو ہستیاں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتی ہیں تو ان میں احساس رسوائی تک باقی نہیں رہتا... جب ہماری رومانی مگر پاک خط و کتابت کے خلاف کچھ قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں تو ہم کسی قدر محتاط ہوگئے مجھ میں ایک نامعلوم خلش روز بروز بڑھتی جارہی تھی اور وہ تھی اختر جہاں کو اپنے سے اس قدر قریب کرلینے کی آرزو کہ اس سے زائد قریب ہونا ہی ممکن نہ ہو۔ لیکن جب مجھ کو اپنی بیکاری کا احساس ہوتا تو میں بالکل خاموش ہوجاتا۔ آخرکار ایک روز باوجود انتہائی ضبط کے میں نے اپنا مدعائے دل اختر جہاں سے کہہ ہی دیا۔ کہ ہم آخر اس طرح کب تک اپنی محبت دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھیں گے۔ ہم نے کوئی عیب نہیں کیا صرف محبت کی ہے ہمیں ایک دوسرے سے اس قدر محبت ہے کہ دنیا میں کسی کو بھی اتنی محبت کسی سے نہ ہوگی لیکن تم جانتی ہو ہماری

اس پوشیدہ اور پاک محبت کا حال دنیا والوں کو معلوم ہوگیا تو ان کو ہم سے ضد پیدا ہوجائے گی۔ اور اس وقت میرے لئے بہت مشکل ہوجائیگا کہ تمہیں جائز طور پر حاصل کرسکوں، میں ایک بیکار نوجوان ہوں۔ اگر تم اپنے ارادوں پر ثابت قدم رہو، اگر تمہیں یقین ہو کہ تمہاری محبت دائمی ثابت ہوگی، تمہارے ارادے اٹل ہوں گے، تم بوقت ضرورت سماج، سوسائٹی، والدین سب سے بغاوت کرسکوگی تو میں تم سے رخصت ہوکر کہیں پردیس چلا جاؤں اور جب دنیا والوں کی نظروں میں اس قابل بنجاؤنگا کہ تم کو حاصل کرسکوں تب واپس آؤنگا۔ ورنہ باقی تمام عمر تمہاری یاد میں گذار دوں گا۔ میں نے اس خط میں اس سے ملنے کی بھی خواہش ظاہر کردی تھی، اس کا جواب دوسرے روز ملا۔ اس نے لکھا تھا

"میری محبت نقش برآب نہیں، دائمی ثابت ہوگی میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہوگی کہ تم دنیا کی نظروں میں ایک لائق ہستی بن کر واپس آؤ کیونکہ تم جانتے ہو میرے والدین محض ذاتی قابلیت یا خاندانی وجاہت پر مجھ کو تمہارے سپرد کرنا بھی گوارا نہ کریں گے۔ میں تمہاری ہوں اور صرف تمہاری رہونگی"۔

اصغر دیوانہ اب پھر خاموش ہوگیا۔ میرے منہ سے بھی ایک ہلکی سی آہ نکل گئی۔ آہ دیوانہ دوست ایک صاف شفاف آئینہ تھا جس میں میں اپنا ہی عکس دیکھ رہا تھا۔ ...... میں نے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "ہاں تو پھر کیا ہوا تم اپنا بیان جاری رکھو بڑی دل دوز داستان ہے اس نے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے کہا... پھر کیا ہوا...... پھر دوسرے روز میں گھر والوں سے رخصت ہوکر کسی ٹھوس اور تعمیری کام کے لئے کلکتہ روانہ ہوگیا۔ میں

کلکتہ میں چار سال تک رہا۔ تین سال تک اختر جہاں کے خطوط برابر آتے رہے اور وہ ہمیشہ مجھے یقین دلاتی رہی کہ میں تم کو بھولی نہیں۔ تین سال کے بعد اس کے خطوط کا یک آنے بند ہو گئے۔ لیکن میں تو اس کے وعدے پر جی رہا تھا۔ مجھے اس کے وعدے پر اعتماد تھا۔ مجھے یقین تھا جو عورت کسی مرد کے لئے آنسو بہا سکتی ہے وہ وقت ضرورت خون بہانے پر بھی تیار ہو سکتی ہے۔ تمام دن کی جانفشانی اور محنت کے بعد جب میں واپس آیا تو مکان میں قدم رکھتے ہی اختر کا خیال مجھ سے گلے ملتا اور میں سوچنے لگتا کبھی اختر اسی طرح دروازے پر میرا استقبال کرے گی۔ تنہائی میں بیٹھ کر میں اس کے خطوط کا مطالعہ سا کیا کرتا حتیٰ کہ اسکا ہر خط مجھ کو حفظ ہو گیا۔ گھر آ کر سب سے پہلے یہ دل خراش دردناک خبر مجھے معلوم ہوئی کہ اختر جہاں کی شادی کو آٹھ ماہ ہو گئے ہیں اور اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ سکون و طمانیت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ آہ میرے دوست مت پوچھو میرا کیا حال ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کسی بے گناہ کو سزائے موت کا حکم دیدیا گیا ہے۔ میری نظروں میں مگر مکان سب گھومتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک رند مینوش سے بادۂ سرجوش چھین لیا گیا ہو جبکہ جام اس کے لبوں تک پہنچ جائے۔ ایک زاہد مرتاض کی ریاضت کو اس وقت اکارت کر دیا جائے جب اس میں اور خلد بریں میں ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا ہو، مگر میں نے . . . . بمشکل اپنے جذبات پر صبر کیا، اپنی زندگی کا آخری فیصلہ کرنے سے قبل ایک بار اس بیوفا سے ملنا ضرور تھا۔

جب میں اپنی ٹوٹی ہوئی اور کچلی ہوئی امیدوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے اختر جہاں کے شاندار بنگلے پر پہونچا تو مجھے اندر سے لطیف و نرم قہقہوں کی آواز آئی۔ اختر جہاں شاید اپنے حسن و شباب کے خریدار سے اپنے حسن و شباب کی داد وصول کر رہی تھی۔ میں زخمی صید کی طرح تڑپ کر اندر گھس گیا۔ مخملی غالیچہ صوفوں پر ناز و رعنائی کا وہ مجسمہ سیاہ زلفوں کو بکھرائے کمرہ کی جاپانی فضا میں یونانی شاعروں کی لطافت خیال و تغیر کا ایک نازنین شاہکار معلوم ہو رہا تھا۔ اور اس کے قریب ہی ایک خوشرو نوجوان، حریص شکاری، جسکی آنکھوں میں گناہ کے لال لال ڈورے رنگین طبیعت کی سرمستیوں کا پتہ دے رہے تھے۔ یہ اختر کا رفیق زندگی تھا . . . . . زندگی کا رفیق۔

وہ مجھے دیکھ کر سکتے میں رہ گئی، جیسے کوئی اپنے ناخوشگوار ماضی کو کہیں مجسم دیکھ رہا ہو۔ خدا جانے اس وقت میری زبان میں کہاں کی قوت آ گئی تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے میری تمام روح سمٹ کر میرے لفظوں میں جمع ہو گئی ہے۔ آتشناک لفظ طنز پر جیسے میں نے سب کچھ کہا۔ جو کچھ میں کہہ سکتا تھا میں کہتا رہا اور وہ سنتے رہے۔ وہ دونوں میاں بیوی۔ اختر کا نازک جسم ایک لچکیلی شاخ کی طرح۔ میرے لفظوں کی آندھیوں اور طنز کی بارش میں کانپ رہا تھا، وہ رونے لگی، سچ مچ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ آہ اختر کے آنسوؤں نے میرے غصے کی تمام آگ کو سرد کر دیا۔ آخر اسے روتے ہوئے دیکھ بھی کون سکتا تھا۔ اب اس کے رونے کی باری تھی۔ مگر میں ہنس رہا تھا۔ میری پوری زندگی ایک قہقہہ بنکر فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ آہ . . . اور . . . . (وہ کچھ خاموش سا ہونے لگا میں نے ہمت کر کے پوچھا،

پھر . . . پھر کیا ہوا میرے دوست!

وحشیانہ قہقہوں کے ساتھ پھر اس نے بولنا شروع کیا اسے روتا دیکھکر مجھے رحم آیا اور میں نے معاف کر دیا۔ اختر کو میں نے ان تمام باتوں کے باوجود معاف کر دیا۔ . . مگر اسکا

چاہنے والا شوہر اسے معاف نہ کرسکا۔ یہ معلوم کرکے کہ وہ شادی سے قبل کسی اجنبی سے پیمانِ محبت باندھ چکی ہے اس کی رگ رگ میں رقابت حسد اور بدگمانی کی چنگاریاں سلگنے لگیں اور اس نے ۔ ۔ ۔ ۔ اختر کو طلاق دیدی

طلاق دیدی ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ میں نے تعجب سے چلاکر پوچھا

جی ہاں طلاق ۔ ۔ ۔ ۔ قدرت نے اسے بیوفائی کی یہ عبرتناک سزا دی تھی ۔

تو پھر کیا تم اپنی محبوبہ سے نہ مل سکے ۔ میرا سوال تھا دیوانے (دیوانے کا مجھ سے خطاب تھا) ملتا کہاں سے ؟ اختر نے تو خودکشی کرلی ۔ اب اس کی روح ۔ سسکیاں بھرتی ہوئی ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے مگر میں ہنستا رہتا ہوں

اب میرا اجنبی پاگل جوش میں بھر کر کھڑا ہوگیا ۔ وہ پوری طاقت سے ہنس رہا تھا ۔ گویا وہ دنیا بھر کا مذاق اڑا رہا ہے خود قدرت سے گستاخانہ مذاق کررہا ہے اور قبل اس کے کہ میں حادثہ کی نوعیت پر غور کروں ، اس نے ایک چھلانگ ماری ۔ ۔ ۔ ۔ خودکشانہ چھلانگ

کا گریا تالاب کا سکون ختم ہوچکا تھا ۔ اب اس کی لہروں پر ایک بدنصیب نوجوان کی نعش تیر رہی تھی ۔ اور اس کے وحشیانہ قہقہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں وہ اب تک لہروں کی مدھم شور میں ۔ ۔ ۔ گونج رہے تھے ۔ ۔ ۔ وحشیانہ قہقہہ

سید انتظام الدین صاحب جمالی علیگ

بلا سے حسن کو تو محوِ ناز رہنے دے
مری نظر کو بھی وقفِ نیاز رہنے دے

نگاہِ ناز ذرا نیمباز رہنے دے
شرابِ عشق میں کیفِ نیاز رہنے دے

وہ میری بات کبھی مان لیں معاذاللہ
وہ رازدار نہیں ہیں جو راز رہنے دے

مجاز اور حقیقت یہ ایک دھوکہ ہے
حقیقتوں کو رہینِ مجاز رہنے دے

نظر ملا کے چرانا یہ کس سے سیکھا ہے
بلا رہا ہے تو پھر احتراز رہنے دے

زباں سے دعوئے تقویٰ تو لاکھ بار کرے
اگر وہ مستِ نظر پاکباز رہنے دے

تجلیات میں ہے حلقۂ نظر محدود
حقیقتوں کو جمالی مجاز رہنے دے

ہنسی کی مدھر تانوں سے فضا گونج اٹھی، گیت کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ دل دھڑکنے لگا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے نوجوان لڑکے بالے جوگن کے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ گیت میں رس تھا جوگن کی آنکھوں میں آنسو، برگد کی گھنی چھاؤں، پدما کا کنارا، لہروں کے میٹھے گیت کے ساتھ ٹکرا گئی زیادہ دلکش ہوگئی تھی ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں نے نیلے آسمان کے کنارے سنہری جھالر لگا دی، گیت کی آواز مدہم پڑ گئی۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دکھیا سسکیاں لے رہا ہے اور پھر . . . .

چاروں طرف سناٹا چھا گیا

ستیش صرف گوالا ہی نہیں تھا، شاعر بھی تھا۔ دوپہر کے سناٹے، چاند کی اجلی روشنی، صبح کے دھندلکے، شام کی تاریکیوں میں پدما کی وادی اس گیت سے گونج اٹھی۔

وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا اسے شعر کہنا کسی نے نہیں سکھایا تھا۔ لیکن جب اس کے دل میں جذبات اٹھنے لگتے تو وہی گیت کا روپ اختیار کر لیتے۔ آج جوگن کا گیت سن کر اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چیز اس کے دل میں اترتی چلی جا رہی ہے۔

گانا ختم ہوگیا طلسم ٹوٹ گیا، لوگ جانے لگے ستیش نے جوگن کی طرف دیکھا۔ اٹھتی جوانی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں شانوں پہ بکھرے ہوئے بال گیروا ساڑی جوگن اندر کے سورگ کی اپسرا معلوم ہوتی تھی

میرے من کے مندر میں بسنے والی دیوی . . . . . .

اُدھر جوگن! ستیش کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز نے فضا میں ایک تھرتھراہٹ، ایک کپکپی پیدا کر دی۔

پدما کی دھار نے سر اٹھایا اور اس کے قدموں کے پاس آ کر گنگنانے لگی برگد کے درخت کے نیچے جوگن کی ہنسی سے گیت تڑپ تڑپ کر نکل رہے تھے۔ ستیش کو معلوم ہوتا تھا کہ ساری کائنات مسکرا مسکرا کر کہہ رہی ہے . . . . . اُدھر جوگن ستیش رہ نہ سکا۔ دبے پاؤں اس کے پاس پہونچا اور آہستہ آہستہ بولا۔

"سندری!"

"جوگن نے سر اٹھا کر پوچھا تم کون؟"

"ایک دکھیا بپتا کا مارا"

"دنیا میں دکھ اور سکھ کسی چیز کا نام نہیں بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارے راگ کی رسیلی تانیں مجھے کھینچ لائی ہیں میں، کچھ نہیں چاہتا۔"

"جوگن نے اس کی جانب غور سے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔"

"ستیش کے منہ سے آہ نکل گئی اور وہ بول اٹھا . . .

.....او جوگن!

اور جوگن نے ایک لمحہ میں وہ سب کچھ... جان لیا جسے انسانی زبان بیان نہیں کر سکتی۔

ستیش بابو مکند پور کے زمیندار تھے۔ گاؤں کے لوگ ان کی بیحد عزت کرتے تھے۔ انھیں اپنی بیوی سوشیلا سے بیحد محبت تھی۔ ایک دن پوسٹ مین نے ایک تار لاکر دیا۔ تار کلکتہ سے آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ نرلش ان کا اکلوتا بیٹا کالج اسکوئر کے تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ ستیش بابو کی کمر ٹوٹ گئی نرلش کی موت پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ رام بھرو سے چوکیدار کو کہیں سے کچھ اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے رائی کا پربت بنا لیا۔ اور دوسرے دن گاؤں بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ نرلش نے خودکشی کر لی

اس واقعہ سے ایک مہینے بعد ستیش بابو بیمار پڑے اور ایسے بیمار پڑے کہ مر کر ہی اُٹھے۔

مکند پور میں جوگن آئی، برگد کے نیچے لوگوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ سوشیلا نے بھی سن لیا، بلا بھیجا۔ جوگن کسی کے یہاں نہیں جاتی تھی پہلے تو جی میں آیا کہ کہلا بھیجے کہ ہم سادھو سنت کسی کے دروازے پر نہیں جاتے لیکن خدا جانے کہ پھر کیا سوچ کر دربان کے ساتھ ہو لی۔ معلوم نہیں جوگن کو کیا چیز نرلش بابو کے گھر کی طرف کھینچے لئے جاتی تھی۔

سوشیلا نے بڑی آؤ بھگت کی، پاؤں چھوئے اور ایک سجے سجائے کمرے میں لا بٹھایا۔ باہر ہوا سسکیاں لے رہی تھی۔ اندر جوگن کی مُنی سے دل سوز آہیں نکل رہی تھیں۔ مکان کی دیواروں سے گیت سرگرما رہے تھے۔ پھر صدا مدھم پڑ گئی اور نہایت میٹھے سروں کے گیت کی آواز سنائی دینے لگی

"بشنو جوکھن ندامو گن گو گن ھندکار"

"کیبدے امار بنیاد سوئے امو نو جھنکار"

سوشیلا چونک پڑی، اس گیت سے بھولے بسرے دن یاد آگئے اس نے پوچھا:۔

"آپ نے یہ گیت کہاں سیکھا؟"

"کلکتہ میں یہ تو عام گیت ہے"

"لیکن آپ اسی طرح بجاتی ہیں بالکل اسی طرح"

"کس طرح؟"

"میرے بیٹے کی طرح"

"آپ کا کوئی بیٹا بھی ہے؟"

"تھا، وہ ہے اس کی تصویر سامنے دیوار پر"

دیوار پر ایک نوجوان کی تصویر لٹک رہی تھی۔ بھولا بھالا چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ جوگن کو ایسا معلوم ہوا کہ تصویر میں جان پڑ گئی۔ نوجوان کی بھنویں تن گئیں۔ ہونٹ ہلے اور یہ آواز سنائی دی۔ یہ ہی ہے وہ........"

اور پھر کمرے کی تمام چیزیں ناچ ناچ کر اس کا منہ چڑانے لگیں، کہنے لگیں یہی ہے وہ........"

جوگن کا سر جھک گیا وہ بولی

سوامی معاف کر دو۔

اس کے گالوں پر آنسوؤں کے دو قطرے، دو انمول موتی ڈھلک رہے تھے۔ سوشیلا کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا بڑھتا بڑھتا یقین کی حد تک جا پہونچا۔

اس نے کہا پاپن تو "کیا تو ہی ہے وہ۔ تو نے میرے گھر میں قدم رکھنے کی جرأت کیوں کی؟

"ماتا مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ان کا گھر ہے۔ ہاں میں ہی ہوں۔ وہ پاپن جس نے تمہارے لال کی جان لی۔ وہ کلکتہ کے کسی کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک دن میرے اں اپنے کسی دوست کے ساتھ گانا سننے چلے آئے۔ پھر ایشور جانے کہ انھیں مجھ بدبخت کی کونسی بات پسند آگئی، کونسی ادا بھاگئی،

ـدذ آنے لگے۔ پریت کی پینگ بڑھنے لگی۔ یہ گیت انھیں بہت
رانھا۔ خود گاتے، مجھ سے سنتے لیکن پھر بھی جی نہ بھرتا۔
ہی دنوں کلکتہ کے ایک مارواڑی سیٹھ نے مجھے نوکر رکھ لیا
، کا آنا جانا بند ہوا۔ میں راجی جا رہی تھی۔ انھوں نے ملنے
کوشش کی۔ لیکن ادہر دولت تھی، اُدہر پریم۔ میں نے
م کو ٹھکرا دیا۔ اور ملنے سے انکار کر دیا۔ جب راجی سے
، لوٹا . . . . . کلیجہ پر گھونسا لگا . . . . کم بخت یہ کب
ا . . . . ؟"

اونچے محل اور نرم بستر چھوڑ تن پر بھبھوت رمائی۔ اب
دن، گاؤں بنسی بجاتی ہوں اور اسی طرح اپنے باپ کا پرائشچت
لی ہوں

جوگن نے بنسی اٹھائی، تصویر کی جانب دیکھا، اُب
، آنکھوں میں رحم و کرم کی ندیاں موجیں مار رہی تھیں۔ چہرے
ذ اسی چھا رہی تھی۔ جوگن نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور اس
، پہلے کہ سوشیلا سنبھلے دروازے کے باہر چلی گئی۔

سوشیلا نے جی میں کہا، اس بیچاری کا کیا قصور!
، دروازے کی طرف جھپٹی، باہر تاریکی تھی۔ وہ پکاری جوگن
گن! لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر دیکھا کہ درخت کے نیچے
ل اڑ رہی تھی۔ جوگن وہاں بھی نہ تھی۔

ستیش پدما کے کنارے کھڑا تھا، جوگن بادلوں کے
ڑ پر سوار بنسی بجا رہی تھی۔ جوگن مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ
شنی کی کرن بن گئی۔ بادل جگمگا اُٹھے۔ اب ستیش نے غور سے
یکھا تو جوگن کہیں نہیں تھی۔ فقط چاند ایک گوشے سے سر
ے نور برسا رہا تھا۔ اور پھر ایک دردناک صدا سے رات
، خاموشی کانپ اٹھی . . . . . . اور جوگن . . . .
ی کو معلوم نہیں کہ جوگن کہاں گئی؟ سوشیلا ستیش کو اپنے
اں سے آئی اور اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتی ہے۔ ستیش نے

یہ درد یوں ہی رہے گا مجھے اعتبار نہیں
مجھے حضور کی نظروں پہ اختیار نہیں
یہ ہی نہیں کہ گلستاں پہ اختیار نہیں،
مجھے قفس کی بھی دنیا کا اعتبار نہیں
غمِ بہار میں کچھ حاصلِ بہار نہیں
نگاہِ شوق رہینِ مآلِ کار نہیں،
جب اپنے دل پہ ہی خود مجھ کو اختیار نہیں
خطا معاف کسی کا بھی اعتبار نہیں
اب اس جہان میں لے چل نگاہِ شوق مجھے
کہ جس جہاں میں کوئی چیز مستعار نہیں
تری نگاہ کے صدقے ادہر بھی ایک نظر
میں کہہ رہا ہوں مجھے دل پہ اختیار نہیں
ہزار کروٹیں لیں حسن نے زمانے میں
جہانِ عشق میں لیکن کچھ انتشار نہیں
ابھی سے بھر گیا دامن قفس کا پھولوں سے
ابھی نگاہ میں ہنگامۂ بہار نہیں،
اُسی نگاہ سے اک تیر اور اے کافر!
ابھی تو درد کی دنیا کا اعتبار نہیں،
تصورات کی آئینہ بندیوں کے نثار
نگاہِ شوق رہینِ حجابِ یار نہیں،
اثرؔ نگاہ میں ہے حاصلِ جنونِ وفا
اور اس کے بعد بھی فکرِ مآلِ کار نہیں،

ی خریدی ہے۔ وہ پھر اسی برگد کے نیچے بنسی بجاتا رہتا ہے۔ گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ وہ پاگل ہے

سورج ہمیشہ اسی یکسانیت سے چمکتا ہے۔ ستارے نیلے آسمان سے اسی طرح جھانکتے رہتے ہیں۔ ہلالِ نو شفق کی روشنی میں تیرتا رہتا ہے۔ گنجان جھاڑیوں کی چوٹیوں پر گرم راتوں کا ماہتاب برہنہ ہو کر رقص کرتا ہے۔ محبت کرنے والی روحیں اس وقت ایک نئے ولولے اور ایک نئے جوش کے ساتھ بیدار ہوتی ہیں۔ تہذیب ڈوبتی ہے اور ڈوب ڈوب کر ابھرتی ہے، انقلاب ہوتے ہیں اور دنیا کروٹ لیتی ہے کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ لیکن یہ ستارے، یہ چاند اور یہ آسمان، سب اپنی اپنی جگہ قائم ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی آفتاب ہمیشہ مسکراتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ . . . کیوں ؟ اس لئے کہ وہ اپنی عظمت سے واقف ہے۔ حنا کی شاخوں میں ستارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وسیع میدانوں میں جنگلی مرغ قلابازیاں کھاتا ہے۔ اور زور سے چلاتا ہے۔ سپاہی کا قدم پہلی بار وہاں پہونچتا ہے اور زمین کے سینے سے آہ نکلتی ہے، دردناک و دل خراش بہار کے بعد خزاں آتی ہے دن کے بعد رات ہوتی ہے، اسی طرح ہر چیز گذر جاتی ہے . . . . . میں شبنم آلودہ رات کی خاموش خلوت سے باہر آتا ہوں اور اپنے شکستہ پر پھڑپھڑاتا ہوں . . . . !

آنسو اب کہاں، حزن و ملال جا چکا۔ زندگی اور موت میرے قدموں کے نیچے ہے۔ میں آزادانہ فضا میں سانس لیتا ہوں، کائنات کا ذرہ ذرہ کیفیت سے مخمور نظر آتا ہے۔ میری زندگی عمیق ہے، کون و مکان کی طرح عمیق و پُر اسرار اور میں اس کی گہرائی سے واقف ہوں کوئی شئے اس علم و شعور کو مٹا نہیں سکتی۔ کوئی چیز مجھے برباد نہیں کر سکتی مجھے گزند نہیں پہونچا سکتی . . . . . . مسرت کی سنہری دیوی باہر آتی ہے، میں اُٹھتا ہوں، میرا سینہ آزادی کے سورج کی تیز اور منور شعاعوں سے معمور ہو جاتا ہے اور ان کی تجلی رات کی تاریکیوں کو روشن بنا دیتی ہے . . . . . میں پرواز کرتا ہوں اپنی روشنیوں کو لئے ہوئے مہیب و نازک تاریکی میں، دنیا کے تمام ویرانوں میں . . . . . سیاہیاں اور تاریکیاں آنسو بہانا چھوڑ دیتی ہیں۔ فضا قہقہوں سے گونج اُٹھتی ہے۔ اور یہ نور تجلی کی وسعتوں میں آزادی کا دیوتا اور "مسرت" ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہیں۔ ہمیشہ مسرور و مطمئن . . . . . مسکراتے ہوئے چہرے . . . . . !
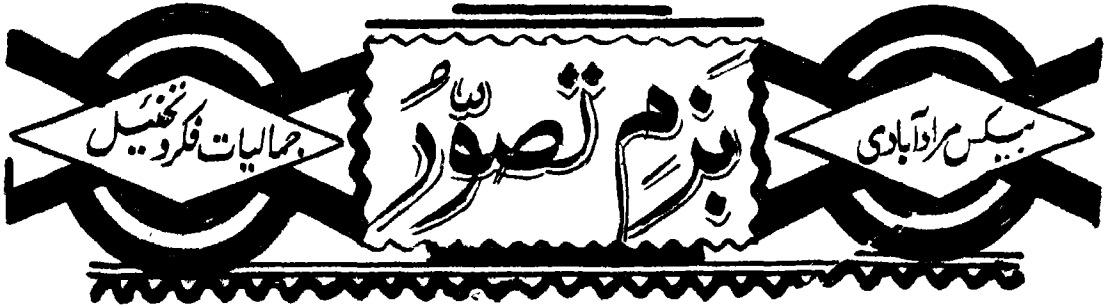
پھر آج دلِ بیتاب کو میں سرشارِ مسرت پاتا ہوں
اِس صبر و سکوں کی وادی میں آثارِ قیامت پاتا ہوں،
دنیا کی فضائے غمگیں میں اک کیف و لطافت پاتا ہوں،
پھر آج کسی مغرور کو میں مائل بہ عنایت پاتا ہوں

ظلمتکدۂ دل آج مرا اس طرح درخشاں ہوتا ہے
جس طرح کہ ماہِ جلوہ فگن راتوں کو نمایاں ہوتا ہے

پھر بزمِ تصور میں کوئی اے کیف تماشا آتا ہے
پھر ذوقِ نظر کی مستی سے خود ذوقِ نظر شرماتا ہے
پھر بادِ سحر کا ہر جھونکا پیغامِ مسرت لاتا ہے
پھر بربطِ غم پر مطربِ دلِ احساس کے نغمے گاتا ہے

وہ آج جھلک دکھلاتی ہیں جلووں کے حسیں مہتابوں میں
جو آتے ہوئے شرماتے تھے فرقت کے فسردہ خوابوں میں،

یہ تاروں بھری رنگین فضا یہ پھیلا پھیلا یہ مست سماں
یہ موسمِ گل یہ ارض و سما یہ ماہِ دو ہفتہ جلوہ فشاں،
یہ گوہرِ شبنم کی ریزش یہ صحنِ چمن یہ عہدِ جواں،
پھولوں کے درخشاں سایوں میں یہ ملکۂ شب ہنگامہ کناں

——— فطرت کا جمالِ بے پردہ، خاموش و حسیں نظارہ نہیں
——— جس طرح کوئی سورج کی کرن ہو جلوہ فگن کہسار نہیں

آغوش تمنا میں کوئی شرمائے ہوئے خاموشی سے ———
دل بیخود جامِ کیفِ وفا اخلاص کی ہم آغوشی سے ———
رگ رگ میں رواں اک موجِ طرب ہنگامۂ راحت کوشی سے ———
جیسے کہ کوئی رند میکش بیخود ہو کہیں مے نوشی سے ———

——— سرمست جوانی کا ساغر چھلکا ہوا نازک ہاتھوں میں
——— اور شہد و شکر کی شیرینی الفت کی وہ میٹھی باتوں میں

وہ آہ جمالِ ماہ و قمر بہکے ہوئے کافر نظارے ———
وہ حسن و لطافت کے جلوے فطرت کے وہ نازک شہ پارے ———
بکھرے ہوئے دامن میں غنچے، نکھرے ہوئے گردوں پر تارے ———
پر ڈال کے شاخوں میں پنہاں خاموشی سے طائر بیچارے ———

——— سوئی ہوئی دنیا میں گویا، بیدار تھا جادو فطرت کا،
——— پیغام مسرت دیتا تھا ہر نغمہ ربابِ قدرت کا،

بیکس وہ شبِ عشرت آئیں، ہے ذوقِ نظر کو یاد ابتک ———
وہ مست و گل افشاں نظارے دل میں ہیں مرے آباد ابتک ———
دنیا میں مری خاکستر دل ہے چاروں طرف برباد ابتک ———
یعنی کہ محبت کی ہستی، ہر بند سے ہے آزاد ابتک ———

——— مانا کہ جفائے گردوں سے وہ عہد تمنا بھول گئے
——— لیکن یہ بتا دے کاش کوئی مجھ کو بھی یونہی کیا بھول گئے

آپ کو میرا وعدہ یاد ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں اس حیرت انگیز واقعہ کو ذرا تفصیل سے بتاؤنگا کہ کس طرح جوں ہی میں نے یہ ارادہ کیا کہ قدیم مصری شاہزادی کے مومی ہاتھ کو آتش دان میں رکھ کر جلا دوں، اچانک مجھے یہ محسوس ہوا کہ کوئی اجنبی ہستی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خیر تو سنئے وہ ایک سہانی رات تھی ایرش تہوار کی ایسی دل کش و پراسرار رات جس کے متعلق عقیدہ تھا کہ اس رات میں مرے ہوئے عزیزوں کی روحیں اپنے پسماندہ متعلقین سے ملنے کے لئے آتی ہیں۔ اندرونی جذبات کو ماتحت میں نے دروازے کو بند کرکے چٹخنی لگا دی۔ آتش دان کی آگ خوب روشن تھی اور کمرے میں برقی روشنی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ میرے ہاتھ میں قدیم مصری شاہزادی کا مصالحہ لگا ہوا ہاتھ تھا۔ اور دل میں شدت غم سے ہیجان برپا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میرا کوئی مدت کا وفادار دوست مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اک چھوٹی سی آبنوسی تپائی اٹھائی تاکہ اس پر اطمینان سے بیٹھکر اپنے اس ناخوشگوار فرض کا انجام دوں۔

تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرو۔ میری بیوی نے چلاکر کہا۔ ہم کو اس کے لئے کوئی دعا پڑھنی چاہئے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اسے آگ کے شعلوں کی سپرد کردیں۔ اس چھوٹے سے ہاتھ نے ایام زندگی میں اپنے خدا سے ضرور دعا مانگی ہوگی۔ اس لئے ہم کو بھی اس کیلئے ضرور دعا مانگنا چاہئے، اس کا خدا جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہمارا ہی خدا ہے اگرچہ نام مختلف ہے۔

میں نے کہا یہ ٹھیک ہے لیکن ہم اس کے لئے کون سی دعا پڑھ سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ؟

میری بیوی نے کہا" وہ بہت عجیب وغریب ہے اور دفعتہً مردہ انسانوں کی مصری کتاب کی ایک مصری نظم مجھ کو یاد آگئی، جس کو میری بیوی نے آہستگی مگر تاکید لفظی، کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

" تیرا گوشت پوست میں نے تجھ کو دیدیا ہے"۔
اے سب کو پیدا کرنے والے!
اے معبود اکبر!
تیری ہڈیاں میں نے تیرے سپرد کردی ہیں
تیرے اعضاء میں نے جمع کردئے ہیں۔
تو اب قاعدے میں ہے
کیا تو مالکِ لایزال کو دیکھتی ہے
اے پریشان روح!
تو اپنے راستے پر روانہ ہوجا
افق سے پار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

میری ہونٹوں دعا پڑھ کر خاموش ہو گئی ۔ میں نے آگ کو ایک طرف ہٹایا اور لرزتے ہوئے دل کے ساتھ وہ قدیم تاریخی ہاتھ آگ کے سپرد کر دیا ۔ اب میں واقعہ کے اس حیرت انگیز پہلو کی طرف آتا ہوں جو بہت ہی عجیب و غریب ہے ۔ اور ممکن ہے کہ اکثر لوگ اس کو یقین بھی نہ کریں ۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تحریر حرف بحرف درست صحیح اور مستند ، شہادتوں و اظہار حلفی سے ثابت کی گئی ہیں ۔

جس وقت ہاتھ آگ میں رکھا گیا اور اس میں سے سفید سفید شعلے تڑپ کر اوپر جانے لگے تو اس میں عجیب و غریب جیک اور پر اسرار مصالحوں کی خوشبو پیدا ہوئی جو کہ تمام کمرے کو مہکائے دیتی تھی ۔ ہم وہاں پر حیرانی میں بیٹھے رہے یہاں تک کہ خوشبو غائب ہو گئی اور اب صرف انگیٹھی میں نیم فسردہ کوئلے اور سفید خاکستر باقی رہ گئی ۔ کچھ دیر کے بعد ہم سونے کے ارادے سے باہر نکلے لیکن ابھی بمشکل پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا ہوگا کہ ایک واقعہ رونما ہوا ۔ حیرت انگیز واقعہ خوف و دہشت کی وجہ سے ہم وہیں پر ٹھہر کے کھڑے رہ گئے ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک خاموش گرم اور چاندنی رات تھی ۔ اس وقت ہوا قطعی بند تھی اور دروازہ بند ہونے کے باوجود ایک پر شور بگولہ دروازہ کھولنے کی زبردست جد و جہد کر رہا تھا ۔ ہماری خوف آمیز حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے کسی پر اسرار قوت کے ماتحت جھٹکے کے ساتھ دروازے کو کھلتے ہوئے دیکھا ۔ اچانک ہم نے خیال کیا کہ مسلح آئرش گارڈ ہم کو لوٹنے کے لئے آیا ہے اور سب سے پہلی چیز جو ہم دیکھتے وہ اُن کے خوفناک پستول ہوتے اسی عالم بیچارگی میں ہم نے دیکھا کہ دروازہ رفتہ رفتہ کھلتا جا رہا ہے ۔ اس نیم وا دروازے اور ہیبتناک خاموشی سے مجھے اس قدر خوف ہوا کہ خون میری رگوں میں منجمد ہو گیا

بہت دور دہلیز کے دروازے کے شیشوں پر ایک پھول نظر آ رہا تھا جس نے کہ رفتہ رفتہ گہری سبز پتیوں کی شکل اختیار کر لی ۔ ابھی کچھ اور ہونا بھی باقی تھا ۔ آہستہ آہستہ سبز پتیوں نے ایک دھندلی سی انسانی شکل تبدیل کر لی ۔ بے ساختہ میں نے سوچا کہ الٰہی کیا میری آنکھیں عہد ماقبل تاریخ کا کوئی معجزہ دیکھنا چاہتی ہیں ۔؟ ۔ رفتہ رفتہ یہ غیر معین مجسمہ خاموشی سے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا اب وہ بالکل ایک انسانی پیکر اختیار کر چکا تھا ۔ دفعتہً کمرے کی بے صدا تاریکی میں ایک حسین عورت بیش بہا شاہانہ عبا پہنے نظر آئی ۔ کتنی رعنا صورت کس قدر جمیل حلیہ وہ حیرت انگیز طور پر شاندار وجیہہ ، دلفریب حور جمال تھی ۔ شان و شوکت نسلی غرور اور بے عیب جلوہ آرائیاں اس کے چاندی جیسے شفاف جسم سے ظاہر ہو رہی تھیں ۔ میں اس کی فراخ آنکھوں کی تعریف بیان کرنے سے قاصر ہوں ۔ اس کی سیاہ چمکیلی آنکھوں سے محبت خود داری اور شاہانہ عظمت ٹپک رہی تھی خاموش اور باوقارانہ طریقے پر وہ کمرے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھی ۔ اس کے سر پر طلائی پتیوں کا ایک مرصع تاج تھا ۔ جس کے سرے اس کے سڈول شانوں پر جھکے ہوئے تھے ۔ جمیل پیشانی کے وسط میں ایک چھوٹے زہریلے ناگ کی شکل بنی ہوئی تھی جو کہ قدیم مصری شاہی خاندان کی علامت ہے اس کی نازک کمر کے گرد ایک زرکار پیٹی بندھی ہوئی تھی ۔ جس میں بیش قیمت جواہر جگمگا رہے تھے ۔ ہم اپنی جگہ خاموش کھڑے رہے اور ہم نے اس وقت بھی ہلنے کی جرأت نہ کی ۔ جبکہ وہ کمرے کا مختصر حصہ طے کر کے آتشدان کے قریب پہونچی ۔ جہاں کی راکھ میں چمکتے ہوئے انگاروں کے سوا اب کچھ باقی نہ تھا ۔ تھوڑی دیر کے لئے اس نے آگ کی طرف جھک کر دیکھا

اور اس پر وجد کی ایک غیر انسانی کیفیت طاری ہوگئی۔ چند لمحے وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی رہی اور مہربان آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتی رہی۔ ایک سکنڈ کے بعد اس کے نازک لب ہلنے لگے اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ اب بھی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ تب اس نے اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اُٹھائے اور سر کے اوپر ایک محراب کی شکل بنائی اور پھر ہماری طرف جھک گئی جیسے کہ وہ تہ دل سے ہمارا شکریہ ادا کررہی ہے۔

ہم ابھی تک تھر تھر کانپ رہے تھے۔ نہ معلوم کتنی دیر یہی خاموشی اور اثر انگیزی طاری رہی۔ یہاں تک کہ سرزمین مصر کی وہ حسین و پراسرار روح جو کسی غیبی طاقت کے زور سے ایک انسانی شکل میں متجسم ہوگئی تھی آگے بڑھی۔ جیسے کسی نے ہم پر جادو کردیا ہو۔ ہم اس کی مشایعت سے اپنے کو نہ روک سکے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ہم ابھی مشکل سے دروازے تک گئے ہونگے کہ وہ زمین سے بلند ہوئی اور یکایک وہ خوبصورت جسم ہوا میں معلق ہوکر تیرنے لگا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نازک خوبصورت ستارہ آسمان کی بلندیوں سے اتر کر فضا میں آزاد ہوجائے وہ ابھی تک ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ اس کا حسین جسم رفتہ رفتہ بلندیوں میں غائب ہوتا جاتا تھا۔ مگر اس کی غزالیں آنکھیں . . . . . دیر تک یہ محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی آسمانی حور محبت و شفقت سے ہمیں تک رہی ہے یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی کے بے کنار دریا میں جو آسمان سے زمین تک چھایا ہوا تھا کوئی سنہری رنگین مچھلی برابر اوپر کو بلند ہوتی جارہی ہے . . . . . یہاں تک کہ وہ سنہرا پر اسرار سایہ بھی نظروں سے روپوش ہوگیا۔

ہم دونوں میاں بیوی دہلیز پر لرزاں و ترساں کھڑے تھے۔ اور ان سہمے ہوئے بچوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جو کسی خوفناک خواب کو دیکھ کر جاگ اُٹھے ہوں۔ کمرے میں جانے سے اَب کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ اب نیند آنا تقریباً محال تھا۔

صبح ہونے پر ہمارے ہوش و حواس درست ہوئے۔ میں نے احتیاط سے باقی ماندہ ہڈیوں کو جمع کیا۔ کیونکہ میں نے اس وفادار مصری خادم یا پر اسرار کاہن سے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی موت سے پہلے ان ہڈیوں کو مصر لے جاکر "مقبرہ شاہان" میں دفن کردونگا۔

بجھی ہوئی راکھ میں مجھے وہ انگوٹھی بھی ملی۔ جو کہ ایک عرصہ دراز سے مرحوم ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں زیب دے رہی تھی۔ آگ سے اس کو کچھ گزند نہ پہونچا تھا۔ میں نے اسے احتیاط سے اُٹھالیا۔ اور یہ محسوس کیا کہ مہربان، شاہزادی نے یہ تاریخی انگشتری بطور انعام مجھے مرحمت کی ہے۔ چنانچہ آج تک وہ میرے پاس موجود ہے۔ لیکن . . . . .

ابھی مہربان مصری شاہزادی مجھے بھولی نہ تھی۔ ایک بار اور اس کے جمال جہاں آرا کی زیارت میری، مشتاق آنکھوں کے لئے مقدر ہوچکی تھی۔ جس کا تذکرہ میں آئندہ کرونگا۔

حُسن بن کر حُسن کی تنویر پھیلاتی ہوئی
پھول والی آ گئی پھولوں کو شرماتی ہوئی

اپنے دامن میں لئے فطرت کے نازک شاہکار
آ رہی ہے ناز سے کچھ غور فرماتی ہوئی،

مسکرا کر توڑتی ہے رات کی رانی کے پھول
اور بڑھ جاتی ہے پھر خاموش اٹھلاتی ہوئی

ناز کی پالی ہوئی دوشیزۂ مستِ شباب
توڑتی پھرتی ہے کلیاں ناز فرماتی ہوئی

چومتی ہے جوش میں سورج مکھی کے پھول کو
حسن عالمتاب کی اپنے قسم کھاتی ہوئی،

بے نیازی سے کبھی تکتی ہے سنبل کی طرف
دوش پر اپنے بہارِ زلف لہراتی ہوئی

پھر ادائے دلربا سے توڑنے لگتی ہے پھول
نغمۂ صبح بہاراں جوش میں گاتی ہوئی

دستِ نازک سے مسل دیتی ہے کلیوں کو کبھی"
آنکھوں آنکھوں میں حدیثِ ناز دہراتی ہوئی

پونچھ لیتی ہے، عرق آلود پیشانی کبھی"
چار سو مستانہ وحشی نظروں کو دوڑاتی ہوئی

دیکھتے ہی مجھ کو وہ آزاد ہرنی کی طرح"
ہو گئی آنکھوں سے اوجھل حشر سا ڈھاتی ہوئی

مُترجمہ بلال مراد آبادی ؞

ہمیشہ کے لئے جھنجھٹ سے چھوٹ جانے کے انداز میں میں نے کہا

" اچھا چلو مگر آج ہی کے لئے پھر کبھی نہیں "

رام دیو زور سے ہنسا " پھر کبھی سے چلنے کی مجھے ضرورت ہی نہ پڑے گی ۔ بلکہ تم خود مجھے گھسیٹ کر لے چلا کرو گے "

جھینپ مٹانے کے لئے میں نے ہنس کر اپنے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ پر دے مارے اور بولا " تم بڑے کم بخت ہو "

رام دیو کو کم بخت کہنا ہی اس کی سب سے بڑی تعریف تھی ۔ اپنی کم بختی کے فخر کا احساس کر کے اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا ۔ مجھے چلنے کے لئے بالکل تیار دیکھ کر وہ بولا " بھلے آدمی آج بھی یہ ٹاٹ ہی پہنے رہو گے ؟ ذرا دیر کے لئے اسے اتار ڈالو گے تو زندگی بھر کی نیکیوں پر پانی نہ پھر جائیگا ۔

رام دیو " ٹاٹ " کہہ کر میرے کھدر کے لباس کا مذاق اڑایا کرتا تھا ۔ ترک موالات کی تحریک سے متاثر ہو کر میں نے کھدر پہننا شروع کیا تھا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لباس پہن لینا جتنا سہل ہے اسے نبھانا اتنا ہی مشکل ۔ لیکن محض اسی لباس کے طفیل عوام سے جو خراج تحسین و عقیدت ملتا تھا اسے بھی بآسانی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا ۔ کھدر میرے لئے وہ چٹپٹا کھانا تھا جو مصالحوں کی تیزی کے باعث آنکھوں میں آنسو لاتا ہے ۔ لیکن پھر بھی زبان سے چھوڑا نہیں جا سکتا ۔ میں نے رام دیو کی بات کا کوئی جواب نہ دیا چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا ۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے بھی کچھ نہیں کہا ۔

میرے دل میں متضاد خیالات کی ہلچل شروع ہو گئی ہوسنا کی کے جس راستے پر آج میں جا رہا تھا وہ میرے لئے بالکل نیا تھا ۔ اور لطف یہ ہے کہ اپنے اس فعل کی ساری ذمہ داری رام دیو کے سر ڈال کر میں بے فکر ہونے کی بھی کوشش کر رہا تھا ۔ خیالات کی رو کے ساتھ میری رفتار بھی تیز تر ہوتی جاتی تھی ۔

درمیان میں پھر خاموشی کو توڑتا ہوا رام دیو بولا " ارے ابھی سے ایسا نشہ چڑھ گیا کہ راستہ بھی بھلا دیا میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا ۔ جس گلی میں مڑ جانا چاہئے تھے میں اسے چھوڑ کر سیدھا آگے بڑھ رہا تھا میں نادم سا ہو کر گلی میں داخل ہو گیا ۔

یہ وہ رات تھی جو بدر کامل کو نگل کر بھی روشنی کی بھوکی ہوتی ہے ۔ میونسپلٹی کی " غریب " لالٹینیں " اپنے اوپر اندھیرے کا " گلوب " چڑھا کر ٹمٹما رہی تھیں ۔ تاروں نے بھی بادلوں کی ردا اوڑھ رکھی تھی

اپنی کمزوری دور کرنے کی غرض سے میں نے حواس کو مجتمع کیا ۔ موقعہ کے پیش نظر اسے کمزوری ہی کہنا چاہئے ۔

جس طرح کرشن نے ارجن کو بروقت متنبہ کیا تھا۔ کچھ اسیطرح میں بھی خیالات کی الجھن سے نکلنے کی کوشش میں مصروف تھا

میں آگے بڑھتا گیا، یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا گلی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھلا کیا نظر آتا؟ تاہم نہ معلوم کیوں ایسا محسوس ہوا کہ میری مرحوم ماں کی زخمی روح پردۂ ظلمت میں روپوش ہو کر میرے پیچھے آرہی ہے میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا

رام دیو نے پھر چٹکی لی "ارے بھئی مجھ سے چھپا کر دل ہی دل میں کیا کیا منصوبے باندھ رہے ہو

اپنی فکرمندی دور کرنے کے لئے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں ایسی اَن مِل بے جوڑ باتیں کر رہا تھا کہ اب انھیں یاد کر کے خود ہنسی آتی ہے۔

اب ہم منزلِ مقصود کے بہت قریب تھے۔ ۔ ۔ ۔

وہ جگہ جہاں دن رات جوانیاں اور دولتیں لٹا کرتی ہیں نچلی منزل کی دوکانوں کی بنیاں "چراغ سحری" ہو رہی تھیں مگر اوپر والی دوکانوں کے لیمپ پورے شباب پر تھے۔ ایک جگہ سے گھونگروں کی جھنکار آرہی تھی۔ دوسری جگہ کوئی گا رہا تھا۔ کہیں کسی بازاری حسینہ کا شیریں قہقہہ سنائی دیتا تھا تو کہیں کسی بے سدھ شرابی کا کوئی بے ربط جملہ۔ مجھے دھیان آیا کہ اس گناہ کی بستی میں اکیلا میں ہی نہ تھا بلکہ سماج اور دھرم کے سیکڑوں ٹھیکہ دار عقیدت کی نذریں لئے ہوئے موجود تھے

رام دیو ٹھہر گیا اور کہنے لگا اچھا بھئی اب ہم منزل مقصود پہونچ گئے۔ دیکھو اسی زینے سے اوپر جانا ہے۔ لیکن ذرا صبر کرو۔ پاس والی دوکان سے پان تو لے لیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہاں پھول بھی۔ ایسی مقدس جگہ بغیر پھولوں کے جانا ٹھیک نہیں ہے"

پاجی کی بے غیرتی کی سی ہنسی نے میرے دل کو جلا کر خاک کر دیا۔ مگر میں چپ رہا۔ وہ آگے بڑھ گیا مگر میں وہیں کھڑا رہا۔

دوکان تھوڑے ہی فاصلہ پر تھی۔ دوکاندار اگرچہ آہستگی سے بول رہا تھا۔ تاہم اس کی گفتگو میں نے سن لی۔ "یہ بابو نئے معلوم ہوتے ہیں" زیادہ تو نہیں پی گئے؟ وہاں کیوں کھڑا کر دیا؟ یہیں بلا لو"

دوکاندار نے غلط نہیں کہا تھا آئینہ نہ ہونے پر بھی میں اپنے چہرے کا وہ اُتار چڑھاؤ بخوبی دیکھ سکتا تھا جو شرابیوں کا حصہ ہوا کرتا ہے۔ اگر میں نے شراب نہ پی ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواہ وہ کسی قسم کی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو آج یہاں آتا ہی کیوں؟ ادھر سے نظر ہٹا کر میں زینے کو دیکھنے لگا۔ یہ سیڑھیاں مجھے اوپر لے جائیں گی یا اندھیرے غار میں پھینک دیں گی، جہاں سے نکلنا محال ہے"

روشنی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر گلی میں آرہی تھی۔ میرے دماغ میں سوزش سی ہونے لگی۔ اور ٹوپی میں ہاتھ ڈال کر سر کو سہلانے لگا۔ یکایک ہوا کے ایک جھونکے سے میری ٹوپی پیروں میں آگری۔

شو! شو! یہ کیا ہو گیا، میری ٹوپی ویسی نہیں رہ جیسی پہلے تھی۔ اس ٹوپی کی ایک تاریخ تھی۔ لمحہ بھر میں تصور نے گذشتہ تمام واقعات کا نقشہ پیش نظر کر دیا۔ جب شروع شروع میں کھدر پہننے کا شوق ہوا تو ماتا جی زندہ تھیں ایک روز میں نے ان سے کہا

ماں! میں چاہتا ہوں کہ جس طرح تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے سے ہی میری بھوک جاتی ہے، اسی طرح تمہارے ہاتھ کے کپڑے سے میرے جسم کو آرام نصیب ہو گا تم سوت کات دو میں اسی کا بنا ہوا کپڑا پہنوں گا"

ماں کے ہاتھ کے سوت کا ایک ہی کتھان بن پایا تھا کہ وہ دنیا دی جادہ حشم پر لات مار کر عدم کو سدھار گئیں اس کپڑے کی قدر و قیمت کا اندازہ میں ہی جان سکتا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد میں نے اس کی ٹوپیاں سلوالیں۔ فیصلہ کیا کہ والدہ کے ہاتھ کا کپڑا ہمیشہ سر پر ہی رکھونگا۔ اس کپڑے کے ہر تار میں مجھے مہر مادری کا جلوہ نظر آتا تھا۔ ہائے آج میں ایسا برا فعل کرنے پر آمادہ ہوا کہ ماں کی نشانی سر سے اتر کر پیروں میں لوٹ رہی ہے۔ آج مجھ سے جو خطا سرزد ہو گئی ہے اس کا کفارہ کیا ہے۔۔۔؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ سر سے زیادہ اونچی اور پر عظمت جگہ کونسی ہے، جہاں ماں کی آخری یادگار کو رکھ کر اپنے گناہ کی تلافی کر سکوں۔

رام دیو ہاتھ میں پان اور پھولوں کے ہار لئے ہوئے واپس ہوا اور بولا" لو چلو اب"

میں نے ٹوپی اٹھالی تھی اور اسے جھاڑ کر سر پر رکھنے والا ہی تھا کہ رام دیو سامنے آگیا، اس کے ہاتھ میں پان اور پھول تھے اور اس کی نگاہیں بالاخانے کی کھڑکیوں سے لڑ رہی تھیں۔ جہاں ایک بازاری حسینہ نے جھک کر نیچے کیطرف کچھ اشارہ کیا۔

اس نے شرارت کے ساتھ آنکھیں مٹکا کر مجھ سے کہا لو اب قدم بڑھاؤ۔ آج اس بازار کی بھی سیر کر لو۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔نہیں میں اب گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اب جانے دو۔

رام دیو بھونچکا رہ گیا اور میں پاگلوں کی مانند سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ اس گلی سے بہت دور نکل کر میں نے دم لیا اندھیرا اور بھی بڑھ چکا تھا۔ آسمان میں ایک تارا تک نظر آتا تھا لیکن میں نے خیال کیا کہ میں بے انتہا روشنی میں آپہونچا۔

جناب ایمن منصوری کلکتہ

کون سنتا ہے جہاں میں داستانِ آرزو
عشق والے ہی سمجھتے ہیں زبانِ آرزو

آ کلیجہ سے لگالوں تجھ کو اے داغِ فراق
تجھ سے ہی باقی ہے کچھ دلمیں نشانِ آرزو

برق کے رنگین تنکے چن رہا ہوں طور پہ
شاخِ فطرت پر بنے گا آشیانِ آرزو

کتنی دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کے ہوتی ہے فنا
ڈھونڈھتا ہے قربِ ساحل بادبانِ آرزو

ذرہ ذرہ ہے مجسم سرگذشتِ عاشقی
کسقدر ہے وسعتِ حسنِ بیانِ آرزو

داغِ حسرت ہے کہیں داغِ تمنا ہے کہیں
دل کا ہر گوشہ ہے گویا گلستانِ آرزو

عشق کی تکمیل کو اے ایمنِ خستہ نہ پوچھ!
اب کسی کا حسن ہے خود رازدانِ آرزو

اسلم اور میں ساتھ ساتھ کالج کی زندگی میں داخل ہوئے تھے اور اس تھوڑے عرصہ میں اس قدر موانست پیدا ہوگئی تھی کہ ایک دوسرے کے پرخلوص دوست بن گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دار الاقامت میں دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ اسلم سیرت اور صورت کے لحاظ سے بہترین انسان تھا طبیعت میں فیشن پرستی اور جدت بدرجہ اتم تھی۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور تکلفات سے کالج میں مشہور تھا۔ طبیعت میں شوخی اس درجہ تھی کہ ہر وقت مسکرانا اسکا معمول تھا۔ احباب کی موجودگی میں اس کے قہقہے شوخی اور پر مزاح گفتگو قابلِ دید تھے۔ فکر اور اسلم دو متضاد چیزیں تھیں۔ سنجیدگی اور متانت کی اس کو ہوا تک بھی نہ لگی تھی۔ میں اکثر اس کی ہر وقت کی ۔ ۔ ۔ ۔ شوخی اور مزاح پر اعتراض کرتا مگر اس کا جواب کچھ ایسا پر مذاق ہوتا کہ مجھ کو مجوب ہوکر خاموش ہو جانا پڑتا۔ غرض کہ اسلم "کھاؤ پیو اور خوش رہو" کے مقولہ کا جیتا جاگتا مرقع تھا۔ اور ایسا انسان تھا جس کو قدرت نے صرف خوش رہنے کے لئے پیدا کیا تھا!

لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ عرصہ سے اس کی فطرت میں تغیر واقع ہوچلا تھا۔ نہ تو پہلی سی شوخی رہی تھی اور نہ ہی زندہ دلی بلکہ ایک خاموشی تھی۔ جو ہر وقت اس کے لبوں پر مسلط رہتی۔ میں اسلم کے اس تغیر سے خوش تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ سنجیدگی اور متانت ایسی خوبیاں ہیں جو انسان کی ترقی کا زینہ ہیں اور ہر شخص کے لئے انکا حاصل ہونا ضروری ہے۔ یہ صفات انسان کو پختہ خیال اور صائب الرائے بنا دیتی ہیں۔ اور دماغ میں سوچنے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس طرح انسان کے منہ سے نکلی ہوئی بات اپنے اندر ایک خاص وزن رکھتی ہے

> وہ ایک حسین ہندو بیوہ تھی جسے بیدرد سماج نے ٹھکرادیا تھا۔ میں نے زندگی کے چمن کی اس نوبہار کلی کو سینے سے لگانا چاہا مگر سوسائٹی کے بیرحم ہاتھوں نے ۔ ۔ ۔ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ

رفتہ رفتہ اسلم کی یہ خاموشی حسرت واندوہ میں تبدیل ہونے لگی اور وہ کچھ کھویا ہوا سا نظر آنے لگا ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ کسی روحی اذیت کا نتیجہ ہے۔ دوا استعمال کرائی گئی مگر حالت کچھ بھی روبہ اصلاح نہ ہوئی۔ بلکہ دن بدن خراب ہی ہوتی گئی۔ ایک دن میں نے اس کی اس حالت کا سبب پوچھا۔ جس سے وہ بے چین ہوگیا اور یہاں تک از خود رفتہ ہوا کہ رونے سے باز نہ رہ سکا۔ قدرت کا کیا زبردست اہتمام تھا کہ جن آنکھوں میں ہر وقت شوخی و شرارت کی چمک بھی رہتی تھی اب ان میں رنج و حسرت کے آنسو بھرے تھے۔ بہ نہ

دیکھکر دوبارہ دریافت کرنے کی ہمت نہ رہی۔

رفتہ رفتہ اسلم کی حالت زیادہ خراب رہنے لگی خاموشی اور دل کے درد نے زندگی میں گھن لگا دیا۔ جب حالت زیادہ خطرناک ہوگئی تو میں نے اس کے والد کو تار دیا تاکہ وہ آ کر کوئی معقول انتظام کریں۔ تار دیکر جب واپس آیا تو اسلم کی حالت نہایت دگرگوں پائی۔ میں نے جلدی سے پیمانہ میں دوا ڈال کر ہونٹوں سے پیمانہ لگا دیا۔ جس کے اثر سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور نہایت ہی نحیف و کمزور آواز میں کہا:-

"دوست اب اس کی ضرورت نہیں پیمانۂ عمر لبریز ہوچکا ہے۔ صرف چھلکنا باقی ہے۔ اس لئے یہ سب بیکار ہے"

الفاظ سن کر میرا دل بھر آیا۔ اور میں بے اختیار رو پڑا اور کہا:- "اسلم خدا کے لئے اتنے مایوس نہ ہو تم کو بہت جلد صحت ہو جائے گی"۔

یہ سنکر وہ آخری مرتبہ مسکرایا۔ لیکن اس مسکراہٹ میں حسرت و مایوسی بھی شامل تھی۔ اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"جمیل! بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ جو کچھ وقت مل رہا ہے اسے غنیمت سمجھو۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تم کو اپنی روداد غم سنا دوں۔ تاکہ تمہاری تشویش دور ہو جائے۔ میری وجہ سے تم اس درجہ پریشان ہوئے اور ایک عرصے کے بعد بھی اپنے گھر نہ جا سکے۔ تمہارے اس خلوص محبت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا"

اتنا کہنے کے بعد اس کا گلا خشک ہوگیا اور اس کے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد پھر بولا "مجھ میں ابھی بھی طاقت نہیں کہ اچھی طرح بول بھی سکوں۔ لیکن تم کو اپنی داستان ضرور سناؤنگا۔ اور مجھ کو امید ہے کہ قدرت ایسا ہونے دیگی سنو جو کچھ میں کہتا ہوں:

"بنارس یونیورسٹی میں داخل ہوئے ہم لوگوں کو قریب چار سال کا عرصہ ہوا اور اس دوران میں جس طرح میں نے اپنی زندگی گذاری وہ یقیناً دوسروں کے لئے قابلِ رشک تھی۔ اس وقت مجھ کو اس بات کا احساس ہی نہ تھا کہ زندگی کے کچھ فرائض ہیں۔ جن کو مجھے ادا کرنا چاہئے۔ مگر اب ہوا..... جبکہ موت سرہانے کھڑی ہے لیکن اب اسکا بھی وقت نہیں اس لئے اس کا ذکر ہی کیا؟ پانچ، چھ ماہ سے میری وہ قابلِ رشک زندگی حسرت و یاس میں تبدیل ہوگئی۔ تم کو معلوم ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ تمہاری سوسائٹی تمہارا رسم و رواج اور سوسائٹی کے وہ ٹھیکہ دار جو انسانیت کو بری طرح پامال کر رہے ہیں جو نام و نمود اور آن و بان کے لئے ضمیر فروشی جائز سمجھتے ہیں جن کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔

میرا معمول تھا کہ روز گنگا کے کنارے ٹہلنے جایا کرتا تھا تم نے اکثر اسکی مخالفت کی کہ میں اس وقت بجائے تفریح کے پڑھا کروں لیکن میں تمہاری مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے برابر جاتا رہا۔ ایک دن جو میرے اس تغیر کا بانی ہے میں بہت ہی سویرے اٹھ بیٹھا تم اس وقت نیند کے مزے لے رہے تھے سورج نکلنے میں دیر تھی۔ دل میں گنگا کی سیر کی سمائی۔ اور بے اختیارانہ چلا گیا۔ وہاں پہونچکر مناظر قدرت میں محو ہوگیا۔ گھونٹ کا یہ حسین منظر دل کی گہرائیوں میں اترا جا رہا تھا۔ میں محظوظ ہو رہا تھا اور نہایت ہی غائر نظروں سے فطرت کی فیاضیوں کو صنعت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ دفعتاً پانی میں ایک شورش سی پیدا ہوئی اور کسی کے گرنے کی آواز کانوں کو سنائی دی میں چونک

پڑا اور قدم کسی فوری جذبہ کے ماتحت اُدھر بڑھے ابھی چند
ہی قدم گیا ہونگا کہ نہایت ہی روح فرسا نظارہ دیکھا میں
نے دیکھا کہ ایک لڑکی پانی میں غوطے کھا رہی ہے۔ اور عنقریب
ڈوبنے والی ہے۔ میں اس نظارے کی تاب نہ لا سکا اور
فوراً اس کو بچانے کے لئے دریا میں کود پڑا اور نکال کر گھاٹ
کی سیڑھیوں پر لے آیا۔ قریب سے جو اس کو دیکھا تو معلوم
ہوتا تھا کہ جل پری اپنے حسن کی تابانی سے گنگا کی فضا کو
منور کر رہی تھی۔ وہ شباب و جوانی کا ایک مجسمہ تھا جو دل میں
جذبۂ پرستش پیدا کرتا تھا جس کو صرف کلی سمجھ رہا تھا، وہ
ایک نوشگفتہ پھول تھا جس کی نکہت باریاں دلوں کو آشفتہ
کر لینے کے لئے کافی تھیں۔ چہرے کے خط و خال اپنی انتہائی
موزونیت ظاہر کر رہے تھے۔ اس کے بڑے بڑے سیاہ
بال پانی میں بھیگ گئے تھے۔ اور جسم پر اس طرح پڑے ہوئے
تھے جس طرح صندل کی شاخوں پر کالی ناگنیں لپٹی ہوئی
ہوں۔

آہ . . . . ! وہ ایک اچھے گھرانے کی ہندو بیوہ تھی
جس کا شوہر اپنی یادگار صرف ایک بچی کی شکل میں چھوڑ گیا
تھا۔ اس کے سسرال والوں نے اسی کو شوہر کی موت کا
ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور پھر اس کے ساتھ وہ وہ سختیاں
روا رکھیں جو ناقابلِ برداشت تھیں۔ سہاگنیں اُس کے
سایہ سے بچتیں کہ مبادا اس کی نحوست کا اثر ان پر پڑ جائے
کہنے کو گھر کی بہو تھی۔ مگر ایک باندی سے بدتر حیثیت تھی گھر کا
سارا کام اس کے نازک کاندھوں پر ڈال دیا گیا جو کل تک
گھر کی لکشمی تھی وہ آج بیوہ ہو کر ڈائن اور ابھاگن جیسے ناموں
سے یاد کی جاتی۔ ماں باپ کے گھر کا دروازہ بھی اس کے لئے
بند تھا۔ ساس سسر کی جھڑکیاں، نندوں کے طعن و تشنیع
نوکرانیوں کی ترچھی نگاہیں اور پڑوسیوں کی حقارت آمیز
باتیں اس کی دن کی محنتوں کا ثمرہ تھیں۔ اس کو تو خیر کون
پوچھتا۔ دو سال کی بن باپ کی معصوم بچی بھی اسی کیا تھ
مورد الزام تھی "کمبخت ایسی منحوس پیدا ہوئی کہ ہوتے ہی
باپ کو کھا گئی"۔ انسانی ذہنیت کی تنگ نظری کا یہ نظارہ
کتنا شرم انگیز ہے، بچہ کا دل ہی کتنا سا ہوتا ہے۔ اس
بے التفاتی نے اُس کلی کو بھی مرجھا دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے اس کی میٹھی میٹھی اور پیاری پیاری باتوں سے گھر کی
فضا محروم ہو گئی۔ ماں کی مامتا مشہور ہے۔ بچی نے ماں
کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا۔ اور مرتے وقت دودھ
کے ایک گھونٹ کو ترس کر رہ گئی۔ ایمان سے تو کہنا کہ کیا
یہ سانحہ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لئے کافی نہ تھا اور
وہ بھی ماں کا مامتا بھرا ہوا دل۔ بچی اس کی زندگی کا سہارا
تھی اس کو دیکھ کر وہ زندہ تھی اور صرف اسی کی بدولت
ہر مصیبت کو برداشت کر رہی تھی۔ قدرت کو یہ بھی منظور
نہ ہوا وہ ہمارے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہے اور اسی
طرح کھیلتی رہے گی۔ لوگ اس میں مصلحت کو دخل دیتے
ہیں، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں قدرت کی
کیا مصلحت ہوتی ہے اور ایک بیکس و دکھیا کو مبتلائے غم
کرنے سے قدرت کو کیا ملا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت
بھی "قوی و ضعیف" کے اصول کی حامل ہے۔ اور یقیناً
ہے۔ جمیل یہ اس کی روداد غم ہے۔"

اب اس افسانے کی آخری کڑی بھی سن لو جس کا
آخری حصہ میری موت پورا کرے گی کیونکہ قدرت اس
معاملہ میں بہت فیاض ہے۔ میں اس کی درد بھری داستان
سنکر بیحد متاثر ہوا۔ اور عہد کر لیا کہ بیوہ کو سہاگن بناؤنگا
اس کے ماتھے کو جو شوہر کے بعد بندی کی زینت سے محروم
رہا ہے پھر سے مزین کرونگا۔ لیکن یہ ارادہ میرا تھا اس کا

تعلق صرف میرے دل سے تھا۔ سوسائٹی میری آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے طیار نہ تھی۔ وہ "مان" اور اپما میں پڑی تھی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اس کے ماتھے سے بیوگی کے بدنما داغ کو مٹادوں، مگر سوسائٹی نے مذہب کی دیوار کھڑی کردی۔ کیا مذہب اسی کا نام ہے کہ انسان دوسرے کی ہمدردی نہ کرسکے اور انسانی فرائض ادا کرنے سے محروم کردیا جائے؟ ایک تباہ شدہ ہستی کو بربادی سے نہ بچایا جائے بلکہ اور برباد ہونے دیا جائے۔

غرض کہ سوسائٹی کے غیر فطری اصولوں کا کہاں تک رونا رویا جائے، وہ غریب سارے ارمانوں کے ساتھ ظالم سوسائٹی کی قربانگاہ پر قربان ہوگئی اور مجھ کو تنہا کرب وبلا کی زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ گئی۔

اب میری نظر میں دنیا کی ساری دلچسپیاں بے کیف ہیں میں خود بھی دنیا میں رہنا نہیں چاہتا۔ اور ایسی دنیا میں جارہا ہوں جہاں نہ مذہب کی قید ہے اور نہ ہی یہاں کی طرح ظالم سوسائٹی کا وجود۔ وہاں مذہب وملت کا کوئی امتیاز نہیں

دیکھو جمیل! اس کی روح مجھے آواز دے رہی ہے اچھا۔۔۔ دیوی۔۔۔ میں۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ رہا ہوں۔

آخری الفاظ اسکی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے اور اس کے بعد اس کی آواز بند ہوگئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ جس بات کا مجھے خوف تھا وہی ہوا۔ اسلم کشمکش حیات سے آزاد ہوچکا تھا۔ اس کی روح اپنی دیوی کے پاس پہونچ چکی تھی۔ شاید اس کی جان صرف داستان ہی سنانے کے لئے رکی ہوئی تھی۔

مسافر کی ایجنسی ایک قابل اعتبار مفید مشغلہ ہے

محبت کے حسیں پھولوں کا گلدستہ سجانا ہے
مجھے آج اک شبابِ فتنہ پرور کو منانا ہے
جہانِ آب و گل سے دور اک بستی بسانا ہے
تصور ہی تصور میں کسی کے پاس جانا ہے

کہاں تک گردشِ ایام کا شکوہ کرے کوئی
وہ جب بیگانہ ہو جائیں تو آخر کیا کرے کوئی

بتا اے سنگدل کافر جوانی کی قسم تجھ کو
کبھی ہوتا ہے میری طرح احساسِ الم تجھ کو
ستاتی ہے کبھی تاریکیٔ شب ہائے غم تجھ کو
کبھی میری بھی یاد آتی ہے او محوِ ستم تجھ کو

گذرتی ہیں تری راتیں کبھی فریاد و منیں آہوں میں
کوئی مٹتی ہوئی تصویر پھرتی ہے نگاہوں میں

سن اے کافر ابھی اب تک عہدِ الفت کو نہیں بھلا
ترا عادل تری معصوم صورت کو نہیں بھولا
بہارِ صبحِ وصل و شامِ فرقت کو نہیں بھولا،
محبت کی قسم کیفِ محبت کو نہیں بھولا،

جوانی کی جنوں انگیز باتیں یاد آتی ہیں ؛
خدا شاہد مجھے اب تک وہ راتیں یاد آتی ہیں

وہ راتیں آہ وہ راتیں وہ مست و بیکراں راتیں
وہ جلوہ ریز و فتنہ پاش و ہنگامہ فشاں راتیں
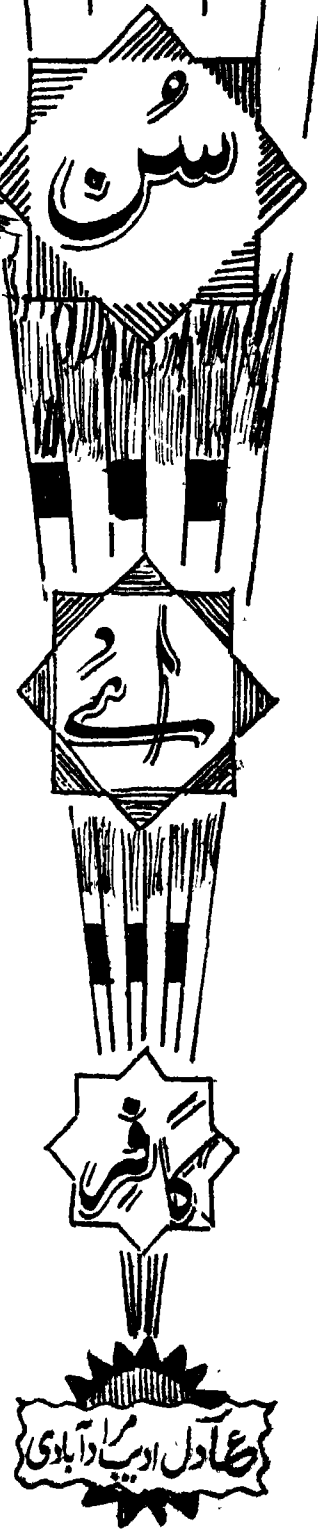
وہ راتیں وہ خمارِ آرزو سے سرگراں راتیں،
جواں لمحے، جواں نغمے، جواں جلسے جواں راتیں

مہ و انجم کا جلوہ کیا سرور آمیز ہوتا تھا
وہ راتیں جن کا ہر لمحہ شباب انگیز ہوتا تھا

خدا کے واسطے بول او تصور کی حسیں دیوی
تجھے زیبا نہیں ہرگز یہ درد انگیز خاموشی
کہاں تک پردۂ بیگانگی اے پیکر خوبی!
ترا دیوانہ کب سے کر رہا ہے منتیں تیری

زباں سے کاش تو کہدے کہ میں بھی یاد کرتی ہوں
زبانِ خامشی سے نالہ و فریاد کرتی ہوں

یہ سچ ہے کائناتِ آرزو برہم نہیں ہوتی
جدائی لاکھ بڑھ جائے محبت کم نہیں ہوتی
زباں ہرچند محوِ نالۂ ماتم نہیں ہوتی
مگر روحِ محبت غم سے نامحرم نہیں ہوتی

غمِ فرقت میں تسکینِ دل وجاں سخت مشکل ہے
یہ دردِ لادوا وہ ہے کہ درماں سخت مشکل ہے

حسینہ! میں تری مجبوریوں سے کانپ جاتا ہوں
خدا شاہد کہ تیرے واسطے آنسو بہاتا ہوں
یہ سچ ہے جذبۂ غم کو زمانے سے چھپاتا ہوں
مگر اس پر بھی تجھ کو اپنا افسانہ سناتا ہوں

نہیں سوزِ نہاں سے تیرے عادل کو قرار اب بھی
حجابِ شوق کا رہتا ہے دل کو اضطراب اب بھی

تہذیب کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے اِن الفاظ میں پیشین گوئی کی ہے کہ :-

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا"

یہ خوفناک پیشین گوئی روز بروز عملی جامہ پہنتی جاتی ہے گذشتہ پچیس برس سے ... تہذیب کو جو خطرناک گھن لگ گیا ہے اس کے نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ جنگِ عظیم وہ سب سے پہلا موقعہ ہے کہ جب دنیا نے محسوس کیا کہ..... تہذیب و تمدن کی عمر ختم ہو چکی ہے اور اب وہ انسانیت کے دوش پر ایک ایسا ناگوار بوجھ ہے جس کو اتار کر پھینک دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ درحقیقت ۱۹۱۴ء کا سانحہ صرف ایک سیاسی اور ملکی سانحہ ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک اقتصادی اور سماجی انقلاب بھی تھا۔ جس نے تمام معاشرتی نظریات اور فکری رجحانات کی رفتار بدل دی۔ ساغر میں گذشتہ چند ماہ سے پچھلی جنگِ عظیم کے اسباب و علل پر ایک سلسلۂ مضامین چل رہا ہے جس کے مطالعہ سے ہم اس عظیم ترین بین الاقوامی کشمکش کے ذہنی پس منظر سے واقف ہو سکتے ہیں۔ پچھلی صحبت میں گفتگو کا سلسلہ اس نقطے تک پہنچا تھا کہ سرویا اور آسٹریا کی ناگوار نزاع اور آسٹرین شہنشاہیت کے جارحانہ رویہ سے متاثر ہو کر روسی حکومت نے اجتماعِ افواج کا حکم دیا اور گو آخری وقت قیصر ولیم نے ہر چند کوشش کی کہ وہ اس خونیں حادثے کو اپنے اثر و نفوذ سے ٹال دے مگر ایسا ممکن نہ ہوا اور حالات لمحہ بہ لمحہ بدتر ہوتے چلے گئے۔ اس کے بعد جرمن پالیسی میں کیا تبدیلی ہوئی؟ اس کو معلوم کرنے کے لئے ذیل کا مقالہ پڑھئے :-

---

۲۹ر جولائی ۱۹۱۴ء کو روسی گورنمنٹ نے شہنشاہیت آسٹریا کے خلاف" جزوی اجتماعِ افواج" کا حکم دیدیا۔ عام آدمیوں کے نزدیک غالباً اجتماعِ افواج (MOBILISATION) کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر ماہرینِ جنگ کے نزدیک وہ ایک اہم ترین فوجی اقدام ہے جس کے حسبِ ذیل معنیٰ ہو سکتے ہیں

(۱) محدود و مفہوم میں، امن کی طاقت کا جنگ کی طاقت میں منتقل ہو جانا اور محفوظ (ریزرو) دستوں کو طلب کر لینا جیسا کہ ۱۹۰۸ء و ۱۹۰۹ء میں آسٹریا اور سرویا کے درمیان اور ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء میں آسٹریا اور روس کے درمیان پیش آیا۔

(۲) فوجی نقل و حرکت جب سے رسل و رسائل کے جدید ترین ذرائع ظہور میں آئے ہیں یہ بہت آسانی سے ہو جاتا ہے ان دونوں اہم اقدامات کا نتیجہ لازمی طور پر جنگ ہوتا ہے۔ جب کسی ملک میں اجتماعِ افواج کا حکم دیا جائے تو سمجھ لیجئے کہ خطرے کی گھنٹی بجنے لگی یہی معنیٰ غالباً اُس بیان کے ہیں کہ جو جنرل بوئیڈرف نے ۱۸۹۲ء میں دیا تھا اور جس کی تائید زارِ روس

نے کی تھی کہ . . . . اجتماع افواج کے معنی جنگ ہیں . . . . اور ۱۹۱۲ء میں حکومت روس نے اپنے اسی بیان کو دوبارہ دہرایا

۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کو کاونٹ بیچ ٹولڈ نے برلن کو تار دیا جس میں یہ زور ڈالا گیا تھا کہ قیصر کی حکومت جزوی اجتماع افواج کے جواب میں "مکمل اجتماع افواج" کا اعلان کرے۔ یہ عام طریقہ ہے کہ دھمکی کا جواب دھمکی سے دینا چاہئے۔ مجھے معلوم کرنا ہے کہ حکومت جرمنی اس نازک وقت میں کیا ایکشن لیگی۔"

اس وقت یورپی سیاست داں عجب تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے۔ چنانچہ ریاست بویریا کے وزیر مقیم برلن نے اپنی گورنمنٹ کو حسب ذیل رپورٹ بھیجی کہ:۔

"جرمنی کا طرزِ عمل اس حقیقت سے پیش نظر سخت مشکل میں پڑ گیا ہے کہ آیا وہ کارروائیاں جو کہ فرانس و روس میں ہورہی ہیں محض دھمکانے کا پروپیگنڈا ہیں یا حقیقت واقعہ ہے؛"

یہ پوزیشن جنرل اسٹاف کے لئے بہت ہی پریشان کن تھی۔ ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کو پہلی مرتبہ کچھ تفصیلات منظر عام تک آئیں کہ روس نے اعلان کیا ہے کہ وہ آسٹریا کے خلاف فوجی نقل و حرکت شروع کریگا اور اگر آسٹریا نے سرویا پر حملہ کردیا تو وہ پوری طرح حملوں کی مدافعت کریگا۔

اس ضمن میں جرمنی کے فوجی عہدہ داروں کا خیال یہ تھا کہ روس انگلستان، اور فرانس کے درمیان یہ طے پاگیا تھا کہ ۱۹۱۷ء میں جرمنی پر حملہ کیا جائے گا اور یہ جرمنوں کی خوش قسمتی ہے کہ موجودہ جنگ تین سال قبل شروع ہوگئی اور اتحادیوں کو تیاریوں کا پورا موقعہ نہ ملا۔ جرمن کمانڈر انچیف "روی لوئیکے" تمام سازشوں کا سردار روس کو سمجھتا ہے۔ اسی کمانڈر نے مزید زور ڈالا کہ وہ جلد از جلد اجتماع افواج کا حکم دیدے تاکہ اسی وقت اتحادیوں سے نمٹ لیا جائے۔ بصورت دیگر اسٹریا

جرمنی اور اُن کے حلیفوں کے لئے مشکل ہوگا کہ وہ اِن تین زبردست طاقتوں کا مقابلہ کرسکیں۔[1]

اِدھر جرمن گورنمنٹ ابھی تک مفاہمت اور مصالحت کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے سفیر مقیم سینٹ پیٹرسبرگ کو احکام بھیجے جس میں حکومت روس کو اجتماع افواج کے خطرات سے آگاہ کیا اور پھر ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کی صبح کو برلن میں وزراء کی ایک کونسل قیصر کی زیر صدارت ہوئی۔ اس مشورت کی تفصیلات شائع نہیں ہوئیں فرانسیسی سفیر کی طرف سے یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ اجتماع افواج طے کردیا گیا ہے لیکن یہ دوسرے روز ملتوی کردیا گیا اِدھر باوجود جنرل اسٹاف کے دباؤ کے برلن کی حکومت نے فوجی نقل و حرکت کو ملتوی کردیا تھا۔ یہ آثار امن و سکون کے تھے مگر روسی طرزِ عمل نے تمام کوششوں کو بیکار کردیا۔ اور جنگ کی مہیب ساعت قریب آگئی

۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کی صبح کو ۱۱ بجے کے قریب کاونٹ پورٹلیس (جرمنی سفیر) نے مسٹر سزونوف (روسی وزیر خارجہ) سے ملاقات کی اور اس دباؤ کا ذکر کیا جو حکومت جرمن وائنا پر ڈال رہی تھی روسی وزیر خارجہ نے جرمنی کی حکومت کی ان کوششوں کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ابھی تک آسٹروی حکومت . . . . نے براہ راست زار کی حکومت سے سلسلہ جنبانی نہیں شروع کی۔ سزونوف نے یہ بھی کہا کہ آسٹروی اجتماع افواج کی اطلاع سنکر اس نے سرحد آسٹریا پر روسی فوجوں کے اکٹھے ہونے کا حکم دیدیا ہے۔ اس پر کاونٹ پورٹلیس نے احتجاج کیا تو روسی وزیر خارجہ نے جرمن سفیر کو اطمینان دیتے ہوئے کہا کہ روس میں

---

[1] کاٹسکی ضمیمہ ۴ نمبر ۵ ــ بویریا کے سفیر مقیم برلن کی رپورٹ مورخہ ۵ راگست ۱۹۱۴ء

اجتماع افواج کے معنی وہ نہیں جو یورپ میں ہیں اور اس سے کسی قسم کی دہمکی مدنظر نہیں ہے۔ روسی فوج بلاشبہ چند ہفتوں تک مسلح رہے گی مگر وہ سرحد کو عبور نہ کرے گی اس پر جرمن سفیر کا ذرا بھی اطمینان نہ ہوا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ روسیوں اور فرانسیسیوں دونوں کی لغت میں اجتماع افواج کے معنی ہیں "اعلانِ جنگ" چنانچہ اس نے روسی وزیر خارجہ کو جواب دیا کہ:۔

روسی اجتماع افواج کا ردعمل دوسری حکومتوں پر بہت شدید ہوگا۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حالات کے دباؤ سے مجبور ہوکر کیا قدم اُٹھانا پسند کریں۔ ایم سیزونوف نے پھر اطمینان دلایا کہ اجتماع افواج سے ہمارا مقصد کوئی جارحانہ اقدام نہیں لیکن کاؤنٹ پورٹلیس مطمئن نہ ہوسکا۔ اور اس نے صاف طور پر روسی وزارت خارجہ کے چیف کو بتلادیا کہ آسٹریا سے اتحاد کے سلسلہ میں جرمنی پر کتنی عظیم ذمہ داریاں ہیں اور یہ کہ جرمن گورنمنٹ اِن سب ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے ہر طرح آمادہ ہے۔ جب جرمن سفیر رخصت ہوگیا تو ایم سیزونوف نے اپنے سکریٹریوں سے اس ملاقات کے متعلق گفتگو کی اور کہا کہ کیا درحقیقت قیصر نے تاجدار آسٹریا پر جنگی کارروائیوں کے معطل کردینے کے لئے دباؤ ڈالا ہے؟ یا یہ محض اپنی جنگی طیاریاں مکمل کرنے کے لئے ایک مہلت تلاش کرتا ہے اسی روز شام کو چھ اور سات بجے کے درمیان پھر جرمن سفیر روسی وزارت خارجہ کے دفتر میں آیا اور اس نے اپنی گورنمنٹ کی طرف سے حکومت روسیہ کو یہ پیغام پہونچا دیا کہ اگر روسی فوجوں کی نقل و حرکت بدستور جاری رہے گی تو جرمن جنرل اسٹاف بھی مجبور ہوگا کہ وہ اپنے مسلح دستوں کو عام لام بندی کا حکم دیدے۔ اور پھر اس صورت میں عالمگیر جنگ کی حدبندی مشکل ہوجائیگی اس پر ایم سیزونوف نے عجب مبہم جواب دیا اس نے کہا کہ "اب ہم کو معلوم ہوگیا کہ آسٹریا کی موجودہ جارحانہ کارروائیوں کی حقیقی بنیاد کیا ہے؟" روسی وزیر خارجہ کا مطلب یہ تھا کہ جرمن گورنمنٹ کی پشت پناہی ہی آسٹریا کے جارحانہ اقدام کا اصل سبب ہے۔

اس جملے پر کاؤنٹ پورٹلیس اپنی نشست سے اچھل پڑا۔ اور اس نے چلا کر کہا کہ جناب وزیر خارجہ! میں اپنی پوری طاقت سے اس ریمارک کے خلاف احتجاج کرتا ہوں یہ ایک توہین آمیز اِشارہ ہے۔

لیکن جرمن سفیر کے احتجاج کا روسی وزیر خارجہ نے صرف اتنا جواب دیا کہ آپ کی حکومت کے پاس اب بھی موقع ہے کہ وہ اپنے طرز عمل سے اس خیال کی غلطی ثابت کردے اس پر روسی و جرمن گفت و شنید ختم ہوگئی۔ صرف ایم سیزونوف نے جرمن سفارتخانہ کو اتنا یقین دلایا کہ وہ جرمن نقطۂ نظر شہنشاہ تک پہونچا دیگا۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ وائنابرلن، سینٹ پیٹرزبرگ اور دیگر یورپی دارالسلطنتوں میں تو یورپی مدبرین زیتون کی ٹہنی (علامت صلح) ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے، مگر ان شہروں سے دور وسیع میدانوں میں مسلح فوجیں برابر مارچ کررہی تھیں اور فوجی دستے جنگی پریڈ میں معروف تھے۔ کیونکہ جنگ کا مواد پک چکا تھا۔ اب صرف تقدیر کے ایک نشتر کی دیر تھی جو بغض و نفاق اور کینہ و حسد کے زہریلے مواد کو پوری طرح منظر عام پر لے آئے۔

پائے طلب میں کانٹا جب شوق نے چبھویا
بے اختیار ہو کر بے اختیار رویا

آمادہ کر رہا ہوں ترکِ وفا پہ دل کو
یا اعتبار آیا، یا اعتبار کھویا

میں اور مرا سفینہ پھر اپنی اپنی راہیں
اب کون یہ بتائے کس نے کسے ڈبویا

کل زندگی کا وقفہ اس بیخودی میں گذرا
پوری طرح نہ جاگا پوری طرح نہ سویا

اشکوں کی لغزشوں کا اللہ ری تسلسل
افسانہ کہہ رہی ہیں آنکھیں کسی سی گویا

ہے موت خود ہی گویا آمادگی فنا پہ
غم کا بھی زندگی نے اب اعتبار کھویا

کیا کہیے لغزشوں کو طوفاں نواز دل کی
بہتا ہوا سفینہ ساحل پہ جا ڈبویا

بے ربط ہو چکی ہیں سب جستجو کی کڑیاں
میں تو ہوں غم کا جویا غم زندگی کا جویا

کوتاہیٔ وفا کا الزام تھا جنھوں پر
خود میں نے آنسوؤں سے دامن کو اُنکے دھویا

انجام حسن و غم کا بس اسقدر ہے تاباں
وہ رو کے مسکرائے میں مسکرا کے رویا

بنگال کا مشہور انقلاب پسند دبی این چڑجی، اپنی زندگی کے ابتدائی حادثات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ کس طرح اس کی یورپی ماں شیریس اس کے حلیم باپ سر بندناتھ چڑجی کو تنہا چھوڑ کر ایک انگریز مسٹر گریٹ کے ساتھ فرار ہو گئی اور کس طرح اس کے بوڑھے باپ نے دل شکستہ ہو کر کلکتہ چھوڑ دیا جہاں اس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ گذارا تھا اور کلکتہ کے بجائے اپنے آبائی وطن سادھنا پور کی طرف ہجرت کی۔ وہ لکھتا ہے کہ کلکتہ کی جدائی سے اسکا معصوم دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کیونکہ یہ خوبصورت شہر نہ صرف اس کا مولد تھا بلکہ اسی سرزمین پر اس نے اپنی زندگی کے انتہائی نشاط آمیز لمحات گذارے تھے وہ سادھنا پور پہونچنے کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

میلوں کی مسافت مارکر بالآخر صبح کو ہماری ٹرین سادھنا پور کے چھوٹے سے خوبصورت اسٹیشن پر آکر رکی۔ چاروں طرف دھانوں کے سرسبز کھیت دیہات کی پاک اور بے غلش فضاؤں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں، اور نالے دور حد نظر تک بل کھاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہوا میں ایک حد تک رطوبت اور سردی تھی۔ اور چاروں طرف ایسی مزید ار خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ روح تک کو سکون ہوتا تھا۔ بابا نے ایک عرصہ دراز کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھا تھا جسے وہ بھول چکے تھے سادھنا پور اگرچہ ان کا آبائی وطن تھا مگر ان کی عمر کا بیش قیمت حصہ کلکتہ کی گنجان آبادی میں گذرا تھا۔ اسی لئے اب انھیں سادھنا پور لوٹتے ہوئے کافی روحانی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ اسکا اظہار انھوں نے [illegible] سے نہیں کیا تھا مگر ہم اسٹیشن پر خاموشی سے اتر آئے اور کلکتہ کے سفر کی آخری یادگار کثیف دھواں پیچھے چھوڑتی ہوئی اور غل و شور مچاتی ہوئی سامنے والے جنگلوں میں غائب ہو گئی۔ اسٹیشن پیچھے چھوٹ چکا تھا اور اب ہم ایسی پگڈنڈیوں پر چل رہے تھے جو دیہاتی گاڑیوں کی نقل و حرکت اور آمد و رفت کا گہرا نشان تھیں۔ سورج ابھی آسمان پر بلندی ہوا تھا اور سنہری دھوپ اونچے درختوں کی پھلنگیوں پر اور وسیع و شاداب کھیتوں پر لرز رہی تھی ہم ایک چھوٹی سی دیہاتی گاڑی میں جسے دو مسکین اور حلیم بیل کھینچ رہے تھے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارا سامان حد درجہ مختصر اور سادہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ زیادہ سامان اور اسباب کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ ہم خود اپنے مکان پر جا رہے تھے کسی پر ہمانی کا داؤ ڈالنا منظور نہ تھا لیکن ابھی سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ غریبا گاؤں والے اور خصوصاً

ہمارے خاندانی رشتہ دار اپنے کلکتہ کے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے کس طرح پیش آتے ہیں؛ پاپا کو تو وہ کسی طرح برداشت کرنے کو طیار بھی ہو سکتے تھے کیونکہ وہ خود ایک ان کا جزو تھے ہر چند کہ یہ جزو ان کی سماج سے کٹ کر الگ ہو چکا تھا۔ مگر میں۔ ۔ ۔ ۔ ؛ ظاہر ہے کہ میں ایک انگریز لیڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور اُن کی سماج سے کہیں دور کا تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ؟

چند گھنٹے میں ہماری سست رفتار وقیانوسی سواری سادھناپور کی حدود میں داخل ہو گئی۔ ایک پرانا نیم آباد قصبہ، باغوں اور جنگلوں سے گھرا ہوا ایک پختہ شاہراہ کے کنارے دنیا سے الگ تھلگ اپنی زندگی کا اعلان کر رہا تھا جوں ہی پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز گاؤں میں گونجی چھوٹے چھوٹے بچے حیرت زدہ عورتیں اور تحقیق پسند بوڑھے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ آخر کون گاڑی پر چڑھ کر انگریزی لباس پہنے اِن کی راج دھانی میں آ دھمکا؟ پاپا گاؤں کی حدود میں داخل ہوتے ہی سواری سے اُتر گئے تھے وہ تعجب اور اشتیاق کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جس میں انفعال و پشیمانی کے اثرات بھی کار فرما تھے اس بے ترتیب استقبالی مجمع اور در و دیوار کو گھور رہے تھے شاید انھیں کسی ایسی ہستی کی تلاش تھی جو انھیں پہچان کر فوراً ان کا استقبال انجام دے سکے۔ ہمارا پختہ شاندار مکان گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع تھا۔ ابھی گاڑی گاؤں کے وسط میں پہونچی تھی کہ پاپا ایک قدیم چہرہ کو پہچان کر اُتر پڑے اور ایک ضعیف بڈھے کے سامنے پہونچ کر ادب سے سلام کیا۔ اس دوران میں ہمارے پہونچنے کی خبر گاؤں کے دوسرے بڑھوں تک ہماری آمد کی اطلاع پہنچا چکا تھا اور کچھ دیر نہ گذری تھی کہ گاؤں کے ایک نمائندہ وفد نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہ ہم سے مانوس تو کیا البتہ مرعوب ضرور ہو گئے تھے، کچھ رشتہ داروں اور بزرگوں نے شفقت و محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اگرچہ اُنکے ہاتھوں میں خلوص اور سچائی کی گرمجوشی مفقود تھی۔ اتنی دیر میں ہمارا مکان کھلوا دیا گیا تھا اور اس کی ترتیب و زینت تو کیا صفائی اور ستھرائی شروع ہو گئی تھی۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ سادھناپور میں ہمارے قدیم رشتہ داروں میں کوئی موجود نہ تھا۔ قریب ترین عزیزوں میں میری فقط ایک پھوپی، تھیں جو سادھناپور آ کر نہ صرف میری تربیت و نگہداشت بلکہ گھریلو انتظامات و معاملات کی بھی ذمہ دار بنائی گئی تھیں اس زمانے میں ہماری زمینداری کا تمام کار وبار ایک بوڑھے پنڈت کے ہاتھ میں رہا جو دادا کے وقت سے ہماری تمام جائداد کا ایک معتبر کارکن تھا۔ معتبر میں نے اس لئے کہا کہ پاپا اسے قابلِ اعتبار سمجھتے تھے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ کلکتہ کے دوران قیام میں ہمیں کبھی بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ سادھناپور میں ہماری کچھ زمینداری موجود ہے؛ کلکتہ کی جو کچھ جائداد تھی وہ سب کی سب پاپا کی پیدا کردہ تھی۔

ہمارا نیا مکان اپنے منظر و ماحول کے اعتبار سے یقیناً کافی دلچسپ اور شاندار تھا کلکتہ کو جانے والی پختہ سڑک اس کے نیچے سے ہو کر گذرتی تھی۔ کچھ دور ایک دیہاتی ندی "سڑکا" خاموشی اور آہستگی سے بہتی تھی اس کے علاوہ آم اور کیلے کے متعدد باغات مکان کو گھیرے ہوئے تھے یہ دلچسپ فضا، دل بہلانے اور سیر و تفریح کرنے کے لئے کم نہ تھی۔ ۔ ۔ ۔ مگر۔ ۔ ۔ کلکتہ۔ ۔ ۔ ۔ ؛ وہ بنگال کی سب سے زیادہ خوبصورت اور شاندار آبادی۔ ۔ ۔ ۔ مامی۔ ۔ ۔ وہ

محبت کرنے والی مغلوب الغضب دیوی . . . ایلینا وہ بھی معصوم اور خوبصورت گڑیا . . . . وایہ آہ وہ مہربان اور سادہ مزاج لیڈی . . . . سادھنا پور میں یہ سب کہاں تھے ؟ اب فقط ان کی یاد رہ گئی تھی ۔ مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکیزہ روحیں میرے گرد منڈلا رہی ہیں ۔ افق سے جھانک رہی ہیں اور تاروں کی بستیوں سے مجھے آواز دے رہی ہیں ۔ روزانہ صبح کو اٹھ کر کلکتہ کی سڑک کو اشتیاق و محبت سے تکتے رہنا میرا معمول تھا ۔ میں اکثر اس سے کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور اپنی نگاہیں دور جنگلوں پر جما دیتا ۔ جہاں یہ پتھریلی شاہراہ آخری بل کھا کر نظروں سے غائب ہوتی ہے بے اختیار مجھے یہ محسوس ہوتا کہ میں کلکتہ میں پہونچ گیا ہوں ۔ اور بنگلہ میں ماں سفید ریشمی گون پہنے میرا انتظار کر رہی ہیں ۔ اور ایلینا . . . . وہ بھی وہیں موجود ہے ۔ ہم دونوں پائین باغ میں کھیل رہے ہیں ۔ مدرسے کی بنچوں پر بیٹھے ہوئے جھگڑ رہے ہیں یا سمندر کے کنارے سیر و تفریح کر رہے ہیں ۔ آہ مجھے یہ سڑک کتنی محبوب اور دل پسند تھی ۔ جب کسی گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز میرے کانوں میں آتی ، میں دوڑ کر مکان سے نکل آتا ۔ اس وقت بے اختیار مجھے یہ خیال آتا کہ یہ گاڑی کلکتہ جا رہی ہے ۔ میں اس گاڑی کو اس کے غائب ہونے تک ٹکٹکی باندھے تکتا رہتا اور جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تو اس کے باقیماندہ منتشر غبار کی سر گردانی کا مزہ لیتا رہتا ۔ آہ میری تصور پسند زندگی مایوسی اور بے کسی کی کس آخری منزل تک پہونچ چکی ہوئی تھی ؟

کیا پاپا میری روح کی خلش اور طبیعت کی اداسی سے ناواقف تھے . . . ؟ میں اس پر کس طرح یقین کر سکتا ہوں مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش تھے کیونکہ میرے بے پناہ درد کا علاج ان کے پاس بھی نہ تھا ۔ میں ایک ایسے ماضی کی تلاش میں تھا جو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غائب ہو چکا تھا ۔ مجھے ایک ایسی زندگی کی جستجو تھی جسکی واپسی کا اب کوئی امکان نہ تھا ۔ میں اس دنیا کے خواب دیکھ رہا تھا جس دنیا کا اس دنیا میں اب وجود نہ تھا ۔ ظاہر ہے کہ پاپا اس سلسلہ میں میری کیا امداد کر سکتے تھے وہ خود بھی جس شدید روحانی کرب سے گذر رہے تھے اس کا اندازہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے ۔ ایک شخص اگر زندگی بھر کی کامرانیوں اور آسائشوں کو ٹھکرا کر گمنامی کے کسی گوشے میں جا پڑے تو اس کا دل کیا کہتا ہوگا ۔ ؟

بیکس کے آنسو

وقتِ رخصت جو بہہ گئے آنسو
حالِ دل ان سے کہہ گئے آنسو
اور سب مٹ گئے نقوشِ حیات
دیدۂ تر میں رہ گئے آنسو

بیکس مراد آبادی

کمال شیراز

کوکب مرادآبادی

اللہ اللہ! جلوۂ رخسارِ تابان کسے
من چہ گویم قصۂ الطاف واحسان کسے

آن نگاہِ مستِ ساقی آن سرورِ جامِ مُل
میکند بلبل چرا بر حسنِ گلشن شور و غل

می چکد در ہجر آن کافر زمژگان اشکِ خون
درد و غم شد در فراقِ یار از طاقت برون

کوکب آشفتہ، شد آشفتہ تر در فرقتے
از زبانِ حال میگویم بہ جوشِ الفتے

زین گل عارض شدہ تازہ گلستان کسے

تازہ دارد زخم دل فیضِ نمکدان کسے
سبز شد نخلِ مراد از آبِ پیکان کسے
بر بتانِ محفلِ جانان نثار این جز و کل

گر نقاب از رخ کشاید صبحدم آن رشکِ گل
چاک گردد تا بدامان صد گریبان کسے
لختِ دل بریان شدہ در سینہ از سوز دروں

داغ داغ سینہ رنگین گشت از فیضِ جنوں
رفتہ رفتہ گلخن ما شد گلستانِ کسے
یا جنونے یا غمے یا حیرتے یا وحشتے

گر درین سودا درآید زلفِ ہندی بتے
صرف گردد صد ہزاران نقدِ ایمانِ کسے
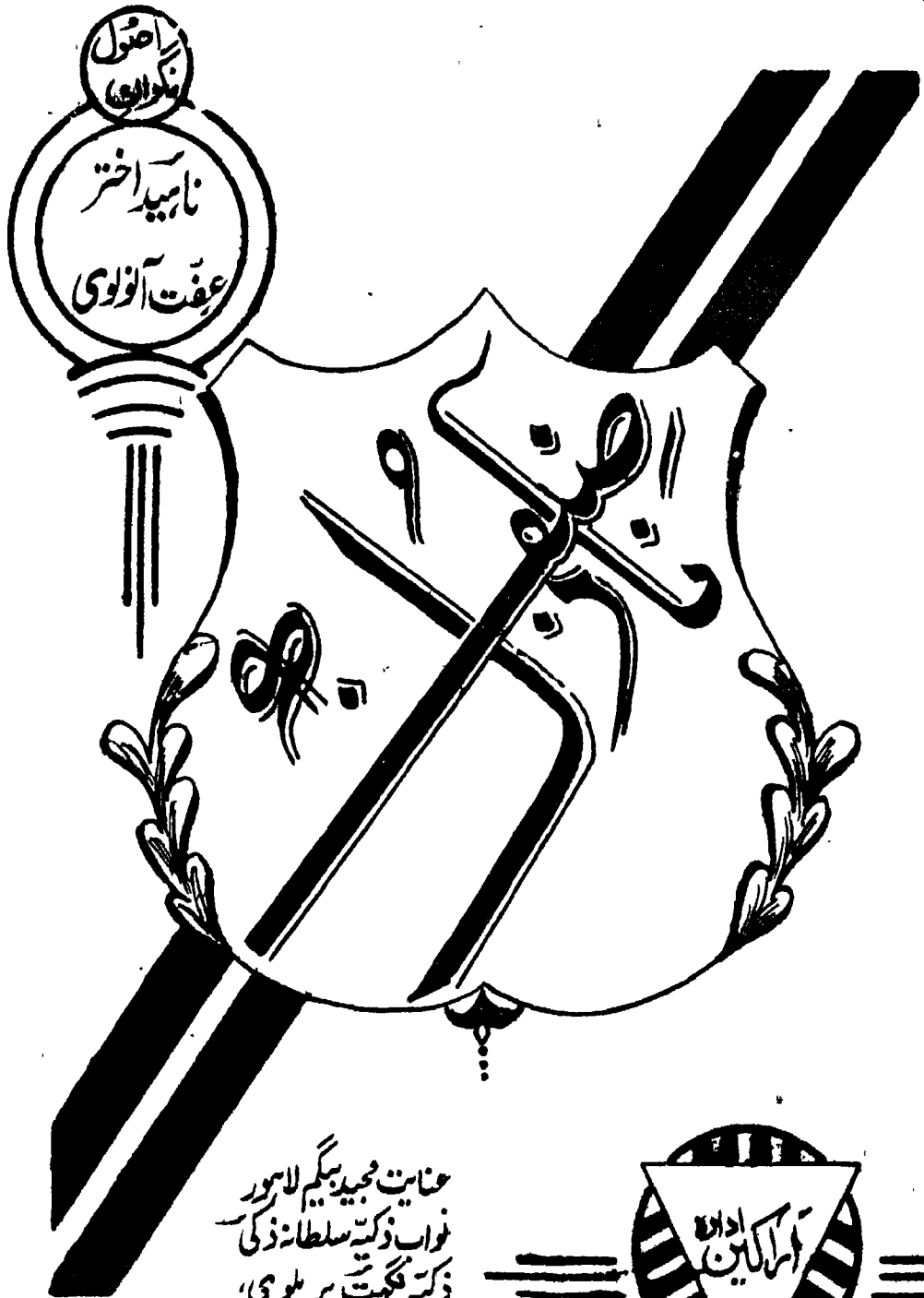
اصول نگرانی
ناہید اختر
عفت آنولوی
عنایت مجید بیگم لاہور
نواب ذکیہ سلطانہ ذکی
ذکیہ نکہت بریلوی،
سعیدہ خاتون صابری
اراکین ادارہ

پیغام طرب لائی ہیں ساون کی ہوائیں!
گھنگھور گھٹائیں!
بدمست فضائیں

یہ عالم مستی ہمہ تن بادہ پرستی!
جیسے کہ کسی مستِ جوانی کی ادائیں

یہ دامنِ گلزار کے رنگین نظارے
پھولوں کے اشارے
جگنو کے ستارے

یہ سرد ہوائیں، یہ فسوں ریز اندھیرا
امنڈی ہوئی وہ دامنِ گردوں پہ گھٹائیں!

یہ ساز پپیہے کا پرندوں کا ترانہ
مستی کا خزانہ
شوخی کا فسانہ

اور کوک سے کوئل کی بپا حشر سا دل میں
جیسے کسی بچھڑے ہوئے دلبر کی صدائیں

بل کھاتے ہوئے جوئے غزلخواں کی روانی
کوثر کی نشانی
بہتا ہوا پانی
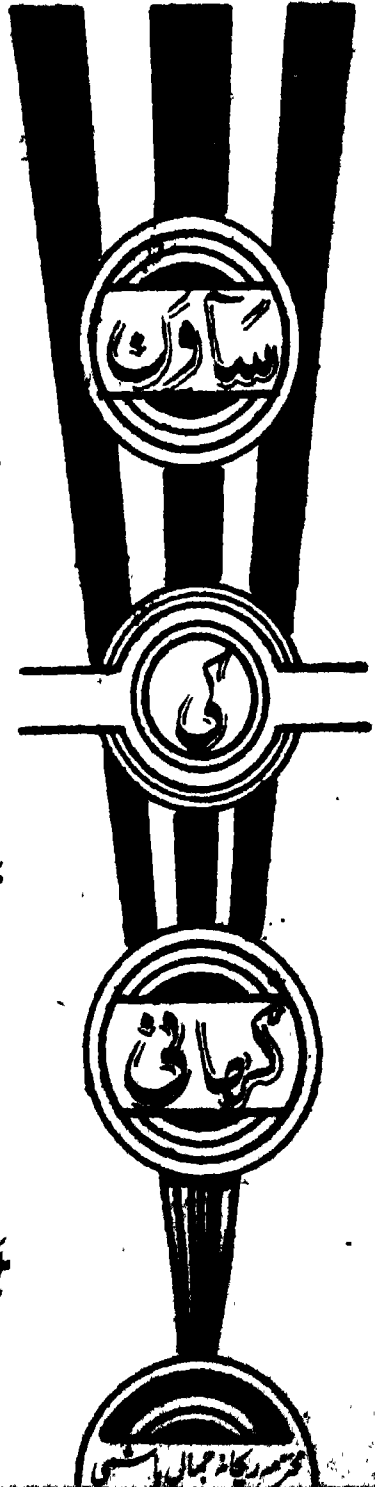
بہتے ہوئے پانی پہ پھسلتی ہوئیں کرنیں
رقصاں کسی آئینے پہ سورج کی شعاعیں

او بھولنے والے تجھے خود اپنی قسم ہے
اب آنکھ میں دم ہے
دل کشتۂ غم ہے

آ اور مجھے دامنِ الفت میں چھپا لے
کرتی ہوں ترے واسطے رو رو کے دعائیں

اک ہوک سی اٹھتی ہے مرے دل میں سکھی آج
دل غم سے ہے تاراج
ہوں لطف کی محتاج

اے کاش کہ وہ پھر نگہِ لطف سے دیکھے
کچھ کام تو آئیں مری مجبور وفائیں!

ریحانہ ابھی تک تو محبت کو چھپایا،
روٹھے کو منایا
وہ پھر بھی نہ آیا

وہ جس کی محبت پہ کبھی ناز تھا دل کو
ہیں آج مرے واسطے کیا کیا نہ جفائیں

این بولین کو انگلستان کی قلوپطرہ کہا گیا ہے اور واقعی وہ اس لقب کی بجا طور پر مستحق تھی۔ شاندار شاہانہ حسن و جمال سحر و شباب کا سرمدیں پیکر، ہنری ہشتم تاجدار انگلستان کے دل و جان کی ملکہ ...... این بولین ...
..... ہنری انگلستان پر حکومت کرتا تھا اور وہ ہنری پر ..... مگر اس پر بھی ایک شخص کی حکومت تھی۔ وہ تھا ..... لارڈ پرسی ..... اس کا جاں نثار عاشق۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مگر تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ تقدیر کا فیصلہ یہ تھا کہ شہنشاہ انگلستان کی محبوبہ اور خود لارڈ پرسی کی وفا پرست حسینہ اپنے عاشق کی عدالت میں ایک مجرم کی حیثیت سے حاضر ہو اور وہ بدنصیب عاشق اپنی خوابوں کی دیوی کے لئے .....
موت ..... جلد موت ...... دردناک موت کی سزا ..... کا ..... حکم دے ..... یہ کیونکر ہوا
اسکی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

موسم گرما کی ایک سہانی دلچسپ رات میں انگلستان
...باغ کے اندر لارڈ پرسی نے این بولین کو دیکھا۔
...وقت کارڈینل ولزلی کے اسٹاف میں ملازم تھا۔
...ڈینل کے ہمراہ شاہی محلات میں آیا جایا کرتا تھا
...ارڈینل ہنری ہشتم کی خدمت میں چلا جاتا تو پرسی
...میں ملکہ کیتھرائن آف اراگون کی سہیلیوں سے رنگ
...معروف رہتا۔ اسی طرح شاہی محلات میں ہر جگہ
...ئی تھی۔ اور چونکہ وہ ایک معزز خاندان کا فرد اور
...ارتھمبرلینڈ کا عہد نظر تھا۔ اس لئے شاہی اسٹاف

اور رائل فیملی میں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ مگر نازنینان
حرم میں ابھی تک کوئی حسینہ اس کی توجہات کو اپنی طرف
مبذول نہ کر سکی تھی۔ آخر ایک روز پرسی نے شاہی باغ کی
روش پر این بولین کو معروف خرام ناز دیکھا۔ وہ اس وقت
شیفون کا گون پہنے ہوئے تھی۔ اور اتنی حسین و خوش جمال
معلوم ہوتی تھی کہ پرسی کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل
ہو گیا۔ این بولین واقعی ملکہ حسن تھی۔ لندن کے شاہی
محلات میں کوئی نازنین بھی رعنائی و صباحت میں اسکا مقابلہ
نہ کر سکتی تھی۔ این بولین کا تعلق ملکہ کیتھرائن آف اراگون

کی مصاحبات سے تھا اور وہ ملکہ کی تمام سہیلیوں میں سب سے
زیادہ ذہین اور سب سے زیادہ باوقار تھی۔

پرسی پہلی ہی نظر میں این بولین کی جادو نگاہی کا شکار
ہوگیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ آخر حرم سرائے شاہی کی یہ غزالِ
وحشی اب تک کس طرح اس کی نگاہِ شوق کی دسترس سے
دور رہی۔ پرسی نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر پھولوں کا ایک
خوبصورت گلدستہ این بولین کی خدمت میں پیش کیا اور
ادب سے کہا کہ:۔

"ملکۂ بہار! یہ پھول آپ کے ہاتھ میں زیادہ خوشنما
معلوم ہوں گے"

زغارت چمنت بر بہار منتہا است
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

این بولین نے مسکرا کر محبت و عقیدت کا یہ لطیف
گلدستہ پرسی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور چند ہی روز کے بعد وہ
دونوں گلاب و یاسمین کے اک کنج میں اقرارِ محبت کرتے ہوئے
نظر آئے۔ پرسی کی نسبت ارل آف شریوزبری کی لڑکی سے
ٹھہر چکی تھی۔ مگر پرسی این بولین کے نشۂ محبت میں اس قدر
سرشار تھا کہ اس نے اس جلیل القدر رشتے کو ٹھکرا دیا۔

بدقسمتی سے ہنری ہشتم بھی اپنی ہوسناکیوں اور عشق
پروریوں کے لئے اسی مہ جبین دوشیزہ کو منتخب کر چکا تھا اور
جب بادشاہ کو پرسی اور این بولین کے رومانی تعلقات کا علم
ہوا تو اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہنری نے کارڈینل
ولزلے کو پوشیدہ طور پر یہ حکم دیا کہ وہ ان دونوں محبت کرنے
والوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ ولزلے نے فوراً ہی
پرسی کو اپنی ملازمت سے علیحدہ کر کے اسے این بولین سے تعلقات
منقطع کرنے کا حکم دیا۔ پرسی نے ہر چند کوشش کی کہ ولزلے
کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کرے مگر وہ نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرسی کو
تمام تعلقات قطع کرنے پڑے اور بیچاری این بولین عشق
و محبت کی پہلی منزل میں ہی بے یار و مددگار رہ گئی۔ کون
کہہ سکتا ہے کہ پرسی کی کمزوری اور پیمان شکنی کا غریب
این پر کیا اثر ہوا ہوگا۔؟ وہ شاہی حکم سے قلعہ ہیور واقع
کینٹ میں نظر بند کر دی گئی۔ اب رات دن آنسو بہانا اور
پچھلی محبت کو یاد کرنا اس کا کام تھا۔ ہنری اکثر این سے ملنے
کے لئے قلعۂ ہیور میں جایا کرتا تھا اور اسے اپنی طرف مائل
کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتا تھا۔ مدتوں تک این
بادشاہ کی دعوتِ محبت کو ٹالتی رہی، مگر تابکے....؟
اب سوائے شاہی آغوش کے ٹھکانا بھی کہاں تھا....؟

اُدھر این کو یہ معلوم ہو کر کہ پرسی نے اپنی پہلی منسوبہ
سے شادی کر لی۔ بالکل ناامیدی ہو گئی تھی۔ اور مجبوراً اسے
ہنری ہشتم کی پیش کش شباب کو منظور کرنا پڑا۔

ہنری ہشتم نے اس نوبہار ناز کو اپنے عقد میں لانے کے
لئے کچھ کم قیمت ادا نہیں کی۔ اس نے بدقسمت ملکۂ کیتھرائن
کو طلاق دے کر اپنی شبستانِ تمنا کو این بولین کے جمالِ
جہاں آرا سے منور کیا۔

کچھ عرصے کے بعد این بولین کے بطن سے انگلستان
کی اقبال مند ملکہ الزبتھ کی ولادت ہوئی۔ مگر ہنری کو اولاد
نرینہ کی تمنا تھی۔ وہ الزبتھ کی پیدائش سے خوش نہ ہوا۔
اُدھر آہستہ آہستہ ہنری کی توجہ این بولین کی طرف سے
ہٹنے لگی تھی۔ اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے نئی نئی
ترکیبیں سوچا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں بادشاہ کا تعارف
اپنے محل کی ایک نئی دوشیزہ "جین سیمور" سے ہوا اور ہنری کے
سرد جذبات میں از سر نو تلاطم پیدا ہو گیا۔

ایک روز جبکہ ہنری اپنی نئی محبوبہ کے ساتھ محل کے

بلک پوشیدہ کمرے میں داد شباب دے رہا تھا۔ غضبناک
بی خوابگاہ میں داخل ہو گئی اور ہنری کو حسین سمد کے ساتھ
ہو اختلاط دیکھ کر اس کے تن بدن میں چنگاریاں لگ گئیں
ر اس نے بُرے سخت الفاظ میں بادشاہ سے اس ناشائستگی
ا مطالبہ کیا۔ اس طرح بدنصیب ملکہ اور سنگدل بادشاہ
ے درمیان روز بروز تلخیاں اور بدمزگیاں بڑھتی گئیں۔
ان تک کہ دربار میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ اینی بولین ہنری
شتم کے خلاف ہولناک سازشیں کر رہی ہے۔ بادشاہ
یسے موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے فوراً بغاوت کے الزام
ں چار درباریوں کو قتل کرا دیا اور اینی پر سرکشی اور بدچلنی
الزام لگا کر قید سخت میں ڈال دیا۔

عاشق کے حضور میں

اس واقعہ کا دردناک ترین پہلو یہ ہے کہ غریب
ا کا مقدمہ پیش بھی ہوا تو کس کی عدالت میں ......؟
ہ پرسی ڈیوک آف نارتھمبرلینڈ کی عدالت میں۔۔ احباب
ے پا کر عدالت العالیہ کا چیف جج مقرر ہو گیا تھا۔ اس
ت اینی کے دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔۔۔؟ اس
یان کرنا مشکل ہے۔ بقول غالب مرحوم سہ

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اینی کو پابہ زنجیر دیکھ کر لارڈ پرسی کے محبت آشنا
ل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ وہی حسینہ تھی جس کے حضور
بھی خود پرسی کا سر نیاز خم تھا۔ مگر وہ شاہی عتاب سے
اور اپنی بے گناہ محبوبہ کو موت کے پنجے سے نہ بچا سکا
خود اینی نے بھی غرور محبت میں پرسی سے رحم و مروت
کی اپیل نہ کی۔ اور اپنے بچھڑے ہوئے عاشق کے منہ
سے سزائے موت کے احکام ہنسی خوشی سنے۔ شاید وہ
اس موت پر راضی تھی۔

اینی کے بعد لارڈ پرسی بھی زیادہ عرصے تک نہ جی سکا
اور چند روز کے بعد اسی غم میں گھل گھل کر مر گیا۔ یہ تھا ان
دو عجیب و غریب محبت کرنے والوں کا دردناک انجام

عشق از ایں بسیار کرد است و کند

۱۔ محبت کی ابتدا خود خدا کی طرف سے ہوئی
۲۔ سچی محبت وہ ہے جو دونوں جانب سے ہو
۳۔ درد محبت میں وہ لذت ہے جو کسی راحت میں نہیں
۴۔ محبت کی راہیں بہت کٹھن ہوتی ہیں
۵۔ محبت نہیں کی جاتی، بلکہ خود ہو جاتی ہے
۶۔ محبت پوشیدہ نہیں رہ سکتی
۷۔ محبت کو فنا نہیں
۸۔ محبت بغیر انسان کی زندگی بے کیف ہے۔
۹۔ آتش محبت سینے کو اندر ہی اندر جلا دیتی ہے۔
۱۰۔ محبت میں رشک ضروری ہے
۱۱۔ محبت زندگی کا ساز ہے۔
۱۲۔ محبت فتح کے لئے بے پناہ ہتھیار ہے۔
۱۳۔ محبت کا جادو ضرور اثر مند ہوتا ہے
۱۴۔ محبت کا جذبہ ہر ذی روح رکھتا ہے۔

آؤ سہیلی

آؤ سہیلی شوق میں چھیڑیں　بربطِ دل کے تار ـــــ سہیلی
ـــــ　کیسا حسینِ گلزار ـــــ
عشق ہے بادہ، عشق ہے ساقی　عشق ہی خود میخوار ـــــ سہیلی
ـــــ　آؤ سہیلی! ـــــ
مست گھٹائیں جھوم کے اٹھیں　آئی بھری برسات ـــــ سہیلی
ـــــ　کیسی یہ رنگیں رات ـــــ
مست ہوا باغوں میں پپیہا　چھوڑ کے سب سنسار ـــــ سہیلی
ـــــ　آؤ سہیلی! ـــــ
سرد ہوائیں مست فضائیں　رنگِ شفق گلنار ـــــ سہیلی
ـــــ　سارا جہاں سرشار ـــــ
کس کو سنائیں گیت ذکیہؔ　کون ہے من کا میت ـــــ سہیلی
ـــــ　کسکو سنائیں گیت ـــــ
سازِ محبت، تارِ شکستہ!　نغمۂ دل بیکار ـــــ سہیلی
ـــــ　آؤ سہیلی! ـــــ

نواب ذکیہ سلطانہ ذکی مراد آبادی

الصدا اے ہمنشینو! ابتدائے عشق ہے
یوسفانِ وہم گرفتارِ بلا ہونے لگے

پھر وہی باغ تھا، وہی روش تھی اور ایوب وہی سرخ گلاب ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا، فضا میں کیف تھا، بادِ نسیم کے جھونکے خوشگوار تھے کائنات ایک حسین نغمہ بن کر ایوب کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ بہت دور کوئی سریلی اور سامعہ نواز آواز میں گا رہا تھا۔

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو
جب آدھی رات کو بزمِ جہاں خاموش ہوتی ہے
حیاتِ عالمِ ایجاد جب بے ہوش ہوتی ہے
دلِ مہجور جب کہتا ہے افسانہ محبت کا
فلک پر بزمِ انجم جب سراپا گوش ہوتی ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو
میں جب دنیا و مافیہا سے غافل ہو کے سوتا ہوں
اور احساسات کی ہر قید سے آزاد ہوتا ہوں
جہانِ خواب میں تصویر پھرتی ہے محبت کی
کلیجہ تھام کر اٹھ بیٹھتا ہوں خوب روتا ہوں
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو
سحر کے جھٹ پٹے میں عابد و معبود ملتے ہیں
بہت بے پردہ ہو کر ساجد و مسجود ملتے ہیں
مرا ذوقِ پرستش خواب سے بیدار ہوتا ہے
نیاز و ناز سے جب حامد و محمود ملتے ہیں
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

ایوب محسوس کر رہا تھا کہ گویا یہ اسی کے دل کی آواز ہے۔ نغمے میں روح کی ہر ایک تڑپ کو جمع کر دیا گیا تھا ہر ایک لفظ سے جذبات کا ایک سیلاب جاری تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا گویا دوسرا نہیں بلکہ ایوب کے دل کے تاروں پر کوئی گا رہا ہے اور ایوب کیف و مستی کی ایک نئی دنیا میں پہونچ گیا ہے۔ گانا ختم ہو چکا تھا۔

ایوب اپنے تخیلات کی محویت سے اس وقت ہوشیار ہوا۔ جبکہ اسے اپنے قریب کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ ایوب نے نظر اُٹھا کر آنے والے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں وہ ایک حسین نوخیز دوشیزہ تھی۔ جس کی نگاہوں میں سیکڑوں بجلیاں، جس کے لبوں میں ہزار ہا سحر سامانیاں پنہاں تھیں، جو مجسم حسن تھی۔ یا قدرت کی صنعت کا ایک حسین ترین مکمل شاہکار۔ جس پر شباب کی ہزاروں رعنائیاں فدا اور عشوہ طرازیاں نثار ہو رہی تھیں۔ وہ ایوب سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک چنبیلی کے پودے کے پاس درخت کی ٹہنی پکڑے کھڑی تھی۔ اس کی نظریں ایوب کے چہرے پر تھیں اور ایوب، وہ اشتیاق مجسم بنکر اپنی تشنہ کام نگاہوں

کو حسینہ کے بے پناہ حسن سے سیراب کر رہا تھا۔ دونوں طرف
سکوت تھا، گویا دونوں بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ کئی منٹ تک
یہ محویت طاری رہی آخر حسینہ نے اپنے قدموں کو جنبش دی۔
اور ایک طرف کو چلنے لگی۔ ایوب کے خیال میں اب صبر کا موقعہ
نہ تھا وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور چاہا کہ حسینہ کو پکڑے لیکن وہ
تیزی سے چل کر کسی طرف غائب ہو چکی تھی۔ ایوب کے دل پر
جیسے ایک بجلی گر گئی وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سرخ
گلاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔ متجسس
نظریں ہر طرف سے ناکام لوٹیں۔ پر اسرار حسینہ نظر سے غائب
تھی۔ ایوب کی آنکھ کھل گئی۔ وہ عجیب اُلجھن میں گرفتار
ہو گیا۔ تمام دن ایوب اپنے حسین خواب کو یاد کر کے لطف اندوز
ہوتا رہا۔ اور باوجود ہزار کوششوں کے وہ اس خواب کی تعبیر
کو نہ پا سکا۔ حسینہ کے نقش و نگار اس کی نظر میں اس طرح
سما گئے تھے کہ جیسے وہ اس کے سامنے کھڑی ہے اس نے پھر
دل میں سوچا کہیں یہ حسینہ ..... وہی نہ ہو۔

ایک سے دو، دو سے چار، آٹھ دن گذر گئے، مگر ایوب
حسینہ کی خیالی تصویر کو دل سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
وقت کے ساتھ اس کی اُلجھن وحشت اور تجسس بڑھتا گیا آخر
ایوب نے تجویز کیا کہ جس طرح بنے جائز اور ناجائز طریقے پر
زہرہ کو دیکھنا چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ میری محبوبۂ خواب
کی طرح حسین ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میں اس کی تمام خامیوں اور
کمزوریوں کو نظر انداز کر کے صرف اس کی صورت کی پرستش
کرتا رہوں گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ..... ؟"

ایوب مردانے مکان میں اپنے کمرے میں بیٹھا تخیلات
کے بحر بیکراں میں غوطہ زن تھا۔ مندرجہ بالا خیالات اس کو
دل و دماغ پر اس طرح حاوی تھے کہ وہ گرد و پیش سے مطلق بے خبر
تھا۔ اس کا عزیز ترین دوست قاسم کمرے میں داخل ہوا اور
ایوب کو خبر بھی نہ ہوئی۔ قاسم نے ایوب کو اس طرح محو دیکھ کر
کہا:۔

"یہ فلسفیوں کی طرح کیا سوچ رہے ہو؟ بھلے مانس!"

"اُوہ تم ہو قاسم!" ایوب نے خیالات سے چونک
کر کہا" نہ پوچھو دوست عجب آفت میں مبتلا ہو گیا ہوں"

"کیوں خیریت تو ہے؟" قاسم نے ایوب کے پہلو
میں بیٹھتے ہوئے پوچھا" خدا خیر ہی کرے جناب کی حالت بھی
کچھ دگرگوں نظر آتی ہے"

ایوب نے غم گساری کے یہ الفاظ سنکر محسوس کیا کہ
اب صبر و ضبط کا موقعہ نہیں۔ وہ سرد آہ بھر کر کہنے لگا
"وجہ کچھ بھی نہیں اور جو ایک معمولی سا واقعہ ہے بھی تو اتنا
مضحکہ خیز ہے کہ تم مجھے بیوقوف اور دیوانہ کہنے پر مجبور ہو جاؤ گے
سچ عرض کرتا ہوں کہ کچھ زبان سے نکالتے ہوئے بھی شرم آتی
ہے۔ کوئی ذی عقل بھی اس بے بنیاد داستان کو اہمیت
نہیں دے سکتا، مگر میں مجبور ہوں دل کے ہاتھوں" قاسم
کی خواہش اور پھر مزید اصرار پر ایوب نے اپنا پہلا خواب۔
پھر اسی روز سے شادی کے لئے سلسلہ جنبانی شروع ہونا۔
نکاح ہونا، اور پھر دوسرا خواب۔ تمام واقعات بالتفصیل
سنا دئے۔ قاسم ہنسا اور بیساختہ کہنے لگا۔

"تو یوں کہو کہ ؎

دھرے گئے دل خانہ خراب کے بدلے

"جو کچھ سمجھو" ایوب بولا۔ مگر اب کوئی صورت ضرور
ایسی نکالو جس سے میں زہرہ کو ایک نظر دیکھ لوں"

قاسم نے کہا" مگر عقلمند اتنا تو سوچو کہ دیکھنے سے
فائدہ کیا ہوگا۔ فرض کرو کہ وہ تمہاری محبوبۂ خواب ہی کی ہم
شکل ہو تو کیا تم فوراً ہی اُسے رخصت کرا لاؤ گے ؟"

"ارے نہیں" ایوب نے جواب دیا" یوں نہیں بلکہ

میرا مقصد یہ ہے کہ اگر زہرہ ہی مجھے خواب میں نظر آئی ہے تو اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوکر اشتیاق سے وقت کا انتظار کروں گا اور جو ایسا نہیں ہے تو . . . . پھر صبر کرنا پڑیگا، اس کے ملنے کی اور کوئی تدبیر بھی تو نہیں ہے۔" . . . . "پھر کیا کیا جائے؟" قاسم نے پوچھا۔

"ایک تجویز سمجھ میں آئی ہے۔" ایوب کہنے لگا "تمہاری بیوی تو ہیں ہی - بہنیں بھی ہیں شاید؟ بس ایک دعوت نامہ فوراً زہرہ کے نام روانہ کرد - انسپکٹر وصی سے مل کر میں کہہ دونگا کہ جناب مسز قاسم کو ملنے کا بہت اشتیاق ہے، آپ ضرور مسز قاسم کی دعوت قبول کرادیں۔ جب زہرہ تمہارے یہاں آئے گی، میں اسے ضرور کہیں سے چھپ کر دیکھ لونگا۔"

"تجویز تو معقول ہے" قاسم نے کہا "خدا کرے وہ قبول کرلیں دعوت۔"

ایوب بولا "کرنا ہی پڑیگی میرا کہنا بھی تو کوئی چیز ہے آخر بھی تو میری منکوحہ بیوی ہے نا - میرا کہنا ماننا ہی ہوگا۔"

اسی وقت ایک دن مقرر کرکے زہرہ یا مسز ایوب کے نام دعوت نامہ تحریر کیا گیا۔

دعوت نامہ بھیجدیا گیا اور ایوب بھی جاکر انسپکٹر وصی سے کہہ آئے کہ مسز قاسم کی دعوت نامنظور نہ ہو اور لطف یہ کہ جس دن دعوت ہونی تھی - اسی روز ایوب اور ہم معہ چند دوستوں کے شکار پر جانے والے تھے - ایوب والدہ دعوت کا حال سنکر خفا ہوئیں۔

"بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے - کنوارہ ناطہ اور دعوتیں بھی ہیں - ایوب نے والدہ کی اس تقریر کا چند ہی جملوں خاتمہ کردیا۔" جی ہاں یہی طریقے ہیں، آج کل یہی تہذیب اور آپ کو منظور نہیں کہ آپ کی بہو اپنی پرانی روایات کو چھوڑے تو میرا دور سے سلام ہے - دیکھئے طلاق - مجھے تو بہر حال بیوی - مہذب اور سوسائٹی یافتہ چاہئے" ایوب کی والدہ اس کی گستاخی پر ناخوش ہوئیں اور ساتھ ہی خائف بھی "کتنا نالائق بے ادب لڑکا ہے طلاق کا نام لیتے شرم نہیں آتی۔"

اِدھر انسپکٹر وصی اور اُن کی بیوی نے تھوڑی سی رد و کد کے بعد مسز قاسم کی دعوت یہ سوچ کر منظور کرلی کہ آجکل کا فیشن بھی ہے لڑکے اپٹوڈیٹ بیوی چاہتے ہیں - پھر وہاں دوستوں کی بیویاں تو ہونگی - ساس نند تو کوئی ہوگی نہیں آخر حرج ہی کیا ہے؟" اب زہرہ کی باری تھی - اس کی ماں نے دعوت نامہ دکھاتے ہوئے کہا "بیٹی! یہ قاسم تمہارے میاں کے عزیز دوست ہیں - ایوب کی خواہش ہے کہ جسطرح میں اور قاسم یکجان و دو قالب دوست ہیں - ہم دونوں کی بیویاں بھی اسی خلوص سے ملیں۔" زہرہ نے ماں کی خواہش شوہر کا فرمان سنکر تیوری پر شکن ڈالے اور کہا "آخر یہ قاسم ہیں کون؟ حضرت معلوم تو ہو۔"

"ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہیں کوئی افیسر ماسٹر نہیں تو نہیں مگر اچھے آدمی ہیں۔" ماں نے بتایا۔

"وہ تو نہیں؟" زہرہ نے پوچھا - "بتول کے بھائی"

"ہاں، ہاں وہی" ماں نے کہا - زہرہ کے جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی بگڑ کر بولی - "خدا غارت کرے دنیا بھر کے لفنگے، بدمعاش دوست ہیں۔" (باقی آئندہ)

براہ کرم طویل افسانے اور مضامین ارسال فرماکر اشاعت کے منتظر نہ رہئے کیونکہ رسالہ کا دامن محدود ہے اس لئے آپکی غیر محدود نوازشوں کا متحمل نہیں ہوسکتا - اگر آپ طبع زاد افسانوں کی بجائے غیر زبانوں کے تراجم بھیجیں گے تو شکریہ کیساتھ قبول ہونگے۔

کیل
چھائیاں
بدصورتی
مارول سنو کریم
یہ آپ کو دودھ سا سفید گلاب سا حسین اور مخمل سا ملایم چہرہ بخشے گی ۔
مارول سنو کریم کے تین مشہور عمل ہیں
(۱) یہ خوبصورتی پیدا کرتی ہے (۲) خوبصورتی کو بڑھاتی ہے (۳) اور خوبصورتی کو ہمیشہ کیلئے برقرار رکھتی ہے
یہ جلد کی خرابیاں، مہاسے، داغ، بھینسی، چھائیاں دور کرنے میں یکتا جادو کا اثر رکھتی ہے۔ ہمیشہ استعمال کیجئے۔ اپنے منہ پر ضعیفی کے آثار نہ پیدا ہونے دیجئے، اپنے کو ہمیشہ جوان اور خوبصورت بنائے رہئے۔
شاندار تعریفی خط ملاحظہ فرمائیے۔ جس کی اصلی نقل ہمارے دفتر میں موجود ہے
ڈاکٹر ایس۔ڈی صاحب ایم۔بی۔بی۔ایس۔ڈی۔ایل او۔ڈی۔او۔ایم۔ایس لندن تحریر فرماتے ہیں
میں نے مارول سنو کو جلد کی خرابیوں کیلئے مفید پایا۔
مارول مینوفیکچرنگ کمپنی برٹش ایمپائر
تقسیم کنندگان
سیوکونجی دوکان رجسٹرڈ میڈلسٹ تاجران عطر امرتسر سہارنپور مرادآباد
نوٹ:۔ ہمارے یہاں خونی، بادی اور ہر قسم کی بواسیر کیلئے دوا مفت تقسیم کی جاتی ہے۔ جواب کیلئے ڈاک ٹکٹ آنا ضروری ہے

راحت منزل شملہ

پیاری فیروزہ !

اُف میں کس قدر شرمسار ہوں کہ تمہارے پے درپے تقاضوں پر بھی جواب نہ دے سکی اور پھر یہ حقیقت بھی نہایت تکلیف دہ ہے کہ تم نے میری اس خاموشی کو میری عشرت پسندی پر محمول کیا اور یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ میں اُن کے "ساتھ راز و نیاز میں منہمک ہو چکی ہوں . . . . . . فیروزہ ! میں خاموشی کی گنہگار تو ضرور تھی لیکن ان وجوہ سے بہت دور، جو تم نے خود بخود فرض کرلئے ہیں تمہیں کیا معلوم کہ میری کشتیِ حیات بحرِ زندگی کی طوفانی لہروں میں کس بری طرح گھری ہوئی ہے ؛ اور میری روح کس عذاب میں مبتلا ہے ؟ . . . . مگر میں، نہیں الزام نہیں دیتی کیونکہ تم تو اس معاملہ میں قطعی بے قصور ہو۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میرے گذشتہ مکتوب کی اختتامی سطور میں رشیدہ کی فراری کا ذکر کیا گیا تھا جس سے میری سادگی نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ایک بار پھر میری زندگی میں طوفان پیدا ہو جائیگا - اور یہ شاید اسی کا نتیجہ ہے جو تم نے بھی اس مفروضہ سکون آمیزی کی آڑ لے کر اس طرح پر میری بے ڈالی ۔ قصوروار تو میں ہی ہوں لیکن تمہاری اِس غلطی کا ازالہ بھی ضروری ہے ۔

رشیدہ جب اپنے والدین کے ہاں گئی تو مجھے مسرت ضرور ہوئی اور کیوں نہ ہوتی جبکہ میری راہ جدائی میں سے دشمن کا منہ کالا ہو گیا۔ اور اس سے مجھے یہ امید ہو گئی کہ پھر ایکبار اپنی قوت جذب و ایثار سے کام لے کر میں اپنے سرتاج کو رام کرسکوں گی - اسی لئے تم سے بھی اشارۃً اس کا تذکرہ کردیا تھا- مگر فیروزہ ! جب انسان کے برے دن آتے ہیں تو ہر ایک کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے ۔ اور ہر ایک تدبیر بربادی میں منتقل ہوجاتی ہے . . . . . یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی جان توڑ کوششوں کو اُن کی " التفات کے حصول کے لئے صرف کردیا - اور اُن کی خدمت میں دن رات ایک کردیا -
مگر وہاں تو معاملہ ہی اور تھا - جادو اپنا پورا اثر کر چکا تھا اور وہ اس کے تاثرات کے پورے پورے غلام بن چکے تھے پھر بھلا میری کوششوں کی کیا حقیقت تھی جو اُن پر اثرانداز ہوتیں رشیدہ کیا گئی کہ اُن کا عقل و ہوش، دل و دماغ سکون و اطمینان سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی اور ان تمام کے بدلے ایک اپنی یاد اُن کے پاس چھوڑ گئی ۔غم و غصے کے عالم میں جب رشیدہ کی بلا اطلاع روانگی کی خبر انھیں ملی تھی تو وہ یہ فیصلہ کر بیٹھے تھے کہ اب کبھی اسے نہیں بلائینگے جب تک وہ خود حاضر ہو کر اس حرکت کی معافی نہ مانگ لے اس لئے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے فیصلے پر نہایت ہی پابندی

سے قائم رہے مگر دل کے ہاتھوں بہت تنگ ہو گئے تھے جو فرقتِ
رشیدہ کی یاد میں خون کے آنسو روتا رہتا تھا اور انھیں سخت
بیقرار رکھتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کا
غم غلط کر سکوں۔ اور ان کے رنج کو راحت میں بدل کر اپنی
عاقبت کے لئے زادِ راہ میں کچھ اضافہ کر لوں مگر مجھے کامیابی
نہ ہو سکی اور ان کی پریشانی دن بدن بڑھتی ہی رہی۔

اللہ رے عشق کی جنوں سامانیاں! کہ ان کی حالت
روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ . . . . کھانا پینا کم ہو گیا۔ دل و
دماغ میں فتور سا آتا ہوا معلوم ہوا۔ طبیعت کی چستی مفقود
ہو گئی۔ چہرے کا رنگ اڑنے لگا۔ صحت کا تنزل شروع ہو گیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھا خاصہ شکیل و جمیل انسان دیرینہ
مریض معلوم ہونے لگا صرف ایک خیال، ایک تصور اور ایک
ہی رٹ تھی جو ہر وقت انھیں لگی رہتی تھی اور وہ تھی رشیدہ!

فیروزہ! کیا تم میری پریشانی کا اندازہ لگا سکتی ہو؟
کیا تم میری دلی کیفیات کو سمجھ سکتی ہو، کیا تم میرے غم والم کی
گہرائیوں تک پہونچ سکتی ہو؟ وہ پریشانیاں وہ کیفیات
وہ غم کی گہرائیاں نہیں سمجھ سکتیں کیونکہ صرف ایک درد آشنا
دل ہی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔ اور پھر تم تو بفضل تعالیٰ دنیا
کی تمام امکانی مسرتوں کے گہوارے میں کھیلتی ہو اور زندگی
کی تلخیوں سے بے نیاز ہو کر دن گذار رہی ہو۔

جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گئی تو آخر مجبور ہو کر
اور اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے مجھے وہ قدم اٹھانا
پڑا، جس کا اب مجھے افسوس بھی ہے۔ کیونکہ میرے اس جائز
اور مناسب اقدام نے آخر کار مجھے ہی بدنام کر دیا۔ یہ کیوں
اور کس طرح ہوا، اس کا بیان بہت طولانی ہے، مگر میں نے
وہی کیا جو کہ ایسی صورت میں مجھے کرنا چاہئے تھا۔ . . دنیا
ہمیشہ سے بات کا بتنگڑ بناتی آئی ہے، پھر اگر میرے ساتھ بھی
یہی ہوا تو اس کا شکوہ ہی فضول ہے

بہر حال میں نے اپنے محترم خسر صاحب کو اُن کے
فرزند ارجمند کی اس حالت اور اس کی نزاکت کی اطلاع کر دی
اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ جلد از جلد آکر وہ اُن کو سنبھالنے کی
کوشش کریں۔ ورنہ خدانخواستہ اُن کے دشمنوں کی جان
خطرے میں تھی۔

یہ سنتے ہی وہ بھاگے ہوئے چلے آئے اور آ کر بیٹے
سے پرسشِ حال کرنے لگے۔ بہت کوشش کی ہر طرح سے
اپنی بزرگی اور پدرانہ شفقت کا سکہ بٹھانا چاہا۔ مگر وہاں تو
جیسے زبان پر مہر خموشی ثبت ہو چکی تھی کہ ہر بات کے جواب میں
صرف ایک لفظ ہی دہراتے رہے۔ اور محض "ہوں، ہوں"
کرتے رہے۔ اب یہ سننے والے کی مرضی تھی کہ وہ جو چاہے
مطلب اخذ کرے۔ جب اُن کی تمام کوششیں بیکار
ثابت ہوئیں اور بیٹے نے کسی بات کا خاطر خواہ جواب نہ دیا
تو بہت سٹ پٹائے۔ اور پھر گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ . اُن
کی مجنونانہ حالت کا گویا یقین ہو چکا تھا۔ باپ کی محبت نے
زور کیا، خون جوش میں آیا۔ بیٹے کی تباہی اور بربادی کا ہولناک
تصور ان کی جہاندیدہ نظروں میں گھومنے لگا۔ اور وہ اس
کی مدافعت کی تدابیر پر غور کرنے لگے۔ . . . . اور کیوں نہ
کرتے آخر باپ کی محبت بھی تو کوئی چیز ہے۔

کاش اس وقت میرے ماں باپ بھی حیات ہوتے تو
وہ بھی میری مصیبت کو دیکھ کر اس کے تدارک کی کوشش
ضرور کرتے اُن کا خون بھی کھولنے لگتا، اُن کے احساس
کو بھی ٹھیس لگتی اور وہ بھی میری مدد کو آ پہونچتے اور سچ تو
یہ ہے کہ اُن کی موجودگی میں تو میرے لئے اس موجودہ مصیبت
کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ یہ تو سب کچھ جب ہی ہوا جب کہ
اُن کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ دنیا سے روٹھ کر روپوش

ہو گئے - آہ فیروزہ ! . . . ہم سے زیادہ بدقسمت بھی کون ہو سکتا ہے کہ والدہ کا سایہ تو عہد طفلی میں ہی سر سے اٹھ گیا اور ہم یہ بھی نہ جان سکے کہ ماں کی مامتا کیا اور کیسی ہوتی ہے اور والدہ بزرگوار نے اس مصیبت کے وقت میں داغ مفارقت دیا۔ کہ ہم بے یار و مددگار، دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے واسطے تنہا رہ گئے . . . ذرا اندازہ تو کرو ہماری اس حسرت و آرزو کا جو اکثر ہمارے دلوں میں ایک ہنگامہ ایک طوفان، ایک محشر بپا کر دیتی ہے کہ کاش ہم بھی اپنے ماں باپ کی نسبت ناز پروری اور ناز برداری کا لطف اٹھا سکتے . . . مگر قدرت کو تو یہ منظور ہی نہ تھا ورنہ اس کے مقررہ نظام میں فرق آ جاتا۔

ہاں . . . تو میں کہہ رہی تھی کہ "اُن کے" والد محترم نے جب اپنے صاحبزادے کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی اور اُدھر سے سوائے خاموشی کے دوسرا جواب نہ پایا، تو باپ کا خون جوش میں آیا - مدتوں کی خوابیدہ محبت پھر بیدار ہوئی دل میں اضطراب اور بیقراری پیدا ہو گئی اور سوائے اس خیال کے کہ کس طرح اپنے فرزند کی مشکل کو آسان کریں اور تمام خیالات اُن کے دل سے محو ہو گئے . . . یہی وہ الفاظ ہیں جو انہوں نے خود بیان فرمائے تھے - اس وقت جبکہ اُن سے بعد میں اس کے متعلق باز پرس کی گئی۔

وہ گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور صرف یہ کہا کہ زہرہ ہم ابھی جاتے ہیں، تم گھبرانا نہیں سب انتظام ہو جائے گا۔ ہم تمہاری پریشانی کو سمجھتے ہیں اور جلد ہی اس کا تدارک کر دیں گے اور قبل ازیں کہ میں انھیں کوئی جواب دے سکوں وہ دروازے سے باہر جا چکے تھے

ابھی شب کوئی آٹھ بجے کا وقت ہوگا، سردی کا موسم تھا اور میں بچوں کو سلانے میں مصروف تھی۔ "وہ" بھی خاموشی سے اپنے بستر پر دراز تھے اور سو جانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یکایک دروازے پر دستک ہوئی . اور پھر ایک آواز آئی "دروازہ کھولو" آواز کو پہچان کر میں دروازے کی طرف بڑھی اور جب اس کو کھول کر علیحدہ ہوئی تو پھر ایک مغرور و فاتح قسم کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور دل و جگر کو چیرتی ہوئی پار ہو گئی - زہرہ ! ہم رشیدہ کو لے آئے ہیں . . . اور پھر رشیدہ کو مکان میں داخل کر کے وہ خود اُلٹے پاؤں واپس ہو گئے اور اس طرح انھوں نے وہ قانون توڑ ڈالا جو خود انہوں نے ہی قائم کیا تھا - سچ ہے کہ ہر ایک قانون توڑنے کے لئے ہی بنایا جاتا ہے - یہ ہے بندروں کی پنچایت کا فیصلہ اور اس کا انجام کیونکہ وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا کام نکل چکا تھا اب انجام سے کیا واسطہ . . . مگر میری مصیبتیں پھر واپس آ چکی ہیں اور میں پھر ان میں گھر گئی ہوں دعا کرنا فیروزہ ! کہ میں اس امتحان میں بھی کامیاب رہوں۔

والسلام

حسرت نصیب زہرہ

محترمہ کے ایس بانو صاحبہ طلعت

ہر سانس کو مستی کا اک فسانہ بنادے
آ اور ہمہ تن بادۂ و پیمانہ بنادے
اے سوز تخیل، مجھے پروانہ بنادے
اُڑتے ہوئے شعلوں کا اک افسانہ بنادے
جب لطف ہے اے ذوق تمنائے تجلی!
ہر شے کو جمالِ رخ جانانہ بنادے
اے چشم تمنا میری تخئیلِ نظر کو
احساس کی دنیا سے بھی بیگانہ بنادے
تکمیل غمِ عشق کی جب سمجھوں کہ اے دل!
ہر تارِ نفس حسن کا افسانہ بنادے
دیوانہ بنانے کو بنادے مجھے لیکن،
تجھ سے بھی کہیں عشق نہ بیگانہ بنادے
ڈرتی ہوں محبت کے کرشمے سے میں طلعت
اس پیکر ہستی کو تماشا نہ بنادے

محترمہ عفت صاحبہ آنولوی

نظر میں جلوہ فگن جب کسی کا نور ہوتا ہے
بیاباں کا ہر اک ذرہ چراغ طور ہوتا ہے
الٰہی کونسی دنیا ہے وہ تیری خدائی میں
جہاں انساں ہجوم درد سے مسرور ہوتا ہے
میں وہ حسرت نصیب شوق ہوں دنیائے فانی میں
کہ زہر غم مجھے خود بادۂ انگور ہوتا ہے
نہ پائی منزل مقصد کسی نے سعیٔ پیہم سے
کوئی ناکام رہتا ہے کوئی مجبور ہوتا ہے
خدا جانے یہ کس کا جلوہ بیتاب ہے یارب!
کہ دل پر داغ بنتا ہے نظر میں نور ہوتا ہے
نشانِ عشرتِ فانی کی بس اتنی حقیقت ہے
میں جتنا پاس جاتا ہوں وہ اتنا دور ہوتا ہے
خدا شاہد کہ اس پر ناز کرتی ہے وفا عفت
وہ دل جو داغ ہائے ہجر سے معمور ہوتا ہے

"تم کچھ بتلاؤ گے بھی کہ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے ؟"
نسیم جمال نے جھجک کر کہا

"تم میرا ارادہ پوچھتی ہو ؟ ارادہ کیا ہی کہ تم ۔ ۔ ۔ میں تم سے ہرگز ، ہرگز شادی نہیں کر سکتا"

"اُونہہ!" نسیم نے ایک لمبا سانس لیا "ٹھیک ہو اس بات کا مجھے شروع ہی سے اندیشہ تھا ، مگر خدا بھلا کرے اس امید کا کہ اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا" اس کی کٹورا سی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے

"میں مجبور ہوں ۔ ۔ ۔ سخت مجبور ہوں ۔ ۔ ۔ اور صاف صاف کہتا ہوں کہ میں تم کو دھوکا دینا پسند نہیں کرتا اس لئے آج تم سے سب کچھ کہنے کے لئے آیا ہوں ۔

"اچھی بات ہے" نسیم نے کہا اور گہرا سانس لیا جس میں ہمت ، عزم اور علو خیالی پائی جا رہی تھی ۔ پیشانی پر شکن تھی ۔ مگر آنکھوں کا سکون اور ہونٹوں کا بھنچنا اور نتھنوں کے ابھار سے محسوس ہو رہا تھا کہ حسن و وقار کا کوئی مجسمہ ہے سنگِ مرمر کا ۔

"تم نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی ہے کہ خدانخواستہ تمہیں سوسائٹی میں شرمندہ ہونا پڑے ۔ رضوانی خاموشی سے نسیم کو تکنے لگا ۔ نسیم نے جیسے جملے کو سنا ہی نہیں خاموش رہی ۔ در و دیوار خاموش تھے ، ریشمی پردے خاموش تھے ۔

غرض کمرے کی پوری فضا خاموش تھی ۔ صرف نسیم و رضوانی کے دلوں کی طرح گلدان پر رکھا ہوا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا

"میں اندر آ سکتا ہوں سرکار! نسیم گویا سوتے سے چونک پڑی"

"کون؟ اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا اور ریشمی رومال سے جلدی جلدی آنسو صاف کئے

"میں" بدلو ! خادم نے جواب دیا ۔

"اوہ ! تم بدلو ، کہو کیا کام ہے ؟"

"بڑے حضور آپکو طلب فرما رہے ہیں"

"کہہ دو میں ابھی آئی"

"تو خدا حافظ و ناصر ہو آپ کا" نسیم نے کھڑے ہو کر طنز آمیز تپاک سے رضوانی کو اُٹھنے پر مجبور کیا

"تو ایسا ہی چلا جاؤں ؟ رضوانی نے استفسار کیا

"پھر کیا چاہتے ہو تم ۔ ۔ ۔ ۔ میں اب تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ فریب کار ہستی ! تمہیں فقط دوسروں کے جذبات سے کھیلنا آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خیر خدا حافظ !

"لیکن میں جانے نہ دونگا ۔ رحم کرو نسیم" رضوانی نے نسیم کے راستہ میں اپنے دونوں آہنی بازو پھیلا دئے ۔

"اب تم جاؤ ، بڑی پُر رعب آواز سے نسیم نے رضوانی کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے حکم دیا ۔

"اچھا!" کسی قدر زور سے رضوانی نے کہا اور بے انتہا مرعوب ہو کر لوٹ گیا۔ نسیم تھوڑی دیر، اُسے دیکھتی رہی اور جب وہ چلا گیا تو بیساختہ روتے ہوئے کوچ پر گر پڑی۔ . . . . دفعتہً چونک کر آنسو خشک کئے اور آئینہ میں بال سنوارے۔

میں اس لئے آیا ہوں نسیم بیٹا! وہ تمہاری سہیلی ہے نا نجمہ، اس سے رضوانی کی شادی کرا دو، وہ لڑکی مجھے بیحد پسند ہے۔ رضوانی کے والد نے نسیم کے کمرے میں کوچ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

نسیم نے گھبرا کر پوچھا اور گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے ہنس پڑی

"ہاں ہاں نجمہ ہی سے۔ میرا خیال ہے" بڑے میاں نے عینک درست کی" میرا خیال ہے کہ نجمہ سے زیادہ موزوں اور کوئی لڑکی رضوانی کو نہیں مل سکتی۔ ہاں! کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ باتوں اور مستقبل کی خوش آئند تصویروں میں اس محو تھے کہ انھوں نے نسیم کے چہرے کے جلد جلد اُڑتے اور چڑھتے ہوئے رنگ کو نہ دیکھا۔

"ٹھیک ہے" چچا جان میں ضرور کوشش کرونگی" نسیم ناخونوں سے کیوٹکس اکھیڑ رہی تھی، میں رضوانی بھیا کے کام کے لئے اپنی جان تک لڑا دونگی" بھیا کا لفظ جیسے بڑے جبر سے کہا، نسیم نے اور وہ بھی چبا چبا کے، آنکھوں میں ایک چمک تھی . . . . اور چہرے پہ یاس انگیز رونق

اچھا تو تم جواب کب تک دو گی بیٹی" ہنستے ہوئے چچا نے پوچھا" تم بڑی اچھی ہو بیٹی . . . . تم بڑی اچھی بیٹی ہو۔ . . . . . ہا . . . ہا . . . ہا . . . مسلسل ہنسی جاری تھی

"ارے کہاں ہے نسیم بیٹا . . . . ذرا یہاں تو آنا" رضوانی کی والدہ نے برآمدے میں کھڑے ہو کر نسیم کو پکارا آج رضوانی کی شادی کا دن تھا مگر استفسار پر معلوم ہوا کہ نسیم گھر جا چکی ہے۔

سب کو برا اچنبھا ہوا، سرگوشیاں ہوئیں، بڑی بوڑھیوں نے ناکوں پر انگلیاں دے ماریں . . . . منہ بنائے گئے . . . . . . اور بعضوں نے مذاق اُڑایا . . . . رضوانی کی والدہ بے ساختہ رونے لگیں، لوگوں نے سمجھایا تو کہا "نانی جی میں روتی کہاں ہوں یہ نہ جانے کیوں نسیم کے نام سے میرے آنسو امنڈ آتے ہیں" شدہ شدہ یہ خبر مردانے تک پہونچی اور دیکھتے ہی دیکھتے رضوانی کا پر رعب چہرہ سکڑ کر رہ گیا، شام ہو چلی تھی۔

"نسیم بیٹا آج ایک بات تم سے کہنے آیا ہوں ذرا سن تو لو!"

نسیم کے والد کمرے میں داخل ہوئے" کیا ہے بابا نسیم نے جیسے بہکے ہوئے الفاظ میں پوچھا۔

"یہی کہ تم وہاں سے لوٹ کیوں آئیں ارے وہاں سب پریشان ہیں؟" وہ کوچ پر بیٹھ گئے۔ نسیم جھولے پر آنکھیں بند کئے۔ پشت کی جانب سر لٹکائے جھولے چلی جا رہی تھی اور دنیا ومافیہا سے بالکل بے خبر معلوم ہو رہی تھی وہ اتنی سعادتمند بیٹی تھی کہ اس کے ادب کو خاندان میں مثالاً استعمال کیا اور سراہا جاتا تھا، مگر آج نسیم نے باپ کی بات کا جواب تو دیا لیکن نہ آنکھیں کھولیں اور نہ ہی جھولنا کم کیا۔ وہ سخت حیران تھے۔

نسیم بیٹا! باپ نے جواب نہ پا کر گھبرا کر جلدی سے اس کا جھولا تھام لیا" بیٹا . . . . نسیم . . . . نسیم . . . . بانو . . . . بانو انھوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا ہے با . . . با . . . آ" اس نے بڑی مشکل سے

آنکھیں نیم وا کیں

"بیٹا کیا ہوا ہے تمہیں . . . کیا بات ہے؟ وہ تھرتھرانے لگے

"خدا انہیں خوش رکھے رضوانی . . . . تم اور شمیم پھولو پھلو . . . . آمین . . . آمین . . . !

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"میاں رضوانی کہاں بیٹا!" وہ حیران تھے اور جب کوئی بات نہ بن پڑی تو یہ جملہ بول اُٹھے . . . . آہیں . . . . نسیم نے آنکھیں کھولیں اور باپ پر نظریں جما کر بولی "خدا حافظ بابا جاتے ہیں . . . . جی گھبراتا ہے . . . . . ناامیدی چھاتی ہے تو کیا ہوتا ہے . . . . آپ کو معلوم ہے اس نے اُن کے رخساروں کو ہاتھ میں لے لیا . . . . . جن پر بوڑھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے

"یہ ہوتا ہے . . . . یہ ہوتا ہے . . . . یہ ہوتا ہے!

وہ کسی قدر اُدھر کو اٹھی . . . سانس پھول رہا تھا . . . . .

ایک دل آویز چیخ اس کے منہ سے نکل گئی . . . . اس نے کلیجہ پکڑ لیا

میری بچی . . . . میری نسیم . . . . بدلو . . .

"بدلو" سراسیمگی نے اُنھیں پاس رکھی ہوئی گھنٹی تک بجانے کا ہوش نہ دیا . . . . وہ قوت بھر چلائے۔

"جی آیا حضور!" بدلو . . . چلاتا ہوا آپہونچا فرمایئے . . . . اسے بی بی!"

ڈاکٹر . . . فون . . . جلدی . . . جلدی!"

بڑی بے ترتیبی سے اُنھوں نے کہا" گھبرائے . . . نہ . . . میں سمنے تو میں آج جا رہی ہوں . . . . بس ہوں . . . . سنو تو رضوانی . . . ذرا سن لو . . . میں تمہیں کوئی تکلیف نہ دونگی ہاں . . . ہاں . . . مطمئن رہو" شرابیوں کی طرح نسیم کہنے لگی . . . والد کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی

تیری بچی . . . . پروردگار عالم . . . . ارحم الراحمین

اُنھوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھا اور خود ہی لرز کر رہ گئے۔

"میں جاتی ہوں . . . . خدا حافظ . . . . حا . . .

. . . ف . . . . حافظ . . . . . . اللہ!!

ایک ہچکی کے ساتھ نسیم کی روح فردوس کو جا چکی ساتھ ہی اس کی گردن ڈھلک گئی . . . . اور اس کے والد بیہوش ہو کر لڑھک کر اس کے پیروں میں آ رہے

عین اسی وقت، گھر کے سامنے سے رضوانی کی برات جا رہی تھی جس کے ساتھ پورا فوجی بینڈ نغمہ سرائی کر رہا تھا۔

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

آنکھوں سے دور دل سے قریب پیاری سکھی!... دل نواز سکھی!! میں تجھے یاد کرتی ہوں.... سکھی تیری یاد میں ہر گھڑی اور ہر لمحہ گذرتا ہے بلکہ میں قلب کی ہر حرکت میں تیری یاد پاتی ہوں... آہ تو... مجھ سے دور ہے.... دور... بہت دور... کاش میری آہیں تجھ تک پہنچ سکتیں، پیاری دوست میری دنیائے مسرت! میں تیری یاد میں کھو جاتی ہوں... محو ہو جاتی ہوں... آہ میں تجھ تک پہونچنے کی ناکام کوشش کرتی ہوں... مگر جس طرح چکور چاند تک پہونچنے میں ناکام رہتا ہے... اسی طرح میں... ہاں میں بھی... ناکام رہتی ہوں... آہ... مجھے وہ رنگین وہ کیف آگیں لمحات کبھی نہ بھولیں گے۔ دوست! جب تو نے میرے بالوں میں ایک ترو تازہ اور دلکش سرخ گلاب کا پھول یہ کہکر لگا دیا تھا۔ فہمیدہ پیاری! یہ میری محبت کا پھول ہے: اور معلوم ہے تم نے پھول پر کیا لکھا تھا" ریممبر می (Re-member me)....: آہ سکھی! اب بھی وہی کالج ہے" وہی شاداب باغ، اور وہی میں ہوں... مگر آہ تو نہیں... میرے دل کا کنول مرجھا گیا... آہ وہ وقت کیسا دردناک تھا جب تو مجھ سے جدا ہو رہی تھی... آہ تیری نرگسی اور مخمور آنکھوں میں آنسو بھرے تھے... اور تو... ایک مجسمۂ حسرت و غم... لیکن دوست! میری حالت ناقابل بیان تھی... میری آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی لیکن میری آنکھیں میرے دل کی ترجمان تھیں... اور شاید تم نے میری آنکھوں میں یہ عبارت پڑھی ہو... آہ تم جا رہی ہو... جاؤ..... جب قسمت ہی میں جدائی لکھی ہے تو کیا چارہ... آہ... بھئی جو کچھ بھی ہے اس کی ہے کہ تم ایسی حالت میں جا رہی ہو جب پھر کبھی ملنا یا دیکھنا بہت ہی دشوار ہے۔ لیکن ایک التجا ہے کہ وہاں کی گوناگوں رنگینیوں میں مجھ کو بھول مت جانا"....

فراموش کار بہن! کیا تجھے وہ صبح ہاں وہ دل کش اور دلفریب صبح یاد ہے، جب ضیا بار روشنی بڑھنے لگی تھی۔ کائنات انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی، پر کیف روشنی اور فرحت بخش ہوا کے تاثر سے کائنات کا ذرہ ذرہ، پتہ پتہ ترو تازہ ہو کر چمک اٹھا تھا اور ہم باغ میں محوِ گلگشت تھے۔ کہ مہندیوں کی جھاڑیوں میں سے ایک سانپ سہیں رینگتا ہوا دکھائی دیا... تم ڈر کر بھاگیں... لیکن دراصل وہ سانپ نہیں، ربڑ کا ایک لمبا ٹکڑا تھا... یہ دیکھکر میں بے ساختہ تمہارے اوپر ہنس پڑی تھی اور تم گلاب کی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی خندہ زن تھیں... آہ... ان ایام شیریں کی رقت انگیز یاد... میرے لمحات زندگی تلخ کئے دیتی ہے... آہ تمہاری یاد مجھے بے چین کئے دیتی ہے... تمہاری یاد تمہارے خیال نے میرے قلب حزیں میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے... کیا تمہیں معلوم ہے....؟

بہ آمدِ برشگال

برکھارت کا سندیسہ

محترمہ مس رضیہ سلطانہ

جھولا جھلائے کون ہے ——— سکھی ری

باگوں میں کوئل کوک رہی ہے ——— سونے کو آئی رات ———
پی تو گئے پردیس ہمارے ——— آئی بھری برسات ———
——— گیت سنائے کون ——— سکھی ری،
——— جھولا جھلائے کون

مست گھٹائیں جھوم کے اٹھیں ——— ساون کا سندیس ———
پریم کی نیا ڈول رہی ہے ——— وہ ہیں پرائے دیس ———
——— ان سے ملائے کون ——— سکھی ری،
——— جھولا جھلائے کون،

رم جھم، رم جھم مینہا برسے ——— جھومے سب سنسار ———
ننھی ننھی بندیاں گوندھیں ——— برکھارت کا ھار ———
——— مجھ کو ہنسائے کون ——— سکھی ری،
——— جھولا جھلائے کون،

نس نس میں اک ٹیس سی اٹھے ——— وہ جو نہیں ہیں پاس ———
بستی بستی ڈھونڈھ پھری ہوں ——— پی نے لیا بن باس، ———
——— ڈھونڈھ کے لائے کون ——— سکھی ری
——— جھولا جھلائے کون ،

میدانِ جنگ میں قیامت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دونوں طرف کی فوجیں اپنی اپنی خندقوں میں خاموش پڑی تھیں۔ ریت کے بورُدں کے پیچھے ترکی اور روسی توپخانہ معطل تھا۔ مشرقی تھریس کی آندھیاں اول تو ویسے ہی حد درجہ پر آشوب ہوتی ہیں اور پھر جب اُن کے پیچھے تاریک بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی چمک بھی موجود ہو تو ان آندھیوں کی قیامت خیزی اور اشوب انگیزی کا کیا ٹھکانہ ہے دونوں طرف کے سپاہی خندقوں، مورچوں اور ٹیلوں کی آڑ میں آنے والے طوفان کا بے چینی اور پریشانی سے انتظار کر رہے تھے ہر ایک کو خطرہ تھا کہیں بارش اور طوفان کی آڑ میں دشمن کی فوجیں ہم پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ اس لئے فضا کی حد درجہ ناساعدت اور موسم کی برہمی کے باوجود دونوں طرف کے طلایہ گرد دستے اپنے اپنے فرائض سے غافل نہ تھے۔

روسی مارشل اسٹالوف میدانِ جنگ سے چند میل دور ایک پہاڑی دامن میں خرد کش تھا۔ وہ برابر اپنے جنرل اسٹاف کے ساتھ مشورے کر رہا تھا۔ مارشل خیال کر رہا تھا کہ یہ رات حملے کے لئے کس قدر موزوں ہے اس کے سامنے میز پر جنگی نقشے پھیلے ہوئے تھے۔ اور مصری پائپ کے خوشبودار دھوئیں کے بادلوں میں اس کی نگاہیں ترکی محاذ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مارشل سے چند گز کے فاصلے پر روسی جنرل اسٹاف کے دوسرے ممبر فکر و حیرت سے اپنے کمانڈر کے بارعب چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے تھے۔ مارشل کی گھنی مونچھوں سے سگریٹ کا دھواں بل کھا کر اس طرح نکلتا تھا گویا اس کے سینے کا کوئی خوفناک راز بھی کش کے دھوئیں کے ساتھ باہر کھنچ آیا ہے خیمے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ یہاں تک کہ کیمپ واچ کی بے شور ٹک ٹک بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ . . . . کہ ناگہاں اسٹالوف کی پُررعب آواز بلند ہوئی۔

دوستو! اب ہم اس صورت حال پر صبر نہیں کر سکتے۔ ترکی فوجوں نے غیر معمولی طور پر مدافعت کی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا سلسلہ رسل و رسائل دشمن نے برباد کر دیا ہے اور تمام مورچوں پر ہماری فوجیں لڑتے لڑتے تھک چکی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رات فیصلہ کن رات ثابت ہوگی۔ اگر ہم نے یہ موقعہ گنوا دیا تو کل تازہ دم ترکی فوج ہمارے سر پر ہوگی بہتر صورت یہ ہے کہ ہم اسی رات میں سامنے والے ترکی دستوں سے نبٹ لیں۔ جس کمان احمد عزت پاشا کر رہا ہے اگر ہم نے عثمانیوں کے ہراول پر فتح پالی تو قسطنطنیہ تک ہمارا راستہ صاف ہے (بوڑھے جنرل کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اُٹھا)

کمرے میں مکمل سکوت طاری رہتا ہے جس کی خاموشی

میں دلیر مارشل کی صدائے باز گشت گونج رہی ہے۔

جناب والا! (ایک نوجوان افسر نے جرأت کر کے کہا)
کیا اس طوفانی رات میں ہمارے دستے کامیابی سے حرکت کر سکیں گے؟

یقیناً! مارشل نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا، بشرطیکہ ہم تیزی سے درّہ فاہنل کو بند کر دیں تاکہ دشمن پر کمک اور واپسی کا راستہ بند ہو جائے مگر وہاں تو مضبوط ترکی گارڈ کا پہرہ ہوگا۔

یہ بھی ممکن ہے مگر ہمیں اسی وقت اپنی تیزی، چستی اور فوجی صلاحیت کا امتحان کرنا ہوگا۔ اگر ہم درّہ فاہنل کو بند کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پچاس ہزار ترکی فوج ایک بند جگہ میں گھر کر رہ جائے گی۔

"پچاس ہزار ترکی فوج؟" تمام افسروں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔

بے شک پورے پچاس ہزار ترک صرف ہمارے رحم و کرم پر ہونگے۔ میں کہتا ہوں (اسٹالوف میز پر گھونسہ مارتا ہے)، آج کی رات درّہ فاہنل کو بند کر دینا ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے، تاکہ کل ہم میدان جنگ میں سرپھرے عثمانیوں کو تباہ کر سکیں

خیمہ میں سناٹا چھا جاتا ہے اور جنرل اسٹاف کے ممبر آپس میں کچھ سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں تیزی سے شراب کے جام خالی ہونے لگتے ہیں اور سگاروں کے دھوئیں سے کمرے کی فضا دھندلی ہو جاتی ہے۔

کچھ دیر مشورے کے بعد ایک مسلح فوجی دستہ درّہ فاہنل کی طرف روانہ ہو گیا جنرل اسٹاف کا نوجوان افسر کمان کر رہا

بارش پورے زور شور سے۔۔۔ ہو رہی ہے اور مشرقی تھریس کی پہاڑیاں گھٹا ٹوپ اندھیرے، زبردست بارش اور تیز ہواؤں میں مرے ہوئے ہیبتناک اژدھوں کی طرح خوفناک اور خاموش معلوم ہو رہی ہیں۔ نیچے میدان میں سناٹا ہے۔ صرف آندھی اور طوفان کے وحشی جھونکے غل مچاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر گذر جاتے ہیں۔ ترکی فوج کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے پورے دس میل دور ہے۔ البتہ ایک غیر محفوظ فوجی گارڈ سہما سہما یا درّے کی حفاظت کے لئے موجود ہے۔ تمام خیمے اور چھولداریاں ہوا میں اڑ چکی ہیں اور وادی میں پھٹے ہوئے چیتھڑوں کی اِدھر سے اُدھر اڑتی نظر آتی ہیں۔ بہادر ترکی سپاہی جو قہار فوجوں کے مقابل کبھی پیچھے نہیں ہٹے زبردست آندھی کے تھپیڑوں کے سامنے سوکھے ہوئے پتوں کی طرح لرزتے نظر آتے ہیں انھیں خطرہ ہے کہ کہیں کوئی خوفناک جھونکا انھیں اس پناہ گاہ سے اٹھا کر دو پتھروں پر نہ پٹک دے۔ یہ صرف چالیس نوجوان ہیں۔۔۔۔ نہیں اکتالیس۔۔۔۔ کیونکہ ان میں ایک نوجوان سرفروش عورت بھی ہے جو اپنی مرضی سے بطور ایک نرس کے ان کی خدمت کے لئے اس طرف چلی آئی ہے۔ اسکا نام فوضیہ خانم ہے اور یہ اس زمانہ کو رسے تعلق رکھتی ہے۔ جو استانبول میں مجاہدین کی خدمت اور وطن کے دفاع کے لئے مہیا کی گئی ہے فوضیہ نہ صرف خوبصورت بلکہ شجاع بھی ہے۔ اگر شجاع نہ ہوتی تو فوج کے ساتھ موت کی وادی میں کیوں چلی آتی۔۔؟ گارڈ کا لیڈر فوضیہ کا منگیتر ہے۔ علی رضا کو اپنی بہادر محبوبہ "فوضیہ" پر فخر ہے اور کیوں فخر نہ ہو آخر وہ اس کے پہلو بپہلو تمام مصائب نہیں برداشت کر رہی۔؟

آندھی کا وہی زور و شور ہے۔ بارش کی وہی کیفیت ہے

مگر اس طوفان سے بڑھ کر ایک اور زبردست طوفان نے اِن جان پر کھیلے ہوئے وطن پرور نوجوانوں کو آگھیرا ہے یہ روسی دستے کی گولیوں کی بوچھاڑ ہے جو اچانک چٹانوں کی آڑ اور پتھروں کی اوٹ سے شروع ہوگئی ہے۔ مگر کیا بہادر ترکی دستہ موت کے اس اچانک وار سے دب گیا ہے؟ نہیں گولیوں اور اولوں کی بارش میں ترکی سرفروشوں کے ولولے بڑھے ہوئے ہیں۔ سب سے آگے علی رضا ہے اور عقب میں فوضیہ اِن اکتالیس نڈر سپاہیوں کا دو سو روسی نوجوانوں سے مقابلہ ہوگیا ہے۔ دستی بموں کے دھماکے اور مشین گنوں کی سنسناتی ہوئی گولیوں سے چٹانوں کے سینے پھٹ گئے ہیں ترکی پٹرول گارڈ کو خطرے میں دیکھ کر علی رضا نے ہیڈ کوارٹر کو خطرے کا سگنل کر دیا ہے مگر قبل اس کے کہ احمد عزت پاشا اپنے گھرے ہوئے محصور سپاہیوں کی کمک کے لئے فوج روانہ کرے۔ روسی ہراول پلٹن نے تمام اہم نقطوں پر قبضہ کر لیا ہے اور اب نوکیلے پتھروں پر قدم جما جما کر ترکی سپاہی رائفلوں کا جواب سنگینوں اور نیزوں سے دے رہے ہیں۔۔۔ اُف کتنا نازک اور خطرناک وقت ہے!

علی رضا کی لاش کے ارد گرد زخمی بہادر ترکوں کی لاشیں اور شکستہ اسلحے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے ہیں اِن پاک شہیدوں کا مقدس خون وادی کے پتھروں کو گلنار بنا رہا ہے۔ روسی سپاہی تمام درے پر قابض ہو چکے ہیں اب صرف ایک راستہ رہ گیا ہے جہاں سے گذر کر روسی فوجیں ترکی ہیڈ کوارٹر تک پہونچ سکتی ہیں۔ یہ ایک تنگ پہاڑی راستہ ہے جس میں سے صرف ایک آدمی گذر سکتا ہے مگر اس تنگ راستے میں فوضیہ کھڑی ہے وہ اس وقت تک روسی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے جب تک ہیڈ کوارٹر سے مدد آجائے

ہاں اِس بہادر عورت کی سرفروشی اس وقت درے کی گذرگاہ کو روکے ہوئے ہے۔ وہ زخموں سے چور چور ہوگئی ہے مگر رائفل سے ابھی تک بزدل دشمنوں کو جواب دے رہی ہے

اُف رے ترکی خون کا گرم قطرہ!

طوفان گذر گیا، بارش ختم ہوگئی اور صبح کا ستارہ چمکنے لگا۔ احمد عزت پاشا اپنے منتخب جوانوں کے ساتھ درہ فاتحل پر پہونچ گیا ہے۔ اس نے کیا دیکھا۔۔۔؟ اس نے دیکھا کہ چالیس ترکی نوجوان کٹے ہوئے پڑے ہیں۔ اس سے کچھ فاصلہ پر روسیوں کی خونچکاں لاشوں کا ایک انبار بھی دیکھا جو ایک دوسرے پر پڑی ہوئی تھیں۔ مگر یہاں فوضیہ کا پتہ نہیں۔۔۔۔ فوضیہ کی لاش اس تنگ راستے میں پڑی ہے جس کی وہ آخر دم تک حفاظت کرتی رہی۔ وہ آج بھی اس درے کی حفاظت کر رہی ہے۔ کیونکہ وہاں اس سرفروش خاتون کا خوبصورت مزار بنا ہوا ہے۔

بنگال کا جادو
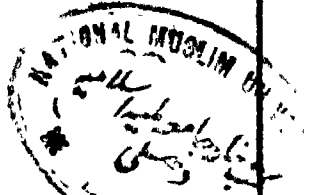
دنیا بھر میں مشہور ہے اور بنگال کے بال بھی اپنی خوبصورتی اور

دل آویزی کے لحاظ سے ہندوستان میں

مشہور ہیں

بنگال بیوٹی ہیئر آئیل

میں دونوں چیزیں موجود ہیں۔ خوشبو کے لحاظ سے جادو کا اثر رکھتا ہے اور تاثیر کے اعتبار سے بالوں کو اتنا ملائم، اتنا دراز اور اس قدر خوبصورت بنا دیتا ہے کہ چہرے کی آب و تاب اور جوانی کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے

بنگال بیوٹی ہیئر آئیل

خالص اجزا سے طیار کردہ، مفید، بالوں کے لئے طبی حیثیت سے انتہا درجہ خوشگوار، نفیس مزاج خواتین، اور بیگمات میں ہر دلعزیز۔ ہر نقصان سے پاک وصاف اپنے شہر کے دکانداروں سے طلب کیجئے

واحد تقسیم کنندہ برائے ہندوستان:- کوہ نور کیمیکل کمپنی صدر بازار دہلی

میں فطرت کے جمال کی والہانہ پرستش کرنے والی اور قدرت کی رنگینیوں کی عاشق جب جاگی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سورج نکل آیا تھا اور اس کی سنہری کرنیں کھڑکی کی دراز سے مجھے اُٹھ جانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔ میں نے اس دلچسپی میں شامل کرنے اور اس حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے شاعرانہ مزاج اور وارفتہ طبیعت جنبیلا کو آواز دی۔ وہ سنجیدہ ہنسی ہنستی ہوئی آئی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے تڑپ کر میرے پاس آکھڑی ہوئی۔

"آہ کس قدر خمار آگیں منظر ہے اور کتنا نشہ ریز!!
اس نے بے اختیارانہ کہا اور کھڑکی میں جھک گئی

جنبیلا، سماج و معاشرت کی ستم رسیدہ اور بے رحم زمانے کی چیرہ دستیوں کی تختۂ مشق تھی۔ اس کے والدین وغیرہ میں سے کوئی نہ تھا۔ اور وہ تین دن سے ہمارے گھر تھی۔ میری پیہم کوششوں نے والدہ کی خوشامد کے بعد اپنے پاس رکھ لیا تھا جب یہ شام کی ٹرین سے اُتری اور نمناک نگاہوں سے متجسسانہ اِدھر اُدھر دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں جنگلے میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میں نے مظلوم جنبیلا کو بلایا اور اس سے اِس انتہائی کسمپرسی کا سبب پوچھا۔ اِس نے بتایا کہ اس کے والدین سورگباش ہو گئے ہیں وہ یہاں اپنے چچا کے پاس آئی تھی مگر سنا ہے کہ چچا بھی چند دن ہوئے مر گئے۔ ان آلام حیات اور مسلسل مصائب و مشکلات پر میری روح امنڈ آئی اور میں اشکبار ہوئے بغیر نہ رہ سکی

بہت دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ قریب کے کوئیں کے پاس گھنی "شکر بیل" کے بوڑھے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی زمانے کی خونیں گردش کے مجھے بہت سے افسانے سنایا کرتی، کبھی کبھی برسبیل تذکرہ اپنے حالات زندگی کا کوئی غیر معمولی واقعہ بھی گوش گذار کر دیا کرتی۔ وہ اکثر عالمانہ وقار کے ساتھ کہا کرتی کہ زمانہ کی چیرہ دستی کس طرح فلاکت زدہ کو پامال کر دیتی ہے اور اس کے تعلقات زندگی اور محسوسات حیات پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اور پھر اسی کے تحت انتہائی خوش اسلوبی اور دلکش طرز ادا کے ساتھ کوئی رنگین قصہ بھی سنا دیا کرتی

یہ سب باتیں ایسی تھیں جنھوں نے مجھے جنبیلا کا وارفتہ بنا دیا تھا۔ اسی دلی لگاؤ اور اپنائیت کے باعث میں نے اس وقت بھی اُسے اپنے ہوشربا منظر کے دکھانے کے لئے بلایا۔ میری توقعات کے مطابق اس بہار آفریں نظارے نے اسے بیخود بنا دیا اور ہم دونوں امی وغیرہ کی ناراضگی کا خیال کئے بغیر دیر تک اس میں گم رہے۔

(۲)

میں کرسی پر بیٹھی لکھ رہی تھی اور جنبیلا پلنگ پر لیٹی ہوئی گنگنا رہی تھی۔

گذر رہی ہے کچھ اس ڈھب سے زندگی ماہر
کہ جیسے میری ضرورت نہیں زمانے کو،

میں تڑپ گئی، شعر تو جیسا مایوس کن تھا، تھا ہی۔ مگر اسکا لہجہ اور ادا کرنے کا طرز بیحد الم انگیز و دردناک تھا میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چنبیلا!"

"ہوں" اس نے جواب دیا۔ میں اس وقت اسکا موثر چہرہ دیکھنا چاہتی تھی میں نے کہا:-

"اِدھر دیکھنا" اس نے دیکھا، آہ میرا دل ہلنے لگا اس کی پلکوں پر قطرۂ اشک چمک رہے تھے، میں نے کہا:-

"رو رہی ہو چنبیلا . . . . ؟"

"نہیں تو یاسمن! کچھ یہ شعر ہی ایسا ہے کہ دل بھر آتا ہے، اس نے جواب دیا"

"میں نے خوشامدانہ لہجے میں زور دیکر کہا

"نہیں چنبیلا! اس کے پس پردہ ضرور کوئی راز ہے تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں، میں تو تم سے پوچھ کر رہونگی کیا تم مجھ سے بھی چھپاؤ گی . . . ؟"

چنبیلا نے ہنس کر کہا "نہیں بخدا یقین کرو کوئی راز نہیں صرف یہ خیال اکثر رلایا کرتا ہے کہ آخر میری زندگی اس طرح گذر رہی ہے؟ آخر ش کبتک اس طرح رہونگی، جانے میری قسمت میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔ . آہ! ہاں سچ ہے" میں نے روتے ہوئے لہجے میں کہا یہ خیال صحیح ہے۔

چنبیلا بولی یاسمن میں بھی سوچتی ہوں کہ میرا مذہب تو میرے ساتھ جس سلوک و روش سے پیش آیا ہے اس کا غم انگیز تصور ہی میری روح کو کپکپا دیتا ہے، لیکن اگر میں اپنے مذہب سے دست کش ہو جاؤں تو کیا کوئی مجھے اپنے گھر میں جگہ دے سکے گا۔ کیا خود ساختہ موجودہ اسلامی معاشرت یہ منظور کر سکے گی کہ ایک نو مسلمہ اگرچہ وہ کتنی ہی خلوص و صداقت کی دیوی سہی اور اگرچہ اس کا دل نورِ ایمان سے کتنا ہی تابندہ ہو ان میں مل کر رہے، اس کے ارتباط باہمی کو کوئی کیونکر منظور کرے گا۔ ؟

اُف دلِ مجبور کی مجبور کن مجبوریاں!

عورت کی بے بسی اور سماج کی ستم پروری پر میں رونے لگی، میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا:

"چنبیلا میں تمہاری ہر ممکن امداد کرنے کو تیار ہوں تمہاری امداد و اعانت کے سلسلہ میں مجھے سخت ترین قربانیوں اور مشکلوں کی خار دار وادی سے بھی گذرنا پڑیگا تو میں اُف نہ کروں گی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر تم ہمارے مذہب میں آجاؤ تو میں اور تم اور بھی زیادہ نزدیک ہو جائیں اور مذہبی بیگانگی کے جو سنگ ہائے گراں ہم دونوں کے درمیان حائل ہیں وہ دور ہو جائیں

چنبیلا نے جلدی سے پوچھا "تو کیا اس صورت میں تم مجھے اپنے خاندان میں شامل کر سکو گی بہن . . . ؟

میں نے اس کے حسین و افسردہ چہرے کی طرف دیکھا

"ہاں، ہاں چنبیلا میں تمہیں اپنے خاندان ہی میں رکھونگی تمہیں ہاں میں اپنی "سہیلی" کو اپنے سے جدا نہ کروں گی، کیا تم نہیں جانتیں کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے!

اس کے دوسرے دن چنبیلا "کنیز زہرا" تھی

(۳)

میں اسٹول پر بیٹھی ہوئی غصے اور رنج کے مارے رو رہی تھی کرسی پر چچا جان اور دوسرے پلنگوں پر، والدہ، چچی بی پھوپی جان، والد صاحب اور ان سب کے لڑکے، لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ آج بحث اور خوشامد کرتے ہوئے تیسرا دن تھا میں

تو یہ کہیئے، ہمارا قدامت پرست خاندان جو نسلی غرور و قومی مباہات کے نشے میں چور تھا۔ کس طرح ایک نوسلمہ کو اپنے دائرہ میں لینے پر طیار ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بھائی جان بھی جو اپنی انقلاب پسندی اور روشن خیالی کے لئے خاندان بھر میں مشہور تھے۔ سماج کے دباؤ سے کنیز زہرا کو قبول نہ کر سکے۔ آہ سماج کا زبردست ہاتھ شاعری کا نازک گلا بھی گھونٹ دیتا ہے۔ کنیز زہرا سب کچھ سمجھ اور سن رہی تھی مگر وہ چپ تھی اور میں . . . . . شرم و ندامت کے احساس کی وجہ سے میں اس سے آنکھیں بھی نہ ملا سکتی تھی یہاں تک کہ . . . . . دوسری صبح کو معلوم ہوا کہ رات کنیز اس گھر سے رخصت ہوگئی . . . . آہ بدنصیب لڑکی

کنیز کو میں بھولی تو نہ تھی مگر ہاں زمانے نے بہت کچھ زخم فرقت کو مندمل کر دیا تھا کہ ایک روز میرا بھائی دوڑا ہوا آیا اور اس نے کہا زہرا بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ تانگہ پر آئی ہیں۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کر نیچے اتری تو دیکھا تین لڑکیاں سیاہ برقعہ میں ملفوف ہنستی ہوئی مکان میں چلی آرہی ہیں۔ میں نے پیار بھرے غصے میں اس سے کہا:

"کیوں ری بے مروت تو ہم سے چھپ کر کیوں چلی گئی تھی" میں نے دیکھا زہرا کے چہرے پر نفرت تھی، میں حیران ہونے لگی، وہ کرسی پر بیٹھ گئی، مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اس نے کہنا شروع کیا:۔

یاسمن! محبت کی یہ شکایتیں تو پھر ہوا کریں گی۔ آج مجھے تمہارے سامنے اس معمے کو حل کرنا ہے۔ جس کی پیچیدگیاں نے تم سب کو ان پریشانیوں سے روشناس کیا ہے۔ آؤ آج میں ایک اہم راز کی نقاب کشائی کروں

سنو یاسمن! میں الحمد للہ ایک شریف زادی ہوں تمہاری مانند شریف و پاکیزہ اخلاق! عفت و عصمت کے جواہرات کا خزینہ میرے پاس اسی قدر ہے جتنا کہ کسی شریف و پاکباز مشرقی عورت کے پاس ہو سکتا ہے۔

پیاری بہن! میں شادی شدہ ہوں۔ شادی شدہ! اپنے شوہر کے ایما پر میں نے جنیلا کے نام کی مصنوعی اور فرضی نقاب اوڑھی تھی۔ ہم لوگ ابھی تک پڑھتے ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہن انٹرنس میں ہیں اور میں اور میری دوست شکیلہ الیف۔ اے فائنل میں ہیں، میرا اصلی نام کنیز زہرا ہی ہے

میں نے امسال گرما کی تعطیلات میں اپنے شوہر اور سہیلیوں کے مشورے سے یہ ارادہ کیا کہ اس دلچسپ ڈرامے کو کھیلا جائے اگرچہ اس میں خطرات بھی تھے مگر میں اپنی شوخ طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھی۔

پیاری بہن! آج میں نے سماج کے چہرے سے نقاب اتار کر اس کی بھیانک صورت کو بے نقاب کر دیا ہے یہ ہماری گندہ معاشرت کی ایک دردناک کہانی ہے جس میں میں نے اور تم نے مساوی حصہ لیا ہے۔ اب جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ . . . . . . اور وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ اس پر برابر ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا مگر میں . . . . تو میری آنکھوں میں عبرت ناک خجالت کے آنسو تھے۔

ہمارے بعض مہربان دوستوں نے زبانی اور تحریری فرمائشیں بھیجنے کے باوجود رسالے کے وی پی وصول نہیں کئے جس سے رسالۂ مسافر کے شعبہ کو نقصان پہونچا۔ ہم ایسے قدردان حضرات سے گذارش کرتے ہیں کہ اگر کسی خاص سبب یا مجبوری کے تحت یہ ارادہ ایسا ہو گیا ہے تو براہ کرم ادارے کی دیرینہ خدمات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے زر چندہ مبلغ دو روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجکر ادارے کو موقعہ شکر گذاری بخشیں۔

"منیجر"

رئیس احمد رئیس مرادآبادی

ایک کچھوا تھا کسی تالاب میں ‖ رات دن رہتا تھا موجِ آب میں
موج آئی اسکے دل میں ایکبار ‖ دیکھئے خشکی کا منظرِ بہار
چل دیا پانی سے آخر کار وہ ‖ دیکھتا تھا چارسو ہر بار وہ
تھا وہاں موجود ایک خرگوش بھی ‖ دیکھتا تھا سیرِ خشکی و تری
ہنس دیا خرگوش اسکے حال پر ‖ یعنی کچھوے کی اس ہلکی چال پر
یوں تکبر سے کہا خرگوش نے ‖ چال کوئی تم سے چلنا سیکھ لے
سست جیسے دھوپ سرِ راہ پر ‖ یا مسافر منزلِ جانکاہ پر
جس طرح گھٹنے کی چلتی ہو سوئی ‖ واہ یہ کیا سست رفتاری ہوئی
آؤ بد کر شرط مجھ سے دوڑ لو ‖ دوڑ لو انجام جو ہی ہو سو ہو
یوں کہا کچھوے نے گردن ڈالکر ‖ آپ کو کیا تیز ہے مدِ نظر
میں کہاں اور تیز رفتاری کہاں ‖ چیونٹی چل سکتی ہے بیچاری کہاں
ضد جب ڈالا بہت خرگوش نے ‖ پھر تو کچھوے کو ابھارا جوش نے
شرط بد کر دونوں آمادہ ہوئے ‖ دیکھ کر کچھوے بھی آخر چل دئے
جوش میں بھر کر چلا خرگوش جب ‖ دنگ طائر رہ گئے جنگل کے سب
جسطرح بجلی رواں ہو تار پر ‖ برق چمکے یا کہیں کہسار پر
یا بگولے جسطرح بنمیں چلیں ‖ یا ہوائیں صحنِ گلشن میں چلیں

زور میں خرگوش بجلی بن گیا ‖ دور تک کرتا ہوا زن زن گیا
جب نکل آیا وہاں سے چند میں ‖ تو نظر آئی اسے شفاف جھیل
پانی لہریں مارتا خاموش تھا ‖ اور سبزہ ہر طرف گل پوش تھا
ہنس کے یوں خرگوش نے دل میں کہا ‖ اب تو کچھوا مجھ سے میلوں رہ گیا
کیوں نہ اب اس جھیل پر آرام لیں ‖ پھر کہیں چلنے کا یاں سے نام لیں
واہ رے کچھوے بھلا تیرا خیال ‖ بڑھ کے چل سکتا مجھے تو بجلی کی چال
خیر ہمت آزما کے دیکھ لی ‖ میری طاقت آزما کے دیکھ لی
کہہ کے یہ خرگوش نے پھیلائے پاؤں ‖ دیکھ کر پیپل کی پر آرام چھاؤں
اب جو سویا وہ تو سوتا رہ گیا ‖ اپنی وقت یوں سونے میں کھوتا رہ گیا
آنکھ کھلتی بھی تھی تو اٹھتا نہ تھا ‖ اس کو کچھوے کا ذرا خطرہ نہ تھا
اور ادھر کچھوا بیچارا سست گام ‖ دھن کا پورا ہٹ کا پکا تا بہ شام
اپنا سینہ ٹیک کر چلتا رہا ‖ وہ نہ جھجکا اور دن ڈھلتا رہا
چپکے چپکے راہ طے کی دور کی ‖ کاہلی اپنی نہ پر منظور کی
مختصر یہ ہے کہ مغرب کے قریب ‖ آ گیا منزل پہ کچھوا خوش نصیب
اور ادھر خرگوش سوتا رہ گیا ‖ یعنی موقعہ خود ہی کھوتا رہ گیا
واہ رے خرگوش تیری کاہلی ‖ جیت لی کچھوے نے بازی جیت لی

شام کے سات بجے ہوں گے۔ ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ شاہی باغ کی مالن اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھی ہوئی گجرے اور ہار پرو رہی تھی کہ اسے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ پہلے تو غور سے سنتی رہی پھر آہستہ سے اٹھی اور آواز کی سمت چلی، کیا دیکھتی ہے کہ ایک ننھی منی سی بچی گلاب کی جھاڑیوں کے پاس پڑی رو رہی ہے۔ اس نے بچی کو اٹھایا پیار کیا، وہ چپ نہ ہوئی تب وہ اسے جھونپڑی میں لائی اور دودھ پلایا۔ بہت دیر تک وہ انتظار کرتی رہی کہ شاید بچی کا کوئی وارث آجائے لیکن دن بیتتے گئے اور کوئی نہ آیا۔

اب مالن کا وہاں رہنا دشوار تھا وہ ڈرتی تھی کہ لوگ اس پر نکتہ چینی کریں گے۔ چنانچہ ایک رات وہ اپنی چھوٹی سی جھونپڑی اور پالتو کبوتروں کو چھوڑ کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے وہاں سے چل کھڑی ہوئی، چار دن کے سفر کے بعد وہ ایک پر رونق شہر میں پہونچی۔ جلد ہی اسے ایک متمول گھرانے میں برتن وغیرہ مانجھنے کی نوکری مل گئی۔

مالن لڑکی کو بہت چاہتی تھی واقعی وہ بہت پیاری لڑکی تھی۔ اس کے سنہرے بال شانوں پر لہراتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی کہ پہلی ہی ملاقات میں انسان اس کا گرویدہ بن جاتا۔ صفیہ زیادہ تر مسز حامد کے بچوں کے ساتھ ہی کھیلتی رہتی تھی۔ اُن کی ایک لڑکی شمیم صفیہ ہی کی ہم عمر تھی۔ جب وہ ماسٹر صاحب سے پڑھنے بیٹھتی تو صفیہ بھی بہت غور سے سنتی رہتی۔ اور وہی الفاظ دہراتی۔ بیگم حامد نے جب اس کا یہ شوق دیکھا تو اسے بھی کتاب منگا دی۔ اب صفیہ پڑھائی میں بہت کوشش کرتی تھی اور جب اپنا سبق بیگم حامد کو سناتی تو وہ بہت خوش ہوتی اور اور اس کی تعلیم کا خاص طور سے خیال رکھتیں۔ رات کے دس بجے ہوں گے۔ بیگم حامد ایک کمرے میں بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی کہ شمیم دوڑی ہوئی آئیں۔ اور اپنی امی کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھنے لگی

امی جان! بھائی جان کب آئیں گے

بیگم پانچ سال بعد پھر قدرے وقفہ سے "اُف میرے خدا یہ پانچ سال کیسے کٹیں گے،

امی جان اتنے دن ولایت میں رہ کر کیا کریں گے۔

بیٹی وہ ڈاکٹری پڑھنے گئے ہیں۔ خدا خیر سے [illegible] لائے

صفیہ اب بڑی ہو گئی تھی۔ مالن نے اس کی منگنی [illegible] کے چھوٹے بھائی کی نانا کے بیٹے سے کر دی جو کسی کوٹھی میں باورچی کا کام کرتا تھا۔ صفیہ کو اس خبر سے رنج ہوا۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ بچاری کی ساری ہنسی رخصت ہو چکی تھی وہ ہمیشہ کسی خیال میں غلطاں و پیچاں رہتی۔ شمیم بہت کوشش کرتی

کوشش کرتی کہ وہ پہلے کی طرح ہنسے بولے لیکن وہ ذرا دیر کے لئے باتیں کرتی اور پھر چپ ہو جاتی۔

آج حامد منزل دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ رنگ برنگ کے قمقمے لگائے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے باہر لاتعداد موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دفعتہً مبارک و سلامت کا غلغلہ بلند ہوا اور مسٹر حامد معہ ڈاکٹر خالد کے ہاروں سے لدے ہوئے موٹر سے اترے۔ سب سے مل ملا کر اندر تشریف لائے۔ ماں پہلے ہی سے انتظار میں کھڑی تھی، دعا دی، پیار کیا۔ شمیم اور ماجد دوڑ کر آئے

ابھی مسٹر خالد کو لندن سے آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے ماموں کا تار آیا کہ حالت نازک ہے، فوراً پہنچو۔ بیگم حامد کا جانا ضروری تھا وہ ماجد اور شمیم کو بھی ساتھ لیتی گئیں لیکن خالد تھکے ماندے ہونے کی وجہ سے گھر پر رہے۔

صبح کو وہ پائیں باغ میں گشت لگا رہے تھے کہ یکایک کسی کی سسکیاں لے لے کر رونے کی آواز آئی۔ وہ جب ادھر گئے تو دیکھا کہ حوض کے کنارے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔ اس کے سنہرے ریشمی بال زمین تک لٹک رہے تھے۔ وہ تعجب خیز نظروں سے گھورتے رہے، آخر کار انہوں نے مہر خاموشی کو توڑا اور بولے تم کون ہو اور کیوں رو رہی ہو.....؟

لڑکی نے اپنی نرگسی آنکھیں جن میں آنسو چمک رہے تھے اوپر اٹھائیں اور بولی میں تو نہیں روتی۔

خالد کو اس فقرے پر ہنسی آ گئی اور ہنس کر بولے لیکن تمہاری آنکھوں میں تو ابھی تک آنسو ہیں

صفیہ نے جھٹ پلّو سے آنسو پونچھ لئے اور کہا نہیں تو فوراً ہی کسی نے آواز دی "صفیہ! صفیہ!! ادھر آ"

یہ سن کر وہ فوراً اٹھ کر بھاگ گئی اور مسٹر خالد کھڑے کے کھڑے رہ گئے

دو روز سے مسٹر حامد کے یہاں ان کے بہت پرانے دوست امریکہ سے تشریف لائے ہیں ان کی بیوی اور بچے سب مغربی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

گھر کے سب لوگ کرسیاں سبزہ پر بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی رہی، اچانک مسٹر حامد اپنے دوست مسٹر اکرم کی طرف مڑے اور بولے

"آخر آپ نے یوں یکایک ہندوستان چھوڑ کر امریکہ جانے کی کیوں ٹھانی تھی...؟

یہ سن کر مسٹر اکرم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر کہنے لگے "سولہ سال ہوئے میری پہلی لڑکی ایک چھوٹے سے ہسپتال میں پیدا ہوئی۔ چونکہ میری بیوی کی طبیعت بہت خراب تھی اور اتفاق سے اس وقت ایک ہی نرس کا انتظام ہو سکا وہ دونوں کی دیکھ بھال نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے میں نے بچی کو اپنے پرانے نوکر کے ہمراہ معہ چار سو روپئے کے اپنی بہن کے یہاں بھجوایا لیکن وہ دن اور آج کا دن نہ تو اس نوکر کا پتہ چلا اور نہ ہی بچی کا۔ باوجود ہزاروں کوششوں کے ہم کامیاب نہ ہوئے پھر یہاں سے کچھ ایسا دل اچاٹ ہوا کہ بس میں اپنی بیگم کے اچھے ہوتے ہی فوراً امریکہ چل کھڑا ہوا۔ پھر وہاں پر برخوردار خالد نے خط لکھ کر مجھے لندن بلایا۔ آخر کار وطن کی محبت اور آپ کے خطوط نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کر ہی دیا۔"

خالد جو مسٹر اکرم کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا گویا ہوا:-

کیا لڑکی کی پہچان کے لئے کوئی نشان بھی تھا؟

مسٹر اکرم (چونک کر)، ہاں! اس ہسپتال کے دستور کے بموجب ہر بچے کی کلائی پر ایک عجیب قسم کا کالا نشان بنایا

جانا تھا جو کبھی نہ مٹ سکتا تھا

خالد نے اسی قسم کا نشان صفیہ کی کلائی پر دیکھا تھا اور وہ یہ دیکھ کر بہت حیران تھا۔ کیونکہ مسٹر اکرم کی چھوٹی لڑکی بہت کچھ صفیہ سے ملتی جلتی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں وہی بال۔ لیکن چھوٹی لڑکی کا رنگ کسی قدر گلابی مائل تھا۔ چنانچہ وہ دوڑ کر اندر آیا اور سیدھا باورچی خانے میں گیا جہاں صفیہ سبزی کاٹ رہی تھی۔ خالد نے کہا صفیہ ذرا اپنی کلائی تو دکھانا، پہلے تو وہ ہچکچائی لیکن پھر دکھا دی وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے گیا اور زور سے کہا:-

"لیجئے چچا جان آپ کی گم شدہ لڑکی"

مسٹر اکرم حیران، بت بنے یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور جب نشان پہچان لیا تو میری بچی کہہ کر صفیہ کو گلے لگا لیا لیکن وہ بیچاری حیران و پریشان سب کی طرف دیکھتی رہی مسز اکرم اسقدر خوش نظر آتی تھیں جیسے اُنھیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

چند دنوں بعد مسٹر خالد کی صفیہ کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔

مالن کو بھی صفیہ نے اپنے پاس ہی رکھا اور وہ اس کی ماں جیسی عزت کرتی تھی۔

التماس جو اہل ذوق اصحاب مسافر کا نمونہ طلب فرمائیں وہ ازراہِ عنایت تین آنے (۳) کے ڈاک کے ٹکٹ ارسال فرمایا کریں، کیونکہ مفت رسالہ روانہ کرنے میں ادارہ کا سخت نقصان ہے لہٰذا بغیر قیمت پرچہ وصول کئے ہم ایسی فرمائشوں کی تعمیل سے بالکل مجبور ہیں۔ مینجر

صنفی بہنوں میں یہ خبر حد درجہ مسرت و انبساط سے سنی جائیگی کہ مسافر اور صنفِ نازک کی مشہور قلمی معاون اور یوپی کی جادو نگار ادیبہ اور شاعرہ پیاری بہن مضطر رضویہ کی شادی خانہ آبادی بتاریخ ۱۱ مئی سنہ ۱۹۴۲ء جناب سید ارشاد حسین صاحب رضوی سے بخیر و خوبی انجام پائی۔ مضطر بہن کی ادبی قابلیت محتاجِ بیان نہیں۔ آپ اپنی نازک خیالی جواہر نگاری اور علمی اوصاف کی بنا پر نسوانی دنیا میں ایک خاص وقعت رکھتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ زندگی کی اس نئی منزل میں دین و دنیا کی اعلیٰ ترین سربلندیوں اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوں۔ آمین

(فہمیدہ خاتون فرحتؔ معاون خصوصی صنفِ نازک)

محترمہ بہن سعیدہ مظہر صاحبہ حیدر آباد سے اطلاع دیتی ہیں کہ مشہور ادیبہ اور شاعرہ نیز مسافر و صنفِ نازک کی معاون خصوصی محترمہ منیر سلطانہ صاحبہ بہارؔ حیدر آبادی کی شادی خانہ آبادی بتاریخ ۷ مئی سنہ ۱۹۴۲ء جناب عبد الحی صاحب بی اے سے بمقام بلدہ حیدر آباد انجام پائی۔ ادارۂ صنفِ نازک اس تقریبِ مسرت کے سلسلے میں عزیزہ بہن کی خدمت میں دلی مبارکبادیاں اور دعائیں پیش کرتے ہوئے امیدوار ہے کہ بہارؔ بہن بدستور مسافر و صنفِ نازک پر نگاہِ التفات رکھیں گی

"عفتؔ آنولوی نگران اصول ماہنامہ صنفِ نازک"

صنفی بہنوں میں یہ خبر فرحت اثر حد درجہ مسرت و انبساط سے سنی جائے گی کہ میری پیاری بھابی محترمہ ناہید مسعود صاحبہ بیگم عالی جناب سید مسعود حسن صاحب نقوی وکیل سرکار دربار امروہہ کی دخترِ نیک اختر قمر مسعود سلمہا کی پہلی سالگرہ جولائی کے پہلے ہفتے میں بڑی شان و شوکت سے منائی جائے گی۔ جس کے لئے میں اپنی تمام با مذاق اور ادب نواز بہنوں خصوصاً محترمہ ذکیہ سلطانہ محترمہ مضطرؔ رضویہ، محترمہ فہمیدہ فرحتؔ وغیرہ سے مستدعی ہوں کہ وہ اس تقریب سالگرہ پر چھوٹے چھوٹے قطعاتِ مسرت اگر موقعہ ہو تو لکھکر دفترِ صنفِ نازک کو ارسال فرمادیں۔ دعا ہے کہ خداوند تعالےٰ امیدوں کے ہرے بھرے باغ کے اس نو دمیدہ غنچہ کو تا دیر سرسبز و شگفتہ رکھے آمین۔

ناہید مسعود صاحبہ سے شعبہ صنفِ نازک کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کے اظہار کرنے میں باک نہیں کہ آپ نے اس لڑکی کی ولادت کے موقعہ پر بھی رسالہ کو فراموش نہیں کیا تھا۔

"ریحانہ جمال ہاشمی امروہوی رکن ادارۂ صنفِ نازک"

صنعتِ گلکاری
نواب ذکیہ سلطانہ ذکی
مرادآبادی
شاخِ گل پر چڑیاں
چڑیاں عنابی
چونچ عنابی
آنکھ سیاہ
پیٹ سفید
پیر۔ سرخ
تتلی۔ مختلف رنگوں میں
پتے اور ٹہنیاں۔ سبز
زیرہ پھولونکا چاکلیٹ
گلاب
گلاب

خوشنما فلاور باسکیٹ
ذکیہ نگہت بریلوی
جمپر کا گریبان
نواب نادرہ سلطانہ نادر مرادآبادی

1,80000
مسافر

ماہنامہ مسافر مراد آباد

جلد ۳ | فہرست مضامین بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۴ء | نمبر ۱۲

عادل ادیب مہتمم کتب خانہ اسلامیہ پبلشر نے یونین الیکٹرک پریس مراد آباد میں چھپوا کر دفتر رسالہ مسافر واقع اسٹیشن روڈ مراد آباد

ادارہ

ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء سے اگست سنہ ۱۹۴۰ء تک

تاریخ انسانی میں ہر لمحہ اپنی جداگانہ قیمت رکھتا ہے اگر کائنات کی لاکھوں کروڑوں برس کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کو اس لامتناہی مدت میں بیشمار لمحے ایسے ملیں گے جنہوں نے انسانیت کی تاریخ پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا ہے کیا وہ لمحہ جب انسان نے سب سے پہلی مرتبہ فطرت کی عظیم الشان قوتوں کا اندازہ کیا ایک انقلاب انگیز لمحہ نہ تھا۔ کیا وہ ثانیہ دلکش جب انسانی نگاہیں ستاروں کی جگمگاہٹ، پہاڑوں کی وسعت اور سمندروں کی بیکرانی سے آشنا ہوئیں تھیں، ایک تعجب انگیز ثانیہ نہ تھا۔ جس طرح قوموں، سلطنتوں اور ملکوں کی زندگی میں متعدد قیمتی لمحات آتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی انفرادی زندگی بھی ایسے یادگار لمحوں کے وجود سے خالی نہیں ہوتی جو اس کے اعمال و رجحانات کو دھارے کو بدل دیتے ہیں۔ بلاشبہ ہماری زندگیوں میں وہ وقت جب مسافر کے اجراء کے لئے سب سے پہلا قدم اٹھایا گیا تھا ایک نادر اور بیش قیمت وقت تھا۔ یہ وقت ہمیں ابتک یاد ہے اور آج جبکہ ہم مسافر کی پہلی سالگرہ منا رہے ہیں، ہمارے تصور میں وہ نازک اور بہت آزما لمحے بسے ہوئے ہیں جب ہم ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کے پرچے کے لئے ساز و سامان سفر مہیا کر رہے تھے ؎

یاد ایامے کہ عزم کوے لیلےٰ داشتیم

سنہ ۱۹۳۹ء بغیر کوئی امید افزا نقش چھوڑے ہوئے گذر گیا اور سنہ ۱۹۴۰ء کی صبح کائنات ہستی کے افق پر نمودار ہوئی، اور اب سنہ ۱۹۴۰ء بھی اپنی عمر کی آٹھ منزلیں طے کر چکا ہے۔ ان بارہ مہینوں میں مسافر اپنے سفر کی کن کن منزلوں سے گذرا اس کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی دوسری عالمگیر جنگ نے دنیا کی تمام تجارتی سرگرمیوں کا گلا گھونٹ دیا تھا اور بازار میں ہر چیز کی قیمت تقریباً دگنی ہو گئی تھی۔ صحافتی ادارے بھی اس بلائے عام سے محفوظ نہ تھے اور ملک کے مقتدر اخبار و رسائل یا اضافۂ قیمت کی کوشش کر رہے تھے یا تخفیف ضخامت کی تجویزوں میں مصروف تھے۔ مسافر ایک نوخیز پرچہ تھا۔ اگر اس کی کشتیٔ حیات کشمکش و انقلاب کی طوفانی موجوں میں ڈگمگا جاتی تو چنداں تعجب نہ تھا۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم
آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

لیکن . . . . . کیا اس طوفانی دور میں علم و ادب کے اس ناتجربہ کار رہرو کے پائے عزم و ثبات میں جنبش آگئی۔؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارا نہیں بلکہ قدرشناسان مسافر کا فرض ہے۔ مسافر تمام نامساعد حالات کے باوجود برابر ترقی کرتا رہا۔ ہمارے راستے میں مشکلات کے کتنے ہی پہاڑ اور موانعات کے کتنے ہی سمندر حائل ہوئے مگر ہمارا ذوق طلب برابر بڑھتا ہی رہا۔ ابتداء میں مسافر کا شیرازہ

صرف اڑتالیس صفحات پر مشتمل تھا، مگر اب وہ ہر ماہ تقریباً دوگنی ضخامت پیش کر رہا ہے۔ شروع شروع میں ہمارا حلقۂ اشاعت اور دائرۂ اثر شمالی ہند تک محدود تھا۔ مگر آج مسافر کی آواز ہندوستان کے بعید ترین گوشوں تک پہونچ چکی ہے اور مشکل ہی سے ملک کا کوئی گوشہ کوئی شہر یا قصبہ ایسا بچا ہوگا جہاں کے ادبی حلقے مسافر کی قدر و قیمت سے ناواقف ہوں۔ آغاز کار میں مسافر کے خد و خال صنفِ نازک کی جمیل رعنائیوں اور لطیف کرشمہ آفرینیوں سے تہی، دامن تھے، مگر آج مسافر کے نوجوان ادب کے پہلو بہ پہلو نسوانی فکر و نگارش کی معجز نمائیاں اپنی بہار دکھلا رہی ہیں

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

یہ سب کیونکر ممکن ہوا۔۔۔؟ آیئے ہم اپنی شبانہ روز محنتوں اور عرقریز سرگرمیوں کو خود ہی داد دے لیں۔ جب فضائے چمن پر بجلیاں کوندرہی تھیں تب ہم بنائے اشیاں رکھ رہے تھے اور جب ہمصفیروں کے نشیمن طوفانِ بادِ صرصر کی زد میں لرز رہے تھے اس وقت ہم اپنے نشیمن کے لئے تنکے چن رہے تھے۔

بنائے خانہ نہادیم بر گذرگہِ باد

گو یہ صحیح ہے کہ اس صبر آزما مدت میں ہمیں ہر قدم پر مالی، دماغی اور جسمانی ایثار کرنا پڑا۔ ہر منزل پر اپنی، بے بضاعتیوں اور تہی دامنیوں کا اندازہ ہوا، مگر جس قدر راستے کی دشواریاں بڑھتی تھیں اسی قدر عزم میں صلابت اور ارادے میں پختگی پیدا ہوتی تھی۔ اور بالآخر وہ وقت بھی آ پہونچا کہ ہم آپ کو نئے سال کی خوشخبریاں سنائیں

بیا کہ دورِ خزاں رفت و عہدِ گل آمد

سالِ نو:- نئے سال کے لئے ہمارے دل میں امیدوں اور امنگوں کا ایک بے پناہ سمندر کروٹیں لے رہا ہے مگر کیا کریں۔۔۔؟ انسانیت کی فضا پر قتل و غارت کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ تجارتی مرکزوں میں سناٹا ہے اور دنیا کے تمام کاروبار معطل ہو کر رہ گئے ہیں اور ابھی یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صورتِ حال کب تک برقرار رہے گی۔۔۔؟ اس لئے سردست کوئی پیشین گوئی دشوار ہے تاہم یہ یقین فرمایئے کہ اگر غیر معمولی حالات نہ پیدا ہوئے تو مسافر آپ کو مایوس نہ کرے گا۔ اسی کے ساتھ یہ چیز بھی نظر میں رہے کہ مسافر صرف ۲ روپیہ سالانہ میں (جس میں تین آنے محصولڈاک کے بھی شامل ہیں) تقریباً ایکہزار صفحات کا علمی، ادبی اور افسانوی لٹریچر آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے

قدردانانِ مسافر سے

ختم سال پر ہمیں قدردانانِ مسافر سے مزید قدردانی اور ہمت افزائی کی توقعات وابستہ ہیں۔ جن جن حضرات و خواتین کا چندہ اس مہینے میں ختم ہو رہا ہے امید ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ سال آئندہ کے لئے تجدیدِ سرپرستی فرمائیں گے بلکہ اپنے دیگر احباب کو بھی مسافر نوازی کی طرف توجہ دلائینگے مسافر چونکہ ایک ادارے کا پرچہ ہے بنابریں اس کی خریداری "ہم خرما و ہم ثواب" کی مصداق ہے

مسافر کے اربابِ قلم

مسافر کے اربابِ قلم کا شکریہ ادا کرنا ہمارا ادبی فرض ہے جنکی مسلسل دماغی کاوشوں اور پیہم ادبی کوششوں سے مسافر اپنا موجودہ معیار حاصل کر سکا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں ہمارا آئندہ پروگرام حد درجہ شاندار اور قابلِ اطمینان ہے تاہم جب گذشتہ اشاعتوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہمیں

کوششوں کا ہمیں خود بھی اعتراف ہونے لگتا ہے۔ یقیناً ادبی اعتبار سے مسافر کا معیار روز بروز بلند تر ہوتا گیا۔ اسی ضمن میں یہ تجویز بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ادارۂ مسافر کی طرف سے اُن تمام گیتوں، نظموں، کہانیوں اور مضمونوں کا ایک مجموعہ شائع کردیا جائے جو اَب تک اس کے اوراق کی زینت بن چکے ہیں۔ مثلاً سید محمد تقی کا تاریخی مضمون "گذشتہ جنگِ عظیم پر ایک نظر" عادل ادیب کا مشہور رُومانی افسانہ "ناکام محبت"۔ ہزہائی نس کے خطوط اور کوکبؔ صاحب کا شیرازۂ تغزل وغیرہ۔ اس کے علاوہ دیگر حضرات کی خدمات میں بھی ہمیں اِن کی مسلسل کوششوں اور ادبی نوازشوں کے لئے ہدیۂ تشکر پیش کرنا ہے۔

رونق محفل ماز ہیں سب ارباب وفا ست

دفتر مسافر کو مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) کی ایک روداد بغرض تبصرہ وصول ہوئی ہے جس کے متعلق کوکبؔ صاحب نے حسب ذیل الفاظ میں اپنے خیالات کی ترجمانی فرمائی ہے۔ غالباً ادارۂ مسافر کے جذبات کی نمائندگی کے لئے اِس سے بہتر الفاظ مل بھی نہ سکتے تھے۔ (مدیر)

صدائے حرم

سنہ ۱۳۶۳ھ اور سنہ ۱۳۶۶ھ میں سفرِ مبارکِ حج کے موقعہ پر مجھے "مدرسہ صولتیہ (مکہ مکرمہ)" کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہ شاندار ادارہ مجاہد اسلام حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے مقدس جذبۂ ایمانی اور علمی و اسلامی ذوق کا بے نظیر کارنامہ ہے۔

چھیاسٹھ سال سے یہ ادارہ مرکز اسلام پر علم و عمل کے دریا بہا رہا ہے۔ جس سے ہزارہا تشنگان علوم و معرفت سیراب ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنی اس علمی اور دینی یادگار کے تحفظ و بقا کیلئے دامے، درمے اور سخنے کوشش شروع کردیں۔ اِس ادارے کی زندگی ہندی مہاجرین کیلئے کتنی ضروری ہے۔ اسکا اندازہ وہی حضرات فرما سکتے ہیں جنھوں نے بچشم خود اس کی زیارت کی ہے۔ یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ باوجود اخراجات میں حد درجہ تخفیف و تنسیخ کے چودہ ہزار روپیہ اِس ادارے پر قرض ہے۔ درحقیقت کارکنانِ ادارہ کی ہمت و اولوالعزمی قابلِ تحسین ہے کہ وہ اتنے ناخوشگوار حالات میں اتنے عظیم الشان ادارے کو چلا رہے ہیں۔ اسلامیان ہند کو اسکی امداد و اعانت کی طرف متوجہ کرنے کیلئے مرکزی دفتر کی طرف سے قرولباغ دہلی میں ایک شاخ قائم کردی گئی ہے۔ ارباب خیر و کرم نہ صرف یہ کہ مدرسے کے متعلق جملہ لٹریچر اِس پتے سے طلب فرما سکتے ہیں بلکہ اپنے عطیات بھی ترسیل فرما سکتے ہیں۔ پتہ حسب ذیل ہے :-

"حافظ ضیاء الدین احمد صاحب معتمد صدر دفتر مدرسہ صولتیہ قرول باغ دہلی"

(کوکبؔ عفی عنہ)

پھر آج آپ کے خط کا جواب دیتی ہوں		اب اس کے بعد سوال و جواب ناممکن
پھر آج دعوت شعر و شباب دیتی ہوں		اب اس کے بعد پیام شباب ناممکن
نہیں ہیں کیا مری مجبوریاں نگاہوں میں		میں اور سیر شب ماہتاب ناممکن
سکون درد کا پنہاں ہے راز آہوں میں،		میں اور نغمۂ چنگ و رباب ناممکن
نہیں نظارۂ صحن چمن نہیں منظور!		بہل سکے غم خانہ خراب ناممکن
نہیں حکایت شعر و سخن نہیں منظور		سنبھل سکے دل وحشت مآب ناممکن
ہے میرے دوش پہ دوشیزگی کا بار گراں		عروس گل سی بھی میں بے حجاب ناممکن
ہے میری عصمت و پاکیزگی بہار جواں		میں اور رخ سے اٹھاؤں نقاب ناممکن
غلط نہیں کہ مری بارگاہ جلوہ تک		رسائی نگہ انتخاب ناممکن
غلط نہیں کہ مری خلوت تمنا تک		شعاع مہر بھی ہو باریاب ناممکن
کسی کے درد سے میں مضمحل ارے توبہ		کسی کے غم سے مجھے اضطراب ناممکن
میں اور شمع صفت مشتعل ارے توبہ		شمیم گل کی طرح پیچ و تاب ناممکن
میں اور آپ کی خلد طرب بساؤنگی		یہ خواب وہ ہے کہ تعبیر خواب ناممکن
میں اور آپ کا درد طلب مٹاؤنگی		یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ناممکن

شباب رفتہ فصل بہار بھول چکی
ہزار بار نہیں لاکھ بار بھول چکی

پھر آج سلسلہ جنبانِ آرزو ہے کوئی
ابھی تو ربطِ سوال و جواب ممکن ہے

پھر آج محوِ گلستانِ رنگ و بو ہے کوئی،
ابھی تو دعوتِ شعر و شباب ممکن ہے

مری جہانِ نشاط و طرب کی نورِ جہاں،
بہل سکے غمِ خانہ خراب ممکن ہے

مری بہشتِ جنون و طلب کی حورِ جواں
سنبھل سکے دلِ وحشت مآب ممکن ہے

ہزار پردۂ بیگانگی ہو حدِ نظر"
شکستِ رشتۂ بندِ نقاب ممکن ہے

ہزار دعوئے دوشیزگی ہو مدِ نظر
حصولِ لذتِ عہدِ شباب ممکن ہے

کسی کی حسرتِ ناکام کی پذیرائی
مری حسینۂ عصمت مآب ممکن ہے

ہلاکِ گردشِ ایام کی مسیحائی"
مری ادیبۂ مریم خطاب ممکن ہے

نہ مطمئن ہو خدارا فلک کی گھاتوں سے
کسی کے غم سے تجھے اضطراب ممکن ہے

خدا پناہ میں رکھے جنوں کی ہاتھوں سے
شمیمِ گل کی طرح پیچ و تاب ممکن ہے

ترے شبابِ خود آرا کی شوخیوں کی قسم
رسائیِ نگہِ انتخاب ممکن ہے

ترے غمِ طرب افزا کی مستیوں کی قسم
علاجِ حسرتِ ناکامیاب ممکن ہے

نہیں نہیں مجھے مایوسِ التفات نہ کر
یہ خوابِ دہ ہی کہ تعبیرِ خواب ممکن ہے

نہیں نہیں مجھے بیگانۂ حیات نہ کر
یہ وہ سوال ہے جسکا جواب ممکن ہے

تو میرے غم سے نہ ہو دل فگار ناممکن"
ہزار بار نہیں لاکھ بار ناممکن"

ریشم جیسا نازک و ملائم جسم، پھول جیسے حسین و شگفتہ رخسار، جادو جیسی دل آویز آنکھیں، شراب جیسی بدمست ادائیں...... یہ تھی ماتاہری۔ جس نے برطانیہ اور فرانس کی بہادر و جنگ آزما فوجوں کو اپنے اشارہ چشم و ابرو سے بچار رکھا تھا۔ وہ خود بھی رقاصہ تھی۔ اتنی سحر جمال رقاصہ کہ کوئی شخص اس کے ساحرانہ رقص کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ وہ جرمنی کی تمام فوجوں، تمام جنگی قوتوں اور تمام آتشیں ہتھیاروں سے کہیں زیادہ خطرناک اور ناقابلِ تسخیر تھی۔ ہزاروں سپاہی اس کی قاتلانہ اداؤں کے سامنے سپر انداختہ تھے۔ ماتاہری...... ماتاہری کا نام ہی فتح و کامیابی کی ضمانت تھا۔ مگر قدرت زیادہ عرصے تک اس "فتنۂ روزگار" کو آزاد چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ آخر ایک روز موت کے فرشتے نے اس "خونریز نازنین" کو آ دبوچا اور وہ بھی ٹھیک اس وقت جب وہ اپنی پیہم کامیابیوں اور لشکر شکنیوں کے فاتحانہ نشے میں چور کسی دوسری خطرناک مہم کے لئے اپنی ساحرانہ قوتوں کا استعمال کرنے والی تھی۔ ماتاہری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ابھی بہت کچھ لکھنے کو باقی ہے۔ ذیل کا مختصر سا سنسنی خیز مقالہ اسی سلسلہ کی ایک ہوشربا کڑی ہے......
....

(رئیس)

ٹھیک اس وقت جبکہ یورپ میں جرمنوں اور اتحادیوں کے درمیان ایک خونریز جنگ کا آغاز ہوا تھا اور قیصر کی جابر فوجیں نامورکور، اڈی ورپ، لیج اور مشرقی فرانس کے فولادی قلعوں پر لانگ برتھا جیسی اژدر دہاں توپوں کی مدد سے آگ برسا رہی تھیں۔ یورپ کی دو حسین ترین دوشیزائیں جاسوسی کا خوبصورت مگر خطرناک لباس پہنکر میدان میں آئیں۔ ایک انگریز دوشیزہ "ایڈتھ کیول" دوسری فرنچ حسینہ ماتاہری۔ ایڈتھ کیول برطانیہ کے مشہور محکمۂ جاسوسی کی مقرر کردہ تھی۔ رہی ماتاہری تو اس کا نام برلن کے شعبۂ خفیہ میں H.15 کے مبہم اشاروں میں لکھا ہوا تھا۔ ایڈتھ کیول بھی حسین تھی کم از کم اتنی حسین کہ انگلستان میں اس کا جواب نہ تھا۔ مگر ماتاہری اسکا ذکر کرنا ہی بیکار ہے۔ وہ اتنی شر انگیز تھی کہ قیصر نے اتحادیوں کی پچاس لاکھ کار آزمودہ جنگجو اور سنگدل فوجوں کو اپنی ساحرانہ اداؤں سے زیر کرنے کیلئے اس دربا لڑکی کو چنا تھا۔ ایڈتھ کیول چند روز بعد ہی گولی سے اڑا دی گئی کیونکہ جرمن جاسوسوں نے اس کی خفیہ

سرگرمیوں کا پتہ چلا لیا تھا۔ البتہ ابھی ماتا ہری زندہ تھی کیونکہ قسمت نے اُسے ہزاروں زندگیوں سے کھیلنے کے لئے بنایا تھا۔

ماتا ہری کی زندگی اور موت پر افسانوں اور کہانیوں کا دھندلا سا غبار چھایا ہوا ہے۔ ہر ملک میں اس کے متعلق بےشمار افواہیں مشہور ہیں کوئی کہتا ہے کہ اب تک وہ زندہ ہے اور قیصر جرمنی اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ انگریزوں نے اسے جنوبی افریقہ کے بھیانک جنگلوں میں جلا وطن کر دیا ہے اور وہ اب تک کسی وحشی اور بت پرست قبیلے پر ایک دیوی کی حیثیت سے حکمراں ہے۔ بعض عجائب پرستوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک ہندوستانی لڑکی تھی۔ اور اس نے اپنے مشہور عالم رقص کی تعلیم ہندوستان کے کسی مندر میں حاصل کی تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ماتا ہری جنوبی ہند کے کسی مٹھ میں دیوداسی (داسی) کی حیثیت سے برسوں رہی ہے اور اس نے رقص و نغمے کے تمام کمالات ہندوستانی یوگیوں سے حاصل کئے ہیں۔ درحقیقت ان افواہوں کا سبب یہ ہے کہ "ماتا ہری" کے نام میں ہندوستانی ناموں کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ حیرت انگیز ساحرہ سنہ ۱۸۷۶ء میں ہالینڈ کے کسی شہر میں پیدا ہوئی۔ اس کا اصلی نام "مارگریتا گیرٹروڈا زیلے" تھا۔ اس کا باپ ہیٹ بنانے کے ایک چھوٹے سے کارخانے کا مالک تھا۔ مارگریتا چودہ سال کی ہی تھی کہ وہ ماں کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئی۔ باپ نے اسے ایک مقامی اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہاں اسکول کا منیجر اس پر بری طرح مر مٹا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے ماتا ہری کے عالم آشوب حسن کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مارگریتا نے محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اور اس طرح عنفوانِ شباب ہی میں اس کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ سترہ سال کی عمر میں مارگریتا نے "رودلف میکلاؤڈ" نامی ایک فوجی افسر سے شادی کر لی۔ رودلف عمر میں ماتا ہری سے چوبیس سال زیادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں نہ بنی۔ اور ماتا ہری نے تنگ آ کر اپنے سن رسیدہ شوہر کو چھوڑ دیا چونکہ قدرتی طور پر اس کا رجحان رقص و نغمہ کی جانب تھا۔ اس لئے اس نے ایک جاوی اُستاد سے رقص کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اور اپنا نام "ماتا ہری" رکھا جس کے معنی جاوی زبان میں ہیں۔ . . . . . "دن کی آنکھ" یہ عجیب و غریب نام اور اس کی شہرت کا باعث ہوا۔ ہندی میں آپ اُسے "اُمِّ صحرا" (بن ماتا) کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہ فرانس چلی گئی۔ اور پیرس کے حسن پسند حلقے چند ہی روز میں اس کے فتحمند حسن و شباب کے سامنے مغلوب ہو گئے۔

اسی زمانے میں اس کا تعارف جرمنی کے ایک شہزادے سے ہوا۔ اور یہی شاہزادہ بالآخر اُسے قیصر کے محکمۂ جاسوسی میں داخل کرانے میں کامیاب ہوا۔ یورپ کے مشہور جاسوس نیشی کیروُ نے ماتا ہری کے محکمۂ جاسوسی میں داخل ہونے کی ایک دلچسپ کہانی لکھی ہے، وہ لکھتا ہے کہ:۔

ایک روز میں پیرس کے ایک جلسے میں شرکت کر کے اپنے مکان کو واپس جا رہا تھا۔ اس جلسے میں امداد حیوانات کے موضوع پر تقریریں کی گئیں تھیں۔ رات اندھیری اور بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں اپنے گرم اوورکوٹ میں سکڑا سکڑایا تیزی کے ساتھ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ تاکہ جلد از جلد کسی محفوظ مقام پر پہونچ جاؤں۔ کہ اچانک میری نظر ایک نوجوان لڑکی پر پڑی۔ جو نارنجی کپڑے پہنے ہوئے کانپتی لرزتی ایک طرف کو چل رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ آجکل کی نوجوان لڑکیاں اپنے خوبصورت جسم کی نمائش کے لئے

اتنی مضطرب رہتی ہیں کہ کڑاکے کا جاڑا گوارا ہے مگر کافی کپڑے
پہننے گوارا نہیں ۔ لیکن کچھ دور چلنے کے بعد جب میں نے اُس
عورت کو سڑک کے کنارے آگ جلا کر بیٹھے ہوئے مزدوروں
کے پاس اپنا گداز و دلفریب جسم گرم کرتے دیکھا تو میری حیرت
کی انتہا نہ رہی ۔ اب میں سمجھا کہ یہ کوئی مصیبت زدہ ہے پھر
میں نے خیال کیا کہ . . . . تو میں کیا کروں ؟ اور میں
تیزی سے آگے بڑھ گیا ۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس تقریر
کے وہ لفظ مجھے یاد آئے جو کچھ دیر قبل میں نے سنی تھی "
جانوروں پر رحم کرنا بھی ہمارا فرض ہے " اب میں قدم
آگے نہ اُٹھا سکتا تھا ۔ مجبوراً پیچھے لوٹا اور کچھ جھجک کر اس
لڑکی سے جو اب بھی مزدوروں کے قریب بیٹھی ہوئی گرم آنچ
سے فائدہ اُٹھا رہی تھی ، میں نے کہا :-

مادام ! مجھے معاف کیجئے ، کیا میں اس سرد و تاریک
رات میں آپ سے اپنے غریب خانے پر قیام کی درخواست
کر سکتا ہوں ؟

تم نے کیا مجھے بازاری عورت سمجھ رکھا ہے ؟ اس
نے بگڑ کر کہا ۔

"نہیں میں ایک شریف آدمی کی طرح آپ سے
ہمدردی رکھتا ہوں ۔ اور اسی لئے میں نے آپ سے یہ دعوت
کی ہے ۔ اگر آپ میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کریں تو آپ کو اس
فیصلے پر مایوس نہ ہونا پڑیگا "

میرے بے تکلفانہ انداز نے اس پر خوشگوار اثر ڈالا اور
وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ جب ہم دونوں آتش دان سے
گرمائے ہوئے اور بجلی سے جگمگاتے ہوئے کمرے میں پہونچے
اور اس نے اپنا باریک سموری کوٹ اُتارا تو میری حیرت کی
کوئی انتہا نہ رہی ۔ ارے وہ توقاف کی روایتی پریوں سے
بھی زیادہ دلفریب اور خوش جمال تھی ۔ شب میں ماتا ہری نے
مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی ۔ وہ پیرس والوں سے بالکل
مایوس ہو چکی تھی ۔ کیونکہ اس کا انوکھا ، پیچیدہ اور پراسرار
رقص اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ البتہ ماتا ہری کے حسن و
شباب کے خریداروں کی تعداد روز افزوں ترقی پر تھی ۔
پیرس والے اس کی ایک ایک ادا پر ہزاروں فرانک لٹانے
کو طیار تھے ۔ یہ چیز خود ماتا ہری کو پسند نہ تھی ، کیونکہ اس کو
وہ اپنے کمالِ فن کی توہین سمجھتی تھی ۔ اسی دوران میں
ایک روز ماتا ہری کو پیرس کی کسی رقصگاہ میں ناچنے کا موقع
دیا گیا ۔ وہ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ناچی ۔ لوگوں
نے اس کے بلاخیز حسن کی جی کھول کر تعریف کی ۔ مگر رقص
. . . . کسی نے رقص کی تعریف میں ایک حرف بھی نہ کہا
کیونکہ اس کا فن عوام کی دسترس سے باہر تھا ۔ نتیجے میں
تماشا گاہ کے منیجر نے اسے سیٹ پر چلے جانے کا حکم دیا ۔
اور ماتا ہری غصے میں لال ، آنکھوں میں آنسو بھرے سسکیاں
لیتی ہوئی اپنی کرسی پر آبیٹھی ۔ حسنِ اتفاق سے اس کے
بالکل قریب ہی ایک جرمن کاؤنٹ اور اس کی لیڈی بیٹھی
تھی ۔ رحمدل لیڈی نے جب اس باکمال رقاصہ کو روتے
ہوئے دیکھا تو انتہائی تسلی آمیز لہجے میں کہا :-

"بیدتمیز فرانسیسی تمہارے آرٹ کی قدر نہیں کرسکتے
تم برلن چلو وہاں تمہارے فن کی قدر ہوگی "

چنانچہ کچھ دنوں بعد ماتا ہری واقعی برلن چلی گئی ،
جہاں اسکا تعارف قیصر ولیم اور دیگر اراکین حکومت سے
کرایا گیا ۔ قیصر نے پہلی ہی نظر میں ماتا ہری کی فتنہ انگیز
طاقتوں کو بھانپ لیا اور متعدد آزمائشوں کے بعد اسے
اپنے خفیہ محکمہ میں داخل کرلیا ۔ اس زمانے میں ماتا ہری
یورپ میں بہ حیثیت ایک فن کار رقاصہ کے مشہور ہو چکی
تھی ۔

آغازِ جنگ

قیصر جرمنی ۱۹۰۹ء سے قوت آزمائیوں کی طیاریاں کررہا تھا۔ جب ۱۹۱۴ء آیا تو یورپ کے افق پر جنگ اور خون کے بادل غلیظ تر ہوگئے اور اچانک اگست ۱۹۱۴ء میں ناکردہ گناہ بلجیم پر بجلی گر پڑی۔ ماتاہری جرمنی کے طوفانی دستوں کی آڑ میں بلجیم میں داخل ہوئی۔ اور کچھ دن وہاں رہ کر فرانس پہنچ گئی۔ اور مارگریٹ جیلی کے نام سے پیرس میں رہنے لگی۔ اس وقت اس کے ٹھاٹ قابلِ دید تھے پیرس کی خفیہ پولیس کو اس پر شبہ ہوا۔ اور اس نے خفیہ طور پر نقلی مارگریٹ کے حالات کی چھان بین شروع کی اور پتہ لگایا کہ وہ عرصے سے جرمنی کے محکمۂ جاسوسی سے وابستہ ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ آغازِ جنگ میں وہ ڈچ سفیر کے مکان سے جرمنی کے محکمۂ اطلاعات کو خبریں روانہ کرتی تھی۔ چنانچہ ماتاہری کی نقل و حرکت پر خفیہ پہرہ لگا دیا گیا۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ اس کی سرگرمیوں سے واقف نہ ہو سکے ۱۹۱۶ء میں اس نے فرانسیسی حکومت سے التجا کی کہ اسے وتال نامی مقام پر جو کہ محاذِ جنگ کے قریب ہے رہنے کی اجازت دی جائے حکومت خود اس کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ وتال بھیج دی گئی۔

پہلی محبت

وتال میں ایک طرف تو وحشی انسانیت درندوں کی طرح اپنے فرزندوں کا خون بہا رہی تھی اور دوسری طرف ماتاہری ایک فوجی آفیسر سے جو فوجی ہسپتال میں زیرِ علاج تھا ایثار و محبت کے درس لے رہی تھی وہ ایک مجروح فرنچ افسر تھا۔ ماتاہری کا بیان ہے کہ اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں اگر کسی مرد کو دل دیا ہے تو وہ یہی خوش نصیب انسان تھا۔

۱۹۱۶ء کے آخر میں فرانسیسی جنرل اسٹاف نے طے کیا کہ اسے وتال سے نکال دیا جائے۔ اس پر ماتاہری نے بگڑ کر کہا:۔

"معلوم نہیں آپ لوگ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ میں کیسے بتاؤں کہ مجھے فرانس سے کتنی محبت ہے مجھے فرانس کی خدمت کا موقعہ دیجئے۔ یاد رکھئے کسی وقت جرمنی کا ایک شاہزادہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اب بھی اس کے دل میں میری محبت کی چنگاری روشن ہوگی یقین کیجئے میں اگر اب بھی برلن چلی جاؤں تو آپ کے بہت کام آسکتی ہوں۔

فرانس کے فوجی افسروں نے اس کی تجویز منظور کر لی اور طے کیا کہ اسپین کے راستے سے اس کو جرمنی بھیجدیا جائے۔ مگر ماتاہری سوئٹزرلینڈ ہوکر برلن پہونچنا چاہتی تھی کافی بحث و تمحیص کے بعد اسے اسپین کے لئے روانہ ہونا پڑا وگو پہونچکر وہ ڈچ جہاز "ہالینڈیہ" میں سوار ہوگئی، مگر انگریزی بندرگاہ ساؤتھمپٹن پر برطانوی افسروں نے اس کی تلاشی لی۔ اور پھر اسے اسپین واپس کر دیا۔

ماتاہری اسپین پہونچ کر پھر اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئی، مگر اب بدقسمتی کے دن قریب تھے۔ ایک روز جرمنی کے سفیر کو ہدایت ملی کہ وہ ماتاہری سے کہے کہ وہ میڈرڈ کے.... فلاں... بنک سے پانچ ہزار فرانک لے لے۔ بدقسمتی سے یہ بنک فرانسیسی تھا۔ ماتاہری نے مطلوبہ رقم تو وصول کر لی۔ البتہ بنک کے کارپرداز اس سے مشتبہ ہوگئے۔ مصیبت پر مصیبت یہ ہوئی کہ اسی دوران میں ماتاہری کا ایک پیغام (کوڈ) پکڑا گیا جو اس نے جرمن گورنمنٹ کو بھیجا تھا۔ اس نے اس پیغام میں حکومت جرمن کو اپنی سرگرمیوں کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ فرانسیسی حکومت کی جاسوس بن گئی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ۱۰ فروری ۱۹۱۷ء کو گرفتار کر لی گئی اور برابر آٹھ مہینے تک اس پر مقدمہ چلتا رہا۔ اور تحقیقات ہوتی رہی یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۱۷ء میں فرانس کی فوجی عدالت نے

اس دلربا نازنین کے لئے سزائے موت کا حکم تجویز کر دیا۔

الوداعی ناچ

ماتاہری نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ موت کا حکم سنا اور ججوں سے درخواست کی کہ وہ آخری وقت اسوا اپنے محبوب سے ملنے کی اجازت دیدیں۔ یہ وہی خوبصورت فرنچ کپتان تھا جو نال کے شفاخانے میں اس ساحرۂ یورپ کے حضور میں دل و جان کو نذر کر چکا تھا۔ کپتان جب اس سے ملنے کے لئے جیل کی کوٹھری میں پہونچا تو وہ فرط مسرت سے ناچنے لگی۔ بوجھل زنجیروں میں اسکا خوبصورت جسم جکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ ناچ رہی تھی۔ پتھریلے فرش پر اس کے ملائم پاؤں پھسلے جا رہے تھے۔ مگر وہ ناچ رہی تھی۔ موت کا ہیبتناک فرشتہ اس کے سامنے اپنے پر پھیلائے کھڑا تھا، مگر وہ ناچ رہی تھی کتنا دلفریب رقص۔ کتنا پر سوز ناچ اور کس قدر عبرتناک نظارہ

تھوڑی دیر میں غضبناک جلاد جیل کی کوٹھری میں داخل ہو کر بھیانک لہجے میں پکارا۔ ۔ ۔ ۔ وقت ختم ہو گیا۔

ماتاہری نے مسکرا کر نہایت لطیف آواز میں اس کی تردید کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں وقت آگیا۔

اور وہ بے خوفی کے ساتھ رائفلوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا محبوب اب بھی اس کے سامنے تھا۔ سامنے میدان میں ہزاروں تماشائی سہمے ہوئے اس پر ہول نظارے کو دیکھ رہے تھے۔ ماتاہری نے ہندوستانی طریقے پر ہاتھ جوڑ کر آخیر نمسکار کی۔ اور اچانک چند گولیاں ایک ساتھ سر ہوئیں اور دھوئیں کا غلیظ بادل ہر طرف پھیل گیا۔ اس تاریک دھوئیں کے پیچھے ماتاہری کا خوبصورت جسم خاک و خون پر پڑا تھا صرف ایک ہی گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔ مگر ہاں چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ تھی۔ خاموشی کے ساتھ محو تعجب کپتان آگے بڑھا اور ماتاہری کے بے حرکت جسم پر جھک کر کہنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مارگریٹ سو گئیں ۔ ۔ ۔ !

اور واقعی اس کی مارگریٹ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سو گئی تھی

ماتاہری کا افسانہ دوسری طرح بھی بیان کیا گیا ہے یہ ایک برطانوی جاسوس (Z. Z) کا بیان ہے

"یہ فوجی افسر ماتاہری کو بری طرح چاہتا تھا۔ اور بالآخر یہی اسکا قاتل ثابت ہوا، ہم اس دلچسپ مگر دل ہلا دینے والی داستان کو پھر کبھی بیان کریں گے۔

ہر لحظہ مئے غم مرے پینے کے لئے ہے
اک شکل تو آرام سے جینے کے لئے ہے
ساقی نہ دکھا مجھ کو چھلکتا ہوا ساغر!
پینے کے لئے دے کہ یہ پینے کے لئے ہے
جینا نہ ہو جس کو اسے دنیا سے غرض کیا،
دنیا جسے کہتے ہیں وہ جینے کے لئے ہے
دریائے محبت کا تموج کہ تلاطم ״ ״
جو کچھ بھی ہو مرے ہی سفینے کے لئے ہے
بیمار محبت کا کچھ انجام بھی ہوگا،
کم بخت نہ مرنے کے نہ جینے کے لئے ہے
اک راز ہے نادک بھی ترا اب تو بہر حال
دل کے لئے ہے یا مرے سینے کے لئے ہے
ہے جو مرا آئینۂ دل صرف محبت !!
ناوک یہ کدورت کے نہ کینے کے لئے ہے

شاعرِ شباب — حیاتؔ امروہوی

کالی گھٹا

مستیوں میں جھومتی پھر آ گئی کالی گھٹا
کیف بنکر آسماں پر چھا گئی کالی گھٹا

گاتی ہوا کے دوش پر
ناز خودی کے جوش پر
فطرت کے عقل و ہوش پر
شرم سے پھر ناچتی گاتی ہوا کے دوش پر
پھر چڑھا کر حوصلے ناز خودی کے جوش پر
پھر گرا کر بجلیاں فطرت کے عقل و ہوش پر
بے خودی ہی بے خودی برسا گئی کالی گھٹا

چھائی ہوئی گھنگھور ہے
کوکو کا پیہم شور ہے
ٹھنڈی ہوا کا زور ہے
اک جواں انداز سے چھائی ہوئی گھنگھور ہے
پی کہاں کے ساتھ میں کوکو کا پیہم شور ہے
یہ حسیں جھونکے ہیں یہ ٹھنڈی ہوا کا زور ہے
عشق کیا حسن کو بہکا گئی کالی گھٹا!

میری شریکِ غم بنی
اسرار کی محرم بنی
اک دیدۂ پُر نم بنی
ترجمانِ دل بنی، میری شریکِ غم بنی
اضطرابِ عشق کے اسرار کی محرم بنی
ماتم زدہ نے کے لئے اک دیدۂ پُر نم بنی
میرے ہنسنے سے مگر شرما گئی کالی گھٹا

بھیگی ہوئی برکھا کی رات
مخمور ساری کائنات
بیہوش و بیخود ہے حیاتؔ
قسمت بیدار تھی بھیگی ہوئی برکھا کی رات
نشۂ ارماں سے تھی مخمور ساری کائنات
کیا بتائیں آج کیوں بیہوش و بیخود ہے حیاتؔ
اک سنہری داستاں دہرا گئی کالی گھٹا!

نینی تال　　۱۰ مئی سنہ ۱۹۴۰ء

(سیورے)

خاتون گرامی!

کیسا عجیب اتفاق ہے کہ جونہی میں نے یہ ارادہ کیا کہ آپ کو تاخیرِ جواب کے لئے لکھوں، ملازم نے مجھے آپکا گرامی نامہ دیا۔ جو اسے دوپہر کی ڈاک سے ملا تھا۔ آپ نے مجھے حسن افسانہ کی مبارکباد دی ہے، بدقسمتی سے وہ خود مجھے پسند نہیں۔ اس لئے میں حیران ہوں کہ آپ کی مبارکباد کو کس صرف میں لاؤں؛ بہرحال وہ مبارکباد ابھی تک میرے پاس بجنسہٖ محفوظ ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو واپس کردوں۔ ورنہ اپنے پاس رکھ چھوڑوں جب کسی موقعہ پر کوئی بہترین افسانہ یا نظم لکھ سکونگا تو آپکی مبارکباد کارآمد ثابت ہوگی۔ خوش قسمتی سے آپ نے اس خط میں افسانہ نگاری پر بھی نظر ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ بہترین افسانے کی علامت یہ ہے کہ وہ آپ بیتیوں اور اپنی سرگذشتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق ہے۔ اس کے بعد آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ افسانوں کے اندر سے فحش و عریانی کا عنصر نکال دینا چاہیئے اور اس کی بنیاد خالص اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنی چاہیئے۔

عزیز خاتون!

میں سختی کے ساتھ آپ کی اس رائے سے اختلاف کرتا ہوں۔ افسانوں، نظموں، گیتوں اور دوسری فن کارانہ تخلیقات کے لئے کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ آپ کسی شاعر سے یہ امید نہیں کرسکتیں کہ وہ نظم لکھتے وقت کسی اخلاقی یا اجتماعی مقصد کو پیش نظر رکھے۔ آپ اسکو آزاد چھوڑ دیجئے اور لکھنے دیجئے۔ بعید نہیں ہے کہ اس کی پرجوش نظمیں ضمنی طور پر آپ کے کسی مقصد کو پورا کردیں۔ اس قسم کے شاعر یا مصنف جو کسی ذہنی اور دماغی دباؤ سے مجبور ہو کر کچھ لکھتے ہیں اُن کی مثال اس پرندے کی سی ہوتی ہے جو انسانوں کی بولیوں کی نقل اُتارتا ہے مگر خود اُن کو سمجھتا نہیں۔

ہمیں افسانہ نگاروں کو واعظ یا مصلح نہیں سمجھنا چاہیئے ایک افسانہ نگار اور واعظ کے فرائض میں بیّن فرق ہے۔ لہٰذا آپ کا یہ کہنا کہ ہمیں اپنے افسانوں اور کہانیوں کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنا چاہیئے۔ فن اور آرٹ کے ساتھ ظلم کرنا ہے

آپکا مخلص

خاتون محترم!

برف آلود پہاڑوں کے سنگین ستونوں کے سایہ میں بیٹھ کر کبھی کبھی انسانی تخیل اس قدر آوارہ اور گم کردہ راہ ہوجاتا ہے کہ ہمیں اپنی گذری ہوئی گذرتی ہوئی اور گذرنے والی زندگی تقریباً بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام کرۂ ارض سمٹ کر ایک دھندلا سا سیاہ نقطہ بن گیا ہے۔

جس میں امید و بیداری کی کوئی ہلکی سی چمک تک موجود نہیں۔

آج میں سندھیا کے جھرنے کے پاس بیٹھا ہوا پتھروں کی دراڑوں اور چٹانوں کے شگافوں سے پانی کو ابلتے ہوئے مچلتے ہوئے، سر پٹکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شفاف پانی بار بار رہ رہ کر تھم تھم کر پہاڑ کے سینے سے ابلتا تھا اور دھا کے کیا تھ دور تک بہتا چلا جاتا تھا۔ سنا جاتا ہے کہ یہ ہزاروں فٹ نیچے جا کر گرتا ہے اور آگے چل کر ایک ذخار دریا میں تبدیل ہو گیا ہے۔ . . . میں سوچ رہا تھا کہ قدرت کا قانون ہر جگہ یکساں اور ہموزن ہے۔ کیا انسانی زندگی، اپنی نشو و نما اپنے ظہور اور اپنی ترقی میں ایک ایسے ہی کوہستانی چشمے کی مانند نہیں ہے جو عناصر اور قدرتی طاقتوں کے ہاتھوں زندگی اور کائنات کی سطح سے پھوٹ پڑا ہے اور ابدیت کے راستے پر بے روک ٹوک بہا چلا جاتا ہے۔ واقعی اگر ہم پوری کائنات کا تجزیہ اور دقیق مطالعہ کریں تو ہمیں اس نظام ہستی کے تمام اجزاء اور عناصر میں ایک نمایاں مشابہت نظر آئے گی۔

محترم خاتون!

اِن ہی چند لفظوں میں آپ کے اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے جو آپ نے اس عبارت سے شروع کیا ہے کہ

صحیح اور با اصول زندگی بسر کرنے کیلئے مطالعہ کائنات کیوں ضروری ہے؟

آیئے اب ہم چند لفظوں میں آپ کے سوال کے دوسرے حصے پر بھی غور کر لیں۔ جس میں آپ نے شاعری اور فطرت کے باہمی تعلق پر تشریح چاہی ہے۔ پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ شاعری سے کیا مراد لیتی ہیں؟ آپ خود لکھ رہی ہیں کہ شاعری فقط لفظوں، استعاروں، تشبیہوں اور محاوروں میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ "کچھ اور چیز" ہے اب آپ مجھ سے یہ دریافت فرماتی ہیں کہ وہ "کچھ اور" کیا ہے؟

آپ بالکل صحیح نتیجے تک پہونچیں، شاعری واقعی لفاظی اور استعارہ گری کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اس کے علاوہ اور کوئی شے ہے۔

ورائے شاعری چیزے دیگر است

میں عرض کر چکا ہوں کہ فطرت کائنات باہم ہم آہنگ ہے۔ جو تاثرات اور جذبات کہ انسانی قلوب کی گہرائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنی ابتدائی شکلوں میں درختوں کے پتوں، پانی کی بوندوں اور ریگ کے ذروں کے اندر بھی موجود ہوں۔ سائنس بھی اس سلسلے میں ہماری تردید نہیں کرتی۔ علم نباتات کا جاننے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ درخت سونے، جاگنے، کھانے پینے اور حس و تاثر میں بالکل انسانوں کی طرح ہیں۔ چھوئی موئی کے ننھے ننھے پودے لمس سے مرجھا جاتے ہیں۔ انسانی ہاتھ کی گرمی سے اُن کے اندر افسردگی کی کیفیات نمودار ہو جاتی ہیں۔ کیا وہ کچھ محسوس کرتے ہیں . . . . . ہاں وہ یقینی کچھ محسوس کرتے ہیں۔ مگر ابھی تک انسان نے احساس و اثر کے جانچنے کے لئے کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں کیا۔ جن سے ان بے زبانوں کی معنوی کیفیتیں ہم سمجھ سکتے۔ انسانی فطرت ہمیشہ مختلف اور متضاد جذبات کا شکار رہتی ہے کبھی اس پر نفرت اور خوف کے اثرات طاری ہوتے ہیں اور کبھی محبت و ملائمت کے۔ غصے کے وقت جس طرح انسان کا چہرہ تمتما جاتا ہے، آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں اور اعصاب میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح درختوں، کوہساروں اور دریاؤں پر بھی جب غضب ناک جذبات طاری ہوتے ہیں تو اُن کی رنگتیں بدل جاتی ہیں۔ ان کی معمولی رفتار میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اور وہ بھی اسی قدر بھیانک اور ہیبتناک نظر آنے لگتے ہیں جس قدر کوئی جلد باز شعلہ جوالہ

[illegible] اور لطافت کے وقت انسانی آنکھیں جس طرح سرور آمیز ہو جاتی ہیں، انسانی روح جس طرح شفاف اور سیراب ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی کیفیت کائنات کے دوسرے مظاہر کی ہوتی ہے۔ چاندنی راتوں میں پھولوں کی مسکراہٹ شفاف دنوں میں پہاڑوں کا حسن اور خوشگوار موسم میں [illegible] کی لطافت میرے دعوے کی دلیل ہے۔

انسان چونکہ عناصر کے اس کارخانے میں سب سے زیادہ مکمل پرزہ ہے اس لئے وہ اپنے جذبات کو لفظوں میں ظاہر کر سکتا ہے۔ وہ محبت کے اثرات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ خوف، نفرت، حیرت اور تعجب کے جذبوں کو زیادہ موثر پیرائے میں بیان کر سکتا ہے۔ درحقیقت شاعری کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے، شعر کا خمیر ان جذبوں میں تیار ہوتا ہے جو دل میں ابھرتے ہیں چاہے وہ دل انسان کے سینے میں دھڑک رہا ہو یا درختوں کی پتیوں میں۔ . . . میں کہتا ہوں کہ شاعری فقط ہم انسانوں پر ہی موقوف نہیں۔ جب مور مست ہو کر ناچتا ہے، جب کوئل محو ہو کر کوکتی ہے، جب شیر غصہ ہو کر دھاڑتا ہے، جب دریا بند ہو کر چڑھتا ہے، جب درخت وجد میں آکر جھومتے ہیں تو گویا اس وقت وہ شعریت میں ڈوبے ہوتے ہیں، دیکھنا فارسی کے ایک شاعر نے اس خیال کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ:—

پس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

شاعری اور فطرت میں جو غیر فانی تعلق ہے فطرت کے تقاضے ہی ابھرنے کے لئے شعر کا روپ بدل لیتے ہیں چاہے وہ لفظوں کا پیرایہ اختیار کریں یا نہ کریں۔ جب اس کرۂ ارض پر انسانوں کی آبادی نہ تھی۔ بلکہ جب حیوانوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہ ظرف و مکان بھی نہ تھے، یہ وقت و زمان بھی نہ تھے۔ اس وقت بھی شاعری کا وجود تھا اور یہ شاعر خود فطرت تھی۔ جو اپنی کروڑوں برس کی تنہائی میں اس شغل سے لطف اٹھایا کرتی تھی۔ فطرت کا یہ لطیف مشغلہ اب تک جاری ہے۔ وہ اب بھی شعر کہتی ہے، مگر انداز سخن بدل گیا ہے۔ اب فطرت کے گیت ہماری زندگیوں کے ساز پر بجتے ہیں۔ اب فطرت کے الفاظ ہمارے لبوں پر گونجتے ہیں۔ اب فطرت کی باتیں کوئل اور پپیہے کے راگوں میں سنی جا سکتی ہیں اگر موقع ملے تو پہاڑوں کے دامن میں آیئے اور مادی زندگی کے شور و شر سے دور ان ازلی نغموں کو آج بھی سن لیجئے۔

جلیل القدر خاتون !

پچھلے خط میں آپ کی ناسازیٔ طبع کا حال پڑھ کر ایک گونہ تشویش سی ہو گئی تھی۔ شکر ہے کہ اب آپ اعادۂ صحت فرما رہی ہیں۔ نہ صرف اعادۂ صحت بلکہ آپ کی ادبی سرگرمیاں دوبارہ شروع ہو گئی ہیں

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نالۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

آپ نے لکھا ہے کہ مجھے غالب کا یہ فلسفہ بہت پسند ہے۔ واقعی گھر کی رونق اور سماں کیلئے کسی آواز کا ہونا ضروری ہے۔ وہ آواز کسی مطمئن دل کا ترانہ ہو یا کسی زخم رسیدہ روح کی پکار۔ . . . جہاں تک گھر کی رونق کا سوال ہے میں آپ سے متفق ہوں اور ہنگامے کی ضرورت کا قائل ہوں، مگر جہاں تک نالۂ غم کا تعلق ہے میں سختی کے ساتھ اس مایوس پسندانہ اصول پروری کے مخالف ہوں۔

غم کی چیخوں سے کسی گھر کی رونق نہیں ہو سکتی۔ کیسے ممکن ہے کہ درد و معصیت کی بھیانک کراہوں سے آپ کے کان لطف اندوز ہو سکیں۔ ہنگامہ ضرور ہونا چاہیئے مگر وہ ہنگامۂ مسرت ہی ہو۔ ہنگامۂ ماتم نہ ہو۔ آپ فرمائیں گی کہ یہ انسانی فطرت

سے گلے پر کند چھری پھیر دینا ہے۔ مسرت اور غم میں ابدی رشتہ ہے۔ انسانی روح کو سنورنے کیلئے فقط خوشنما زیور کی ہی ضرورت نہیں ہے بلکہ بوجھل بیڑیاں بھی درکار ہیں۔ میں آپ سے مانتا ہوں بلکہ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ غم ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ لیکن کیا غم ؟ غم کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ایسی روحانی کیفیت ہے جو انسانی روح کو زیادہ سے زیادہ مسرور، توانا اور خوش دل بنانے کے لئے عارضی طور پر طاری ہو جایا کرتی ہے۔ یعنی آپ جس طرح فولاد کو آب دینے کیلئے تپتی ہوئی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں اسی طرح فطرت انسانیت کے پوشیدہ جوہروں کو ابھارنے کے لئے اُسے وقتی طور پر غم و تکلیف کے جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔ جب انسانی جسم میں زہریلا مواد پیدا ہو جاتا ہے تو اطبا مریض کو تند اور تلخ دوائیں استعمال کراتے ہیں تاکہ تیز اور زود اثر مادوں سے جسمانی روگ جل جائیں۔ اسی طرح جب ہماری روح طرح طرح کے میل کچیل سے آلودہ ہو جاتی ہے تو فطرت جو سب سے بڑی معالج ہے حرکت میں آتی ہے اور غم کی کڑوی کسیلی شراب ہمارے منہ سے لگا دیتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک مدبرانہ علاج ہوتا ہے۔ غم کی آگ ہماری روح کو تپا کر اس قدر مضبوط اور آبدار بنا دیتی ہے کہ وہ پھر کسی موقعہ پر لچک نہیں کھا سکتی میرے خیال میں غم کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں۔ ہمارے یاس پسند شاعر غم و محن کو ایک ایسا ناگوار بوجھ سمجھتے ہیں جو تقدیر نے زبردستی ان کی پشت پر لاد دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ :۔

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

لیکن درحقیقت یہ زندگی کی نفی کرنا ہے۔ میں ایسے حسرت نصیبوں کو اپنی سماج اور اپنی تہذیب کے لئے ایک خطرہ سمجھتا ہوں۔ میں ایسے تمام گرے ہوئے پسے ہوئے، اور کچلے ہوئے ذہنی رجحانات کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرتا ہوں

یہ لوگ درحقیقت سورج نے جگمگاتی ہوئی دنیا میں اندھیری راتوں کے ڈراؤنے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ یہ ترقی اور بیداری کے تمام ولولوں سے تہی دامن ہو چکے ہیں۔ ان کے کشکول میں امید و ارمان کا کوئی تحفہ نہیں۔ ان کے دامن میں روحانیت و معنویت کا کوئی موتی نہیں۔

عزیز خاتون !

ممکن ہے کہ آپ میری انتہا پسندانہ رجائیت کی مخالفت کریں۔ مگر آپ غور تو کیجئے کہ یہ غم پسند فطرت رکھنے والے شاعر ہماری سماج اور ہمارے لٹریچر کو کس قدر لیجا رہے ہیں وہ گیت وہ افسانے اور وہ نظمیں جو مستقبل کی تابانی اور زندگی کی جھلک سے خالی ہیں۔ اُن پر یہی مثال صادق آتی ہے کہ

اے دختر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

بقیہ پھر کبھی لکھونگا۔ امید ہے کہ اب آپکی طبیعت مع الخیر ہوگی

اے بربطِ دل خاموش نہ ہو اظہارِ حقیقت کرنا ہے
اے قلبِ حزیں دلگیر نہ ہو تائیدِ محبت کرنا ہے
اسرارِ جوانی کو آخر رسوائے حکایت کرنا ہے
انجامِ محبت سے پہلے آغازِ محبت کرنا ہے

وہ لاکھ ہوں آمادہ کرم تسکینِ جنوں ممکن ہی نہیں
وحشت میں قرار آتا ہی نہیں فرقت میں سکوں ممکن ہی نہیں

اُف کتنی خلش ہے رگ رگ میں، اے سوزِ نہانی کیا کہیے
نغماتِ محبت کیوں سنئے، فرقت کی گرانی کیا کہیے
وہ مستِ جوانی برہم ہے، پیغامِ جوانی کیا کہیے
آہوں کا فسانہ کیا کہیے، اشکوں کی کہانی کیا کہیے

وہ شامِ نشاط انگیز کہاں وہ صبحِ طرب افروز کہاں
ہنگامۂ غم میں ساز کہاں خاکسترِ دل میں سوز کہاں

اُو بھولنے والے کیا پھر بھی، گذرے ہوئے لمحے آئینگے
تم ناز سے من کے روٹھو گے ہم روٹھ کے پھر من جائینگے
یہ شامِ جوانی گذرے گی، اور صبح کے جلوے چھائینگے
تم سازِ محبت چھیڑو گے، ہم شوق کے نغمے گائینگے

ہر ذرۂ دل سرگشتہ کا، انوارِ وفا سے دمکے گا
یعنی کہ ہماری دنیا میں، شب گذرے گی، دن چمکے گا

دل ایک رباب بے نغمہ — نغموں کی مجھ کو حاجت ہی نہیں
آرام سے کیا مطلب دل کو — تسکیں کی کوئی صورت ہی نہیں
میں ایک شکستہ کشتی ہوں، — ساحل سے مجھے الفت ہی نہیں
وہ لاکھ ہوں مائل میری طرف — بیدار مری قسمت ہی نہیں

غم سیکڑوں ہیں عادل مجھ کو — ظاہر میں مگر غم کوئی نہیں،
روتا ہوں مگر کیوں روتا ہوں، — اس راز کا محرم کوئی نہیں

وہ پھول ہوں میں جسکی خوشبو — دامانِ چمن سے دور رہی
وہ بلبلِ خفتہ بخت ہوں میں — جو غم سے سدا مجبور رہی
ہر چند طبیعت فرقت میں — اس درد سے بھی مسرور رہی
لیکن مری بے مقصد ہستی — ہمرنگِ شبِ دیجور رہی

دل خوگرِ غم تھا قسمت سے، — درمانِ مصیبت کر نہ سکا
وہ دردِ محبت سُن نہ سکے، — میں عرضِ محبت کر نہ سکا

میں خون کے آنسو روتا ہوں — ڈوبے ہوئے تارے شاہد ہیں
بیگانہ جہاں سے رہتا ہوں — دنیا کے نظارے شاہد ہیں
طوفان ہے امڈا اشکوں کا — ساگر کے کنارے شاہد ہیں
صحرا کی ہوائیں واقف ہیں — موجوں کے اشارے شاہد ہیں

سینے میں نشانِ دل نہ رہا، — آنکھوں میں سرشکِ غم نہ رہے
کیا فائدہ اُن کے آنے سے — دل، دل نہ رہا، ہم، ہم نہ رہے
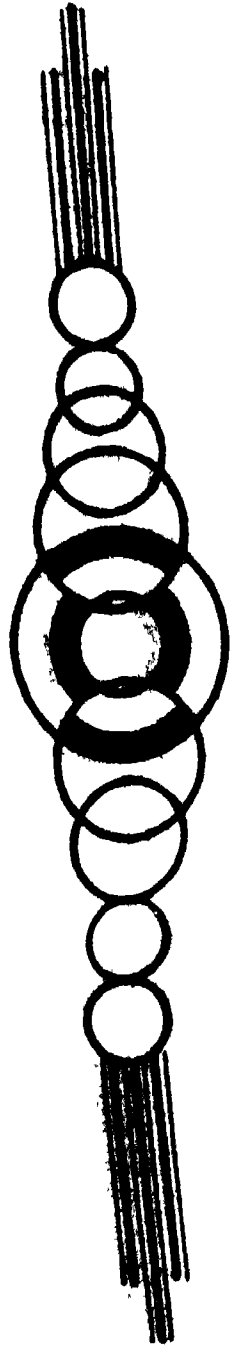
قدیم مصری شاہزادی کی روح سے یورپ کے مشہور منجم کیرو کی آخری ملاقات

اگر آپ آئرلینڈ میں مصری شاہزادی سے میری اولیں ملاقات کا ہوشربا افسانہ اور اس تاریخی ہاتھ کی سرگذشت پڑھ چکے ہیں جو مصر میں بمقام "وادی شاہان" ایک پر اسرار مصری خادم نے میرے حوالے کیا تھا تو آپ کو مندرجہ ذیل پر اسرار کہانی سننے میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوگی۔ آیئے یادداشت تازہ رکھنے کے لئے پھر اُسے دہرالیں۔ مدتیں گذریں کہ میں اثری تحقیقات اور مصری عجائب وغرائب کی چھان بین کے لئے مصر گیا تھا۔ اتفاق سے میرے ہمراہ ایک جرمن پروفیسر بھی تھا، جو اسی مقصد کے لئے مصر آیا تھا۔ وہاں ایک بوڑھے مصری کاہن سے ہماری ملاقات ہوئی۔ یہ شخص مہینوں ہمارے ساتھ مصری مقبروں میں کام کرتا رہا۔ تحقیقات ختم کر کے جب ہم یورپ واپس آ رہے تھے۔ تو اس نیک مزاج مصری نے مجھے ایک مصالحہ شدہ ہاتھ دیا۔ اس نے کہا کہ یہ شاہ اُخناتون کی لڑکی کا ہاتھ ہے۔ جو کبھی وادیٔ نیل کی مشہور پر جمال شاہزادی تھی۔ یہ ہاتھ ہزاروں برس سے اس کے خاندان میں محفوظ تھا۔ اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اُس نادر اور قیمتی یادگار کو قبول کر لوں۔ اسی کے ساتھ مصری دوست نے مجھ سے یہ بھی تاکید کی کہ یہ شاہزادی کی انمول امانت ہے جو کبھی تم سے طلب کر لی جائیگی۔ چنانچہ میں نے شکریہ کے ساتھ اس امانت کو لے لیا اور برسوں یہ عجیب و غریب امانت میرے پاس رہی۔ . . . . . یہاں تک کہ پُر اسرار امین کو اپنی امانت یاد آئی اور غیبی اشارے پر میں نے اس مومیائی ہاتھ کو آگ پر رکھ کر جلا دیا۔ جلی ہوئی راکھ میں سے ایک بیش قیمت انگشتری میرے ہاتھ آئی جو اب تک میرے پاس موجود ہے۔ خیر تو یہ تمام حیرت انگیز واقعات مجھے آئرلینڈ میں پیش آئے۔ اس کے بعد میں نے آئرستان کو چھوڑ دیا۔ اب سنئے کہ آئندہ کیا پیش آیا

میں کنگٹن کے نئے ریل میں سوار ہوا۔ میرا ارادہ سیدھا لندن پہونچنے کا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں آئرلینڈ کے اندر علانیہ جنگی برپا تھی اور سین فین جماعت والے برطانوی سامراج سے

ٹکرا رہے تھے۔ اس لئے تمام راستے غیر محفوظ اور خطرناک تھے باغی سپاہیوں نے سب دوسرے روز دوپہر کے بعد روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ ان کا ارادہ ریلوے پل کو تباہ کرنے کا تھا

دوسرے روز ہم نے اپنے مال و اسباب کو ٹرین میں رکھ دیا اور خود بھی سوار ہو گئے۔ جس ٹرین میں ہم سوار ہوئے تھے وہ آئرش فری اسٹیٹ کے سپاہیوں اور افسروں سے بھری ہوئی تھی۔ سپاہیوں نے خوشی سے ہمیں جگہ دیدی اور ہمارا اسباب اوپر کی سیٹ پر رکھ دیا۔ میری بیوی کے سوٹ کیس میں مصری شاہزادی کے طلسمی ہاتھ کی خاکستر حفاظت سے رکھی ہوئی تھی ہم کو ساٹھ میل کا سفر طے کرنا تھا اس لئے ہم آرام سے اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ سپاہی آئرستانی زبان میں یہ گیت گا رہے تھے:۔

چلو.....!

کوہ پیما رائی کی طرف چلو!

ابھی ہم کو بہت فاصلہ طے کرنا ہے

چلو.....!

آہستہ آہستہ نیند مجھ پر غالب آ گئی۔ میں سونا ہی چاہتا تھا کہ دفعتہً میری بیوی نے سر پر لٹکے ہوئے اسباب کے لیبل کی طرف مجھے توجہ دلائی جو گاڑی کے ہچکولوں سے بری طرح ہل رہا تھا۔ درحقیقت اس بیگ میں وہ راکھ تھی جس کے اندر قدیم مصر کی تاریخ بکھری پڑی تھی۔ میں نے سپاہیوں کے اعتراض کے باوجود اس بکس کو اتار کر اپنے پاس رکھ لیا۔ ابھی مشکل سے دو تین منٹ گذرے ہونگے کہ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ ٹرین رک گئی۔ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ اوپر کا تمام اسباب بیچارے سپاہیوں کے سروں پر آ گرا۔ اور بہت سے آدمی زخمی ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ تمام اسٹیشن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے شہتیر جل جل کر ٹرین پر گر رہے ہیں۔ اُف کتنا دہشتناک نظارہ تھا۔ مگر خطرے کی ابھی تو ابتدا تھی۔ اس سے کہیں زیادہ سنگین، کہیں زیادہ خوفناک اور کہیں زیادہ قہار خطرہ ہماری طرف بھاگا چلا آتا تھا۔ یہ ایک تیز رفتار وحشی انجن تھا جو غلیظ دھواں چھوڑتا، غل مچاتا تیزی کے ساتھ اسی لائن پر آ رہا تھا جس پر ہماری ٹرین کھڑی تھی۔ اُف! پناہ بخدا۔ اب کیا ہوگا... ؟ پہلے ہم نے ایک تیز سیٹی کی آواز سنی۔ اس کے بعد ایک پاگل کی طرح انجن شور مچاتا ہوا سامنے سے نمودار ہوا۔ ہم نے سوچا اب چند منٹ میں ایک ایسی خوفناک ٹکر ہونے والی ہے کہ تمام ٹرین کے ٹکڑے اُڑا دیگی۔ کچھ آدمی گھٹنوں کے بل جھک گئے، اور خدا سے دعا کرنے لگے اور بقیہ کے چہرے خوف کی وجہ سے سفید پڑ گئے۔ درحقیقت یہ مخالف جماعت کی حرکت تھی۔ جس نے کالو نیل کے زبردست ایکسپریس انجن کو گاڑی سے جدا کر کے نہایت تیزی کے ساتھ ہماری طرف چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ آنے والی گاڑی ٹکرا کر تباہ ہو جائے۔ اس وقت بھاگنا یا ذرا سی حرکت کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ فرط دہشت سے تمام لوگ مفلوج ہو گئے تھے.....

.....کہ اچانک ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا، سخت حیرت انگیز.....صورت یہ تھی کہ ہماری ٹرین سے سو گز آگے ریلوے لائن کے پوائنٹ کسی نے بدل دئے تھے۔ اور اس تبدیلی کرنے کو لوگ اتفاقیہ امر سے تعبیر کریں گے۔ تیزی سے آنیوالا انجن ایک طرف کو جھکنے کی وجہ سے قریب کھڑی ہوئی ایک مال گاڑی سے ٹکرا گیا اور بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک مہیب اژدھے کی طرح تمام لائنوں پر دوڑنے لگا۔ نتیجہ میں ایک کنکریٹ کی دیوار سے ٹکر کھائی اور بیدم ہو کر لائن کے قریب گر پڑا..... میں نے سپاہیوں کی مدد سے اپنا اسباب گاڑی سے اتارا۔ اور ڈبلن پہونچ کر کنگسٹن کے لئے ایک گاڑی کرایہ کی۔ اور کنگسٹن سے اسٹیمر کے ذریعہ لندن جا پہنچا......اب میں اُس آخری پیغام کا ذکر کرتا ہوں جو مجھے شاہزادی کی طرف سے موصول ہوا۔

لندن پہونچ کر میں نے اخباروں کے ذریعہ معلوم کیا کہ

"توت عنخ آمون" کے مقبرے کو ہاورڈ کارٹر نے بڑی تحقیقات
کے بعد دریافت کیا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس مقبرے
کے دریافت کی تاریخ وہی ہے جو شاہزادی کے طلسمی ہاتھ کو
خاکستر کرنے کی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ لارڈ کارنروان
جس کے روپے سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام کو پہونچا تھا "توت
عنخ آمون" کے مقبرے کی افتتاحی رسم ادا کرنے کے لئے بذات
خود مصر جا رہا ہے۔ جس روز میں نے اخباروں میں یہ اطلاعات
دیکھیں، اسی شب کو اپنی بیوی سے کہا کہ "توت عنخ آمون"
کے مقبرے کی دریافت دنیا کے لئے ایک عظیم الشان واقعہ ہے
مگر میں ڈرتا ہوں کہ جن لوگوں نے اس پُراسرار طلسم کے فتح
کرنے کی جرأت کی ہے کہیں وہ کسی بلا میں نہ گرفتار ہوجائیں
اس لئے کہ انہوں نے ہزاروں برس کے سربستہ رازوں کو بے نقاب
کردیا ہے اور ان طاقتور بادشاہوں اور ساحروں کی قبروں
سے گستاخیاں کی ہیں جو آج بھی خوفناک انتقام لینے پر قادر
ہیں۔ میری بیوی نے میرے خوف کی تائید کی۔ کیونکہ وہ بھی کسی
حد تک مصری عجائب و اسرار سے واقف تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رات کا وقت تھا اور کمرہ آتشدان سے گرمایا ہوا تھا
اور ہم دونوں میاں بیوی اسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک
کمرہ سرد ہوگیا، اور لطف یہ ہے کہ برقی روشنی خود بخود دھیمی
ہونے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ وہ سرخ دھندلی روشنی دینے
لگی۔ ہم تعجب سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور میری
میز کے دوسری طرف ایک اجنبی سایہ انسانی شکل اختیار کر رہا
تھا۔

ہم اس منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے اور انتظار کرنے
لگے کہ کب مہربان شاہزادی کا جمال جہاں آرا ہماری نگاہوں
کے سامنے بے حجاب آتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت میں اس کے
نظارۂ حسن کا متمنی بھی تھا۔ یکایک اس پُراسرار انسانی مجسّمے
نے ہم پر نظر ڈالی۔ اُف بخدا میری حسین ملکہ محبت بھری نظروں
سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا سیدھا ہاتھ اوپر کو اٹھا
ہوا تھا۔ اور میرے سامنے پڑے ہوئے کاغذ کی طرف تحریر
کا اشارہ کر رہا تھا۔ ملکہ کا اشارہ سمجھ کر میں نے قلم اٹھالیا
اور حیرت یہ ہے کہ قلم خود بخود کاغذ پر دوڑنے لگا۔ معلوم ہوتا
تھا کہ میں کسی غیبی طاقت کے ماتحت کام کر رہا ہوں۔ معلوم
نہیں کتنی دیر میں، مگر کچھ دیر میں شاہزادی غائب ہوگئی۔
جس طرح اندھیری رات میں اچانک بجلی چمک کر آنکھوں
سے اوجھل ہوجاتی ہے۔ فوراً بجلی کا لیمپ پوری طاقت سے
روشن ہوگیا۔ اور آتشدان کی حرارت پھر کمرے کو گرم کرتی
ہوئی محسوس ہوئی گویا ملکہ کے ظاہر ہوتے ہی تمام روشنی
اور گرمی کافور ہوگئی تھی اور اس کے غائب ہوتے ہی فطرت
کی تمام طاقتیں اپنی اصلی حالت میں آگئیں

فوراً میری نظر سامنے والے کاغذ پر پڑی جس پر حسب ذیل
الفاظ میرے قلم کے لکھے ہوئے تھے:۔

"تمہارا فرض ہے کہ تم لارڈ کارنروان کو خبردار
کردو کہ وہ "توت عنخ آمون" کے مقبرے پر پہونچکر
کسی چیز کو نہ اصلی جگہ سے ہٹائے اور نہ اپنے
ساتھ لے جائے اگر اس نے ایسا کیا تو اس کو
ایک بیماری لاحق ہوجائیگی جس سے وہ جانبر
نہ ہوسکے گا۔ اور نہ لندن واپس آسکیگا"

حسب ہدایت میں نے یہ تحریر لارڈ مذکور تک پہنچادی
اور اُس نے یہ غیبی نوشتہ آنریبل رچرڈ بتھل اور امیر البحر اسمتھ ڈونلڈ
کو پڑھکر سنایا۔ جو اس کے گہرے دوست تھے۔ اس سلسلے میں
ان تینوں دوستوں نے مجھ سے خط وکتابت کی جواب تک
میرے پاس محفوظ ہے۔ مگر لارڈ ایک ضدی قسم کا آدمی تھا۔
اور باوجودیکہ اس نے آنریبل رچرڈ اور امیر اسمتھ سے یہ اعتراف

کیا کہ اس پیغام نے مجھ پر کافی اثر کیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر مصری تمام میاں بھی مجھ سے درخواست کریں گی جب بھی میں اپنے ارادے سے باز نہ آؤنگا۔ چنانچہ لارڈ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے توت عنخ آمون کے مقبرے کی تمام بیش قیمت یادگاروں کو انگلستان بھیج دیا۔ اور اگر مصری حکومت مداخلت نہ کرتی تو غالباً وہ کوئی چیز بھی باقی نہ چھوڑتا۔

ایک روز جب کہ لارڈ اپنے دوستوں کے ساتھ اس تاریخی مقبرے کی سیر کر رہا تھا کسی زہریلے کیڑے نے اس کے ڈنک مارا۔ آہستہ آہستہ اس کا زہر تمام جسم میں پھیل گیا اور ڈاکٹروں کی حد درجہ کوشش کرنے کے باوجود لارڈ کارنروان نے توت عنخ آمون کے مقبرے کے نزدیک ہزاروں حسرتوں کے ساتھ دم توڑ دیا۔۔۔۔۔۔ اور شاہزادی کی غمناک پیشین گوئی پوری ہو گئی۔ مگر ابھی اس واقعہ کے دوسرے شریک کار باقی تھے اور مصری بددعاؤں کی نحوست اور تباہی ان کے لئے بھی مقدر ہو چکی تھی۔ لارڈ کارنروان کی پر اسرار موت کے بعد اس کا سکریٹری رچرڈ بتھل تمام تبرکات لیکر لندن واپس چلا آیا ایک روز رچرڈ کا باپ لارڈ ولسٹ بری گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ میرا لڑکا رچرڈ مصر سے کچھ منحوس تبرکات اپنے ساتھ لے آیا ہے اور میں اس کی زندگی کی طرف سے بہت خوف زدہ ہوں۔ میں نے کہا آپ کی پریشانی حق بجانب ہے۔ آپ فوراً یہ تمام تبرکات مصر کے برطانوی عجائب خانہ میں بھجوا دیجئے۔ تاکہ آپ محفوظ رہیں۔

میرے معزز دوست نے مجھ سے کہا کہ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ کے علم دست شناسی کے سلسلہ میں ایک خاص خط کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے خودکشی اور تباہی کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اور میرے ہاتھ میں وہ نشان موجود ہے۔ بوڑھے لارڈ نے یہ بھی کہا کہ اس کی زندگی رچرڈ کی زندگی سے وابستہ ہے۔ خدانخواستہ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا تو وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ میں نے بوڑھے لارڈ کو حتی الامکان تسلی دی۔ اور کچھ ہدایات دیکر اسے رخصت کر دیا۔

چند سال بعد مجھ کو سر رچرڈ بتھل کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ جسے میرے ایک امریکن دوست نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اب تک اس مکان میں توت عنخ آمون کے مقبرہ کی تمام یادگاریں سجی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے امریکن دوست کو متنبہ کیا کہ وہ اس مکان کو چھوڑ دے کیونکہ یہ خوفناک بددعاؤں اور نحوستوں سے بھرا پڑا ہے، مگر وہ ایک مادی اور عملی انسان تھا اور اسے ایسے اوہام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ اس نے میری تنبیہ کا کوئی اثر نہ لیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد میرے دوست کو بدقسمتی نے آ گھیرا۔ اور لندن کی اسٹاک ایکسچینج میں اس کا جتنا روپیہ لگا ہوا تھا سب کا سب ضائع ہو گیا۔ چند دن کے بعد غیر معمولی طریقے پر اس کے ایک عزیز کی موت واقع ہو گئی جو اس مکان میں مقیم تھا۔ اگلے سال اس کے کروڑپتی باپ کا انتقال ہو گیا اور لطف یہ ہے کہ وہ اپنے وصیت نامے میں اپنے اکلوتے بیٹے کو عاق کر گیا تھا۔

ان تمام پے درپے آفتوں سے گھبرا کر میرا دوست مکان خالی کر کے امریکہ بھاگ گیا۔ شکر ہے کہ خود اس کی جان محفوظ رہی مکان خالی ہونے کے بعد خود سر رچرڈ بتھل معہ اپنی بیوی کے اس مکان میں آ گئے۔ ان کے آتے ہی عجیب وغریب واقعات ظہور پذیر ہونے لگے۔ ایکبار تمام کمروں میں آگ لگ گئی دوسری بار آگ کے شعلے اس کمرے تک پہونچ گئے جہاں سر رچرڈ کا اکلوتا بچہ لیٹا ہوا تھا۔ مگر یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ آگ کس طرح لگتی ہے؟ کچھ روز بعد خود سر رچرڈ پر اسرار طریقے پر مردہ پائے گئے اسکے دم

سوئے ہوئے جذبات جگا دے

اے بتِ سیمیں اے مہِ نذّیں اے گلِ رنگیں حسنِ
اے رخِ زیبا اے قدِ بالا اے گلِ رعنا جانِ ند
محوِ ترنّم، وقفِ تبسّم، جانِ تکلّم، تیر آرائش
عذرِ جفا کر لطف و عطا کر محوِ وفا کر مجھ کو دو بلا

رُخ سے نقابِ زلف اٹھا دے
سوئے ہوئے جذبات جگا دے

دل وقفِ ارماں حسرت و غم میں رنج و الم میں یادِ صنم میں
شامِ غریباں بے صبحِ عشرت تصویرِ عبرت، بے دردِ فرقت
مجھ سے گریزاں، لہو و لعب بھی، کیف و طرب بھی شعر و ادب بھی،
کیوں ہے پریشاں، او لطفِ ہستی، کیوں خود پرستی، او جانِ مستی

مجھ کو پیامِ مہر و وفا دے
سوئے ہوئے جذبات جگا دے

وجہِ الم ہے پیغامِ عشرت ذکرِ محبت عہدِ مسرت
موجبِ غم ہے یہ زندگانی، یادِ جوانی، دل کی کہانی،
وقفِ ستم ہے شاد ہوں کیوں، غمگین و محزوں، اُف چشمِ پرخوں،
آنکھوں میں دم ہے شوقِ نظر سے خوں کیوں بہے دیدۂ تر سے

اب تو مجھے دیدار دکھا دے
سوئے ہوئے جذبات جگا دے

مسافر مرادآباد

مست ادائیں شوخ ہوائیں پاک فضائیں کیسے بھلاؤں
قلب وجگر میں دیدۂ تر میں حدِ نظر میں انکو جگہ دوں
نالۂ فرقت شکوۂ الفت قصۂ وحشت کسکو سناؤں
بیکسِ مضطر محرومِ دلبر "اُن کو بلا کر" اِتنا بتادوں،

فرقِ من و تو آج مٹا دے
سوئے ہوئے جذبات جگادے

کیوں یہ تغافل اے غیرتِ گل، کیوں یہ تساہل اے ماہِ انور
تو لعبت چیں اے حسنِ رنگیں گلفام و گلچیں دلدار و دلبر
تجھ سے گریزاں ماہِ درخشاں، تجھ سے پشیماں، خورشید و اختر
تیری سواری، بادِ بہاری مشکِ تتاری زلفِ معنبر

نکہتِ گیسو مجھ کو سونگھا دے
سوئے ہوئے جذبات جگادے

کیا زندگی ہے اک برہمی ہے آگ لگی ہے سوزِ نہاں سے
بیتابِ دل ہے دردِ مخل ہے عشق خجل ہے مہرِ بتاں سے
وقفِ ستم ہوں دور از کرم ہوں تصویرِ غم ہوں، آہ و فغاں سے
زخمِ جگر ہے اور دردِ سر ہے ذوقِ نظر ہے تنگ جہاں سے

اب تو دوئی کا راز مٹا دے
سوئے ہوئے جذبات جگادے

بنارسی تحفے

صرف اسلئے کہ جہاں اس میں صدہا حسین و دلکش نظارے موجود ہیں وہاں بنارسی سلکیں، بنارسی کمخواب اور بنارسی کپڑا بھی اپنی خوبصورتی نزاکت اور پائداری کے لئے ہندوستان بھر میں شہرت رکھتا ہے۔ ہمارا کارخانہ ابتدا سے ہی اپنی خوش معاملگی عمدہ سامان اور حسنِ صنعت کیلئے مشہور ہے۔ ہمارے یہاں ساڑھی جاکٹ بوٹی دار ہر قسم و ہر وضع جالی دار ملائم اور دبیز۔ ہر رنگ کے پوتھ بوٹیدار اور جالی دار، شلوار، قمیص، دوپٹہ ہر ڈیزائن اور ہر رنگ کے پوتھ۔ سنہری اور سفید بنارسی فیتہ۔ صافے سوتی اور کریپ کے۔ اوڑھنی کریپ ہر رنگ غرض خوش مذاق لوگوں کی ضرورت کا ہر سامان موجود ہے۔

یاد رکھئے

اگر آپکو بنارس کے سامان کا کوئی بیش قیمت تحفہ درکار ہو تو پتہ ذیل کو نہ بھولئے

حاجی عبدالغنی حاجی عبدالستار محلہ بہادر شہید متصل پیلی کوٹھی بنارس سٹی
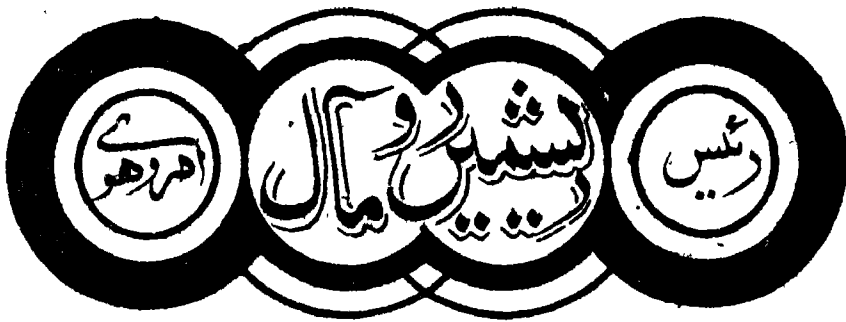
افسانوں اور کہانیوں کی . . . . راکھ . . . میں حقیقت اور سچائی کی چنگاریاں چھپی ہوئی ہیں۔ ذیل کی کہانی ایک عبرتناک سرگذشت سے طیار کی گئی ہے جو میرے ایک مرحوم دوست کو پیش آئی۔ گناہ کا بیج ابتدا میں کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو . . . . مگر وہ انسانی روح کی گہرائیوں میں جگہ پکڑ کر انجام کار ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ میرے دوست نے اپنی جوانی کی لغزشوں کی کتنی بڑی قیمت ادا کی۔ کتنی بڑی قیمت۔

یہ آپ انھیں کے الفاظ ———— میں ملاحظہ فرمایئے۔ (رئیس)

لالہ اونکار ناتھ سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے، اتنے گہرے اور عزیزانہ تعلقات کہ جب لالہ صاحب کی اکلوتی لڑکی "موہنی" نے ہوش سنبھالا اور لالہ جی کی دھرم پتنی قضائے ناگہانی سے سورگباش ہوگئیں تو موہنی خود ہمارے مکان میں تربیت و نگرانی کی غرض سے کہی گئی۔ لالہ جی ایک روشن خیال ہندو تھے اور انھیں ذات پات کے بندھنوں اور چھوت چھات کے قاعدوں کو توڑنے میں خاص مزا آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ شہر ہی میں موہنی کی دور کے رشتے کی ایک پھوپی بھی موجود تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی نازپروردہ بچی کو تعلیم و تربیت کی غرض سے ہمارے گھر میں رکھنا پسند کیا۔

لالہ جی عدالت دیوانی میں سررشتہ دار تھے اور پرماتما کی دنیا سے بالکل چھڑے واقع ہوئے تھے۔ موہنی کے سوا ان کا کوئی عزیز قریب نہ تھا۔ اصل میں تو وہ رہنے والے بنارس کے تھے، مگر بچپن سے ان کی تعلیم و تربیت ہمارے شہر ہی میں ہوئی تھی۔ کیونکہ مدتوں تک ان کے پتاجی بسلسلۂ ملازمت یہیں مقیم رہے تھے۔ میرے والد اور لالہ جی اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ساتھ رہے تھے اور جب یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد ابا جان نے قانونی پریکٹس اور لالہ صاحب نے عدالت دیوانی کی ملازمت شروع کی تو بھی ان کا ساتھ نہ چھٹا۔ بلکہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا تھا دونوں کے دلی روابط بڑھتے ہی جاتے تھے۔

موہنی کی شمولیت سے ہمارے مختصر سے خاندان کی رونقیں دوچند ہوگئی تھیں۔ پہلے اتنے بڑے گھر میں ہم صرف دو بھائی بہن تھے۔ زہرہ اور میں۔ لیکن موہنی کے آجانے کے بعد ہمارا ایک ساتھی اور بڑھ گیا تھا۔ وہ اتنی شریر اور اتنی کھلاڑ تھی کہ چند ہی روز میں ہم دونوں بہن بھائی پر حکومت کرنے لگی۔ خصوصاً نئے نئے کھیل اور تازہ بتازہ شرارتیں ایجاد کرنے میں تو اس نے حاضر دماغی اور چابکدستی کا ریکارڈ ہی توڑ دیا تھا۔

ہماری بھولی بھالی والدہ صاحبہ پہلے تو ایک غیرمسلم لڑکی کی نگرانی اور پرداخت کے فرائض سے گھبرائیں کیونکہ

وہ نہ اندازی قسم کی عورت تھیں۔ لیکن چند ہی روز میں موہنی کی دل کش شخصیت اور من موہ لینے والی عادتوں نے انھیں بھی مسخر کر لیا

دن آہستہ آہستہ گذرتے چلے جاتے تھے اور موہنی ہمارے چھوٹے سے کنبے کا ایک حقیقی جزو بنتی چلی جاتی تھی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ میں زندگی کی اس رنگین چڑیا سے جو اڑتی اڑتی میرے من مندر کے صحن میں اتر آئی تھی اور بغیر کسی کوشش کے رہنے لگی تھی۔ کس قدر مانوس ہو گیا تھا۔ اس وقت میں تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا تھا۔ اور وہ دس گیارہ برس کی ایک لڑکی ——— ہمارے درمیان ناقابل بیان کیفیات کا ایک لطیف پردہ حائل تھا یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میں موہنی سے محبت کرنے لگا تھا کیونکہ جن معنوں میں محبت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی ہمارے برتاؤ میں موجود نہ تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ مجھے موہنی کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس کے بغیر مجھے زندگی سونی معلوم ہوتی تھی۔ میں موہنی کی ضرورت محسوس کرتا تھا شاید اس لئے کہ کھیلوں کا حقیقی لطف حاصل کرنے کے لئے موہنی کی موجودگی ضروری تھی۔ ساتھ ہی مجھے زہرہ سے بھی محبت تھی۔ ایسی ہی محبت جیسے ایک بھائی کو اپنی بہن سے ہونی چاہئے۔ لیکن پھر بھی زہرہ اور موہنی کی جگہ دل میں الگ الگ تھی

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد وطن چھوڑنا میرے لئے ناگزیر تھا۔ اب میں ایک طویل عرصے کے لئے اپنے بچپن کی سہیلیوں سے جدا ہونے والا تھا۔ زہرہ نے جب سے میرے جانے کی خبر سنی تھی روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں تھیں اور موہنی . . . . . خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کے دل کی کیا کیفیت تھی، وہ بڑی مستقل مزاج لڑکی تھی۔ مجھے تو یہ شک ہے کہ غالباً اسکو اظہار جذبات کا طریقہ ہی نہ آتا تھا۔ زہرہ اور موہنی مجھ کو پہونچانے کے لئے اسٹیشن تک آئیں اور جب تک پلیٹ فارم نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا موہنی ایک ریشمین رومال ہلا ہلا کر مجھے الوداعی اشارہ کرتی رہی۔ یہ یادگار ریشمی رومال چند روز قبل میں نے موہنی کو تحفے میں دیا تھا، اور اس نے بڑی محنت سے اس پر میرا نام کاڑھا تھا سدا سنئے پھر یہ رومال میرے تصور میں بسا رہا اور کالج میں پہونچکر بھی عرصے تک مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ کہیں دور ——— افق سے اس پار موہنی رومال ہلا ہلا کر مجھے رخصت کر رہی ہے

شروع شروع میں کالج کے در و دیوار مجھے کاٹے کھانے کو دوڑتے تھے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ تعلیم کے بہانے مجھے اک کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے۔ باوجود حد درجہ کوشش کے میں اپنے ساتھیوں، اپنی مصروفیتوں اور اپنی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ پیدا کر سکا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ اجنبیت اور وحشت دور ہو رہی تھی اور میں آہستہ آہستہ کالج کی زندگی میں اپنے لئے ایک جگہ پیدا کر رہا تھا۔ اس زمانہ میں زہرہ اور موہنی کے مشترک خطوط مجھے وصول ہوتے تھے اور میں مشترکہ ہی انھیں جواب دیتا تھا۔ اب موہنی اور زہرہ دونوں ایک مقامی گرلس اسکول میں تعلیم پا رہی تھیں مگر وہ . . . . کتنی بدقسمتی ہے کہ جس روز موہنی نے جونیر کیمبرج کا امتحان امتیازی کامیابی کے ساتھ پاس کیا، اسی روز ہمارے مہربان چچا نے اچانک کالرا میں مبتلا ہو کر اس دار فانی کو الوداع کہی۔

مرتے وقت وہ موہنی کا ہاتھ اور بنک کی چیک بک ہمارے ابا جان کے ہاتھ میں دے گئے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ لالہ جی کے مرنے کے بعد موہنی بنارس چلی جاتی۔ مگر چونکہ لڑکی

ابتدا ہی سے مسلمانوں میں پلی بڑھی ہو اسے کونسا ہندو گھرانہ
اپنے میں شامل کرسکتا ہے۔

اب موہنی اس دنیا میں اکیلی تھی، بالکل اکیلی۔ اس
کی معصوم زندگی کے سادہ ورق پر بدقسمتی اور نحوست نے
ابھی پہلی مہر لگائی تھی۔ جب میں اس کے باپ کی حسرتناک
موت کا پرسا دینے کے لئے گھر پہونچا ہوں تو اس کی حالت
دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس شکستہ کشتی کا کیا پوچھنا جو اندھیری رات
میں ساحل سے بہہ کر بیچ طوفان میں ہچکولے کھا رہی ہو

اس وقت والد کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ
تھا کہ حسن کی اس دیوی کو کس خوش نصیب کے پرستش کدہ شوق
کی زینت بنادیا جائے۔ اب وہ ایک بھولی بھالی بچی نہ
تھی۔ سمجھدار اور ذہین دوشیزہ تھی اور اس زمانے میں تعلیمی
حیثیت سے بھی اس نے کافی ترقی کرلی تھی۔ حقیقت تو یہ
ہے کہ باوجودیکہ زہرہ اس کی ہم جماعت تھی مگر موہنی اس
کے ٹیوٹر کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اتفاق سے میں اسی
زمانے میں بیمار ہوکر وطن آگیا۔ اور علالت نے اس قدر
طول پکڑا کہ چند ماہ تک کالج سے ہی جدا رہنا پڑا۔ اس زمانے
میں موہنی نے جس گرمجوشی، خلوص اور مسلسل ایثار سے
میری خدمت گذاری اور تیمارداری کے فرائض انجام دیے
اس نے اور بھی مجھے اس کا گرویدہ بنادیا۔ ایک روز جبکہ
میں بخوبی اعادہ صحت کرچکا تھا اور میری پچھلی زندہ دلی
اور ظرافت واپس آچکی تھی۔ میں اور موہنی اپنے چھوٹے سے
پائیں باغ میں بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے آسمان
گرد و غبار سے پاک اور ہوا آلودگی و کثافت سے صاف
تھی۔ امی جان زہرہ کے ساتھ کسی عزیز کے یہاں شادی
کی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ اس وقت موہنی معمول سے
زائد حسین و دلنواز نظر آرہی تھی۔ کتنی حسین بتاؤں؛ بس
یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے سحر جمال کے سامنے میری تمام
قوتیں معطل نظر آتی تھیں۔ اس وقت موہنی کے شرم
و حجاب کی عجیب و غریب کیفیت تھی۔ بالکل یہ معلوم ہورہا
تھا کہ مولسری کی کوئی نازک شرمیلی کلی ہے جو تیز بارش
اور جھونکوں میں سہمی اور جھکی جارہی ہو، مگر گناہ کا جذبہ جب
ایک مرتبہ انسان کے دل میں بیدار ہوجاتا ہے تو پھر کوئی
قوت اسے فنا نہیں کرسکتی۔ چند لمحے کی خاموش ذہنی
کشمکش کے بعد میں نے موہنی کے نازک جسم کو اپنی آہنی
بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور مختصر سی مزاحمت کے بعد
وہ بے قابو ہوکر میری گود میں گر پڑی وہ کر بھی کیا سکتی تھی!
کمزور صید طاقتور صیاد کے پنجے سے نکلنے کی جتنی زیادہ
کوشش کرتا ہے اتنا ہی زیادہ خطرے میں مبتلا ہوتا ہے
میں اس کے حسن و شباب کا جائز حقدار تھا آخر میرا
ہوسناک شباب یہ گوارا بھی کیونکر کرسکتا تھا کہ موہنی جیسی
دلربا حسینہ اس کی دسترس سے باہر رہے ممکن ہے آپ
میرے برتاؤ کو غیر شریفانہ کہیں مگر خدارا انصاف کیجئے کہ
اگر میرے بجائے کوئی دوسرا نوجوان ہوتا تو کیا وہ اس سے
مختلف چارۂ کار اختیار کرتا جو میں نے اختیار کیا۔ میں
جانتا تھا کہ موہنی سے شادی کرنا میرے لئے ممکن نہیں
دنیا کی کوئی بھی قوت اسے میری جائز رفیقۂ حیات نہیں
بناسکتی تھی پھر۔ . . . . ؟ قاعدہ ہے کہ جب طوفان
بہنے کے لئے صحیح راستہ نہیں پاتا تو اُبل پڑتا ہے۔

درمیانی واقعات کو نظرانداز کرنا ہی بہتر ہے۔ سلسلۂ
بیان قائم رکھنے کے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ میں نے
موہنی کو پوری طرح لوٹا۔ اس کی سادہ لوحی اور کمزوری کا
جی بھر کے فائدہ اُٹھایا۔ لطف تو یہ ہے کہ وہ غریب آخر
وقت تک اس فریب میں مبتلا رہی کہ میں اسے باقاعدہ

طور پر اپنی زندگی کا شریک بناؤنگا۔

موہنی میرے وعدوں پر مطمئن تھی، اس نے اپنی دوشیزگی اور جوانی کے آبدار موتیوں کو شوق وامید کی لگن میں چُن کر میرے سامنے پیش کر دیا تھا اور میں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دوسری طرف میری شادی کے تذکرے ہو رہے تھے اور میری ایک دور کی عزیزہ بلقیس جو ایک دور کے شہر میں اعلیٰ تعلیم پا رہی تھی۔ میری رفاقتِ حیات کے لئے منتخب کی جا رہی تھی۔ صرف زہرہ گناہ اور شباب کی اس خفیہ ٹریجڈی سے کسی حد تک آگاہ ہو چلی تھی اور بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ وہ اشاروں کنایوں اور نگاہوں سے موہنی کو تنبیہ بھی کرتی رہتی تھی، مگر اس کے سر پر تو جانے عجیب کا بھوت سوار تھا۔ میں نے پوری کوشش صرف کر کے موہنی کو ان واقعات سے لاعلم رکھا اور اسے خبر ہوئی تو اس وقت جبکہ میری تقریب شادی میں صرف چند راتیں حائل تھیں۔ یقیناً موہنی نے جب اس خبر کو سنا ہوگا تو اس پر بجلی سی گر پڑی ہوگی۔ مگر وہ اتنی خوددار تھی کہ اس نے سب کچھ سُن لینے کے بعد بھی کچھ کہنا سننا بیکار سمجھا اور صرف ایک چھوٹے سے پرچے کو زہرہ کے حوالے کر کے لٹی ہوئی جوانی اور غارت کی ہوئی دوشیزگی کا منحوس بوجھ سنبھالے ہمارے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ پرچے پر صرف چند لفظوں میں اس نے اپنی پوری ناکام زندگی کو سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔ موہنی نے زہرہ کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ:-

بہن!

اپنے دھرم، اپنے جیون اور اپنی آتما کی تمام آشاؤں کو تمہارے بھائی کے چرنوں پر بھینٹ چڑھا کر میں اس گھر سے جا رہی ہوں اک زندہ نشانی میرے ساتھ ہے میں کیسو دُوش نہیں دیتی، اپنے نصیب ہی کو دوش دیتی ہوں۔ سب کو میری طرف سے پرنام،

کہہ دینا   دکھیاری

موہنی

وہ چلتے وقت اپنا تمام سامان اور اپنے تمام زیورات چھوڑ گئی تھی۔ صرف ایک ریشمی رومال اس کے ساتھ تھا۔ یہ وہی یادگار رومال تھا جو میں نے کبھی اس کو تحفہ میں پیش کیا تھا۔ ریشم کے اس خوبصورت رومال میں نہ جانے کتنے رومان سمائے ہوئے تھے۔ موہنی کے جانے کے بعد کیا کچھ نہ ہوا سب ہی کچھ ہوا۔ شہروں شہروں اس کی تلاش کی گئی۔ اخباروں میں اشتہار دئے گئے۔ انعام کے لئے بڑی بڑی رقمیں مقرر کی گئیں مگر موہنی کو نہ ملنا تھا، نہ ملی۔ بلقیس بھی اسکو دیکھنے کی بڑی مشتاق تھی۔ وہ اکثر میری زبان سے موہنی کے قصے سنا کرتی تھی۔ لیکن یہ قصے بھی رفتہ رفتہ ہم بھولتے جاتے تھے۔ اب موہنی کا دل میں ایک دھندلا سا نشان باقی رہ گیا تھا۔

ملازمت سے پنشن لے کر فطرۃً ہر انسان کے دل میں پرسکون زندگی کی خواہش ہوتی ہے۔ میری عمر کا بیشتر حصہ محدود دفتری مشاغل اور مصنوعی زندگی بسر کرنے میں گذرا تھا اور اب مجھے ضرورت تھی کہ عمر کا بقیہ حصہ دیہات کی سادہ اور قدرتی فضاؤں میں گذاردوں۔ اب دنیا میں فریدہ کو علاوہ میرا تھا بھی کون؟ بلقیس کے مرنے کے بعد یہ معصوم بچی ہی میرے دل کا سہارا تھی۔ فریدہ اب خاصی ہوشیار اور تعلیم یافتہ ہو گئی تھی۔ مگر چونکہ میں نے اسے بچپن سے پالا تھا اس لئے مجھے گوارا نہ تھا کہ اُسے آئندہ تعلیم کے لئے کالج کو بھیجدوں۔ میرا خیال تھا کہ مناسب تعلیم کے بعد اسکی شادی ایسے نوجوان سے کردونگا جو خود میرے بڑھاپے کا سہارا

ثابت ہو

کافی غور و فکر کے بعد میں نے چندن پور میں قیام کا فیصلہ کیا جو ہماری آبائی جاگیر تھا۔ یہ گنگا کی وادی میں ایک حد درجہ خوبصورت سا گاؤں تھا۔ چندن پور کی آب و ہوا اور وادیٔ گنگا کے خوبصورت مناظر حیثیت سے لاجواب تھے۔ فریدہ بھی اپنے نئے ماحول میں کافی خوش و خرم نظر آتی تھی۔ اک روز جبکہ ہم دونوں کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے رسالوں اور اخباروں سے جی بہلا رہے تھے کہ گاؤں کا معزز پدھان مجھے کوٹھی میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان لڑکا بھی تھا۔ پدھان نے قریب پہونچ کر ادب سے مجھے سلام کیا اور ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ غریب لڑکا پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری کوٹھی کے در و دیوار کو تک رہا تھا۔ میں نے پوچھا . . . . کیا بات ہے چودھری؟ آؤ بیٹھو . . . . یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟ ـــــ پدھان نے بتایا کہ یہ ایک لاوارث نوجوان ہے۔ اس کی ماں عرصے سے قریب کے ایک شکستہ مندر میں دیوداسی کی حیثیت سے رہتی تھی۔ پدھان نے بتایا کہ وہ بڑی خدا رس اور گیانی دیوی تھی۔ اور گنگا مائی نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ وہ جوگن ہے جس کی بزرگی اور پاکیزگی کے قصے میں کتنی ہی مرتبہ گاؤں کے لوگوں سے سن چکا تھا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس نوجوان راہبہ نے اپنی تمام عمر سوگ میں گذار دی۔ کیوں کہ بقول اس کے اس کا شوہر شادی کے آغاز ہی میں مر گیا تھا اور اس کی یادگار صرف یہی لڑکا تھا۔ جس کی صورت پر شرافت، پاکیزگی اور نیکی کا قدرتی نور جھلک رہا تھا۔ پدھان نے لڑکے کا نام گردھاری بتایا اور کہا کہ اگر اسے سرکار اپنے پاس رکھ لیں تو یہ آوارہ گردی اور رسوائی کی مصیبتوں سے بچ جائے گا۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ یہ [illegible] ضروری تھا کہ فریدہ کے لئے ایک شائستہ اور مہذب خانساماں کی ضرورت بھی تھی۔ چنانچہ میں نے بخوشی گردھاری کو اجازت دیدی کہ وہ اپنی چھوٹی سی پوٹلیا لے کر جو اس کی سورگباشی ماتا کی یادگار تھی میری وسیع کوٹھی کے ایک ــ میں آپڑا۔

گردھاری واقعی حد درجہ ذہین تھا اس نے چند ہی روز میں حیرت انگیز ترقی کر لی تھی۔ بہتر زندگی اور مطمئن ماحول نے اس کا رنگ اور روپ ہی بدل دیا تھا۔ وہ اب کسی معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے کا ہونہار چشم و چراغ معلوم ہوتا تھا میں نے چند مرتبہ گردھاری سے اس کے ماں باپ اور خاندان کا حال بھی دریافت کیا، مگر بے سود! اسے سوائے اپنی ماں کی نورانی صورت اور پاکیزہ اخلاق و عادات کے اور کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ فریدہ چند ہی روز میں گردھاری سے بے انتہا مانوس ہو گئی۔ اسے بغیر گردھاری کے چین نہ آتا تھا میں اپنی بچی کی نئی دلبستگیوں سے دل ہی دل میں خوش تھا کیونکہ اس طرح مجھے اس کے بہت سے تفکرات سے نجات مل گئی تھی۔ چند روز کے بعد میں اپنی ضروریات کے سلسلے میں شہر آ گیا تھا۔ اب مجھے اطمینان قلب میسر تھا اتفاق سے شہر میں کچھ ایسی ضروریات پیش آ گئیں کہ مجھے کچھ عرصے کے لئے چندن پور سے الگ رہنا پڑا۔ فریدہ کے خطوط مجھے روزانہ وصول ہوتے تھے۔ اور اس کے ہر خط سے مجھے زندگی اور تازگی کی خوش آئند علامات محسوس ہوتی تھیں۔ میرے لئے اس سے زیادہ مسرت انگیز اور کیا چیز تھی۔ گردھاری بھی مجھے ہر خط میں سلام لکھواتا تھا۔ فریدہ بڑی دلچسپی سے گردھاری کے گنوار پن اور سادہ لوحی کے تذکرے لکھا کرتی تھی۔ مگر ہر خط میں یہ بھی لکھ دیتی تھی کہ . . . .

ابا جان! اب میں اسے انسان بنائے جا رہی ہوں۔ میں فریدہ کی دلچسپیوں پر بے اختیار ہنسا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں فریدہ

نے گرد ہاری کی ایک تصویر خط کے ساتھ رکھ کر ارسال کی جو جدید ترین فیشن میں لی گئی تھی اور فریدہ نے خود طلب کی تھی کس قدر حسین تصویر تھی بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے آغاز جوانی کو کسی مصور نے انتہائی چابکدستی سے رنگ و خطوط میں منقوش کر دیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ گرد ہاری مجھ سے کس قدر مشابہ ہے۔ اتفاق سے وہیں میرے بچپن کا بھی ایک فوٹو موجود تھا جو مرحوم زہرہ اور غریب موہنی کی ہمراہی میں لیا گیا تھا۔ میں چونک پڑا۔ گرد ہاری کے خد و خال موہنی کے خد و خال کا عکس تھے۔ جس میں میرا رنگ اور روپ جھلک رہا تھا۔ "میں خدایا یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ لاوارث لڑکا میری ابتدائی محبت کی زندہ یادگار ہے۔ میرا سر چکرا گیا اور یہ دیکھ کر میری پریشانی اور بدحواسی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ دبے لفظوں میں مجھ سے گرد ہاری کے ساتھ شادی کر لینے کی اجازت مانگ رہی ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ بہن بھائی کے عقد میں آجائے۔ کیا قدرت مجھ سے میرے گناہوں کا انتقام لے رہی ہے۔ کیا میں نے موہنی کو بہن نہیں بنایا تھا۔ کیا مجھے وہ بھائی نہ کہتی تھی؟ الٰہی یہ کیا قیامت ہے؟ یہ کیسا عجیب و غریب انتقام ہے، یہ کیسا ہولناک سانحہ ہے۔؟ مگر میں نے ابھی اس راز کا انکشاف مناسب نہ سمجھا مجھے شرم آتی تھی کہ اپنی معصوم بچی کو اپنے خوفناک گناہوں سے مطلع کروں۔ لیکن میں نے فریدہ کو غم و غصہ کے عالم اک سخت خط لکھا، جس میں اسے ہدایت کی کہ وہ فوراً گرد ہاری کو اپنے مکان سے نکال دے۔ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اور اگر وہ ایسا نہ کرے گی تو خود اسے گھر چھوڑنے کے لئے طیار رہنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے منشی کو بھی تاکیدی خط لکھا۔ مجھے یقین تھا کہ فریدہ فوراً اس ارادے سے باز آجائیگی۔ اور پھر میں آہستگی و خوشی کے ساتھ پردہ ہٹا کر ان دونوں بہن بھائیوں کو ملا دونگا۔ مگر قدرت میری خام خیالیوں کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اسے کچھ اور ہی منظور تھا عین انتظار میں مجھے دونوں خطوں کے جوابات مل گئے۔

فریدہ نے لکھا تھا کہ :-

"میں حسب الحکم معہ گرد ہاری کے رخصت ہو رہی ہوں"

منشی نے لکھا تھا کہ :-

"صاحبزادی صاحبہ کل رات سے مفقود الخبر ہیں۔ گرد ہاری کا بھی پتہ نہیں۔"

جب میں کوٹھی میں ہو کر آیا ہوں تو وہ سنسان پڑی تھی۔ وہ دونوں چلتے وقت کچھ بھی نہ لے گئے تھے۔ گرد ہاری تو اپنی بوسیدہ گٹھری بھی بدستور چھوڑ گیا تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں متفرق چیزوں کے علاوہ "آتش کرم خوردہ ریشمیں رومال" بھی تھا۔ یہ وہی منحوس تحفہ تھا جو کبھی میں نے حسرت نصیب موہنی کو پیش کیا تھا۔ آج موہنی محبت کا یہ تحفہ مجھے واپس کر گئی تھی اور اپنے ساتھ دو بہن بھائیوں کو گناہوں اور سیاہکاریوں کے اتھاہ جہنم میں جھونکنے کیلئے اپنے ساتھ لے گئی تھی . . . . . اف کتنا لرزا دینے والا انتقام

ضرورت رشتہ

سحر کا نغمہ ہو تم، شام کا خمار ہو تم
شفق کے دوش پہ چھائی ہوئی بہار ہو تم
گلِ امید ہو تم گلشنِ جہان کی قسم
میرے نصیب کا تارا ہو آسماں کی قسم
زبانِ دل کی قسم، جذبۂ نہاں کی قسم
جمالِ برق ہو تم، برقِ بے قرار ہو تم
سحر کا نغمہ ہو تم

یہ غنچہ و گل و شبنم میں تازگی کیا ہے
سحر کی تیرگی آمیز روشنی کیا ہے
تمہیں خبر بھی ہے راز شگفتگی کیا ہے
نگار خانۂ فطرت میں جلوہ بار ہو تم
سحر کا نغمہ ہو تم

میں کون شام الم پیکر غم و آلام
تم ایک صبح طرب بہجت و سرور کی شام
میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کا ہولناک انجام
مری شکست و تباہی کی رازدار ہو تم
سحر کا نغمہ ہو تم

یہ کیوں کہوں کہ اثر کشتۂ جفا ہوں میں
نگاہِ دوست کا مخصوص مدعا ہوں میں

مذاق برقِ تجلی سمجھ گیا ہوں میں
اب اپنے ذوقِ نظر کو بڑھا رہا ہوں میں

وہ بیکسیٔ محبت کا ماجرا ہوں میں،
کہ اپنے حال پہ خود آج رو رہا ہوں میں

سنا رہا ہوں انہیں واقعاتِ بربادی
جنونِ جذبۂ دل تجھ کو دیکھتا ہوں میں

کچھ اور یاد نہیں انقلاب دورِ وفا،
تری نگاہ کی گردش سے پھر گیا ہوں میں

یہ اور بات ہے پھر التجائے دید کروں
فریبِ ذوقِ نظر تجھ کو جانتا ہوں میں

ہے ناز تجھ کو بہت طولِ حشر پر واعظ
فسانۂ شبِ فرقت کو چھیڑتا ہوں میں،

تری حجاب کے صدقے یہ کیسا پردہ ہے!
کہ آج اپنی نظر سے چھپا ہوا ہوں میں،

اسی کا نام ہے تکمیل حسن و الفت کی،
وہ ہنس رہے ہیں اثر اور رو رہا ہوں میں

انجمن عقد بیوگان کے دفتر سے نکل کر راؤ صاحب کی خوبصورت موٹر نئی دلہن کالندی کو لئے ہوئے ذرا سی اسٹیشن پر جا پہونچی۔ راؤ صاحب دوسرے روز گیان پرکاش میں چھپنے والی دوسری شادی پر مبارکباد کو پڑھنے کی خاطر بھی یہاں نہ ٹھہر سکے۔ وہ اپنی نئی دلہن سمیت وطن پہنچنے کیلئے بے چین ہو رہے تھے۔ چنانچہ دونوں تیز چلتے ہوئے شولاپور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے

وہ جس ڈبے میں بیٹھے تھے اس میں ان دونوں میاں بیوی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ کالندی کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی اس کے خوبصورت رخسار خوشی سے کندن کیطرح دمک رہے تھے اور دلفریب پیشانی پر تبدیلی قسمت کی نشانی "سرخ بندی" بے انتہا دلکش معلوم ہوتی تھی۔

راؤ صاحب جب ریل کی کھڑکی میں کھڑے ہوئے چرٹ پی رہے تھے تو مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ جب گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ کر آہستہ آہستہ رینگنے لگی تو انہوں نے کھڑکی بند کر دی اور کالندی کے سامنے آ بیٹھے۔

آج پہلی ہی بار راؤ صاحب کو دیکھکر کالندی شرمائی راؤ صاحب نے کہا "گاڑی خوب تیز چلی۔ بس ساڑھے گیارہ بجے تک ہم شولاپور پہونچ جائیں گے"۔

کالندی نے پوچھا "کل چھٹی نہیں ہے"؟

"نہیں تو کچہری تو جانا ہی ہوگا۔ مگر دوپہر کو تین بجے کے قریب واپس آجاؤنگا"

یہ کہکر راؤ صاحب مسکرا دئے۔ کالندی نے ہوا کے جھونکے سے اڑنے والا آنچل سنبھالا۔ اس کی ہرن جیسی آنکھوں میں بھی مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔ راؤ صاحب بولے "کھڑکی بند کر دوں"

رات کو بارہ بجے راؤ صاحب اور کالندی شولاپور جا پہونچے۔ اسٹیشن پر ان کی نئی کار طیار کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ لوگ اپنے شاندار بنگلے پر آ اترے۔

بنگلے کی آرائش و زیبائش کو دیکھکر کالندی حیران اور بھونچکی سی رہ گئی اسے خود ہی اپنی قسمت پر رشک ہونے لگا۔ بیوگی کی بے لطف اور تکلیف دہ زندگی کو تیاگ کر اس نے ایک قطعاً نئی اور انوکھی دنیا میں قدم رکھا تھا۔

اس کے برے دن اب گذر چکے تھے۔ شوہر کی موت کے بعد اسے جن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا، ان کی یاد ہی سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اب اس کی زندگی کی مرجھائی ہوئی ٹہنی پر امید کی نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں آج اپنے ماضی پر غور کرنے سے بھی اسکا جی گھبراتا تھا۔

میٹھی نیند سے میٹھی میٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی وہ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھی۔ کافی پینے کے بعد راؤ صاحب اور کالندی کھڑکی سے [illegible] رہے تھے۔ راؤ صاحب کہنے لگے "نہیں

گھر پسند آیا کہ نہیں؟"

"کیوں نہیں یہ بنگلہ کتنا خوبصورت ہے کتنا پُرسکون، کتنا دلکش۔"

"لیکن، تم نے ابھی پورا بنگلہ دیکھا کہاں! آؤ چلو دکھا لائیں۔"

راؤ صاحب اور کالندی بنگلے کا ایک ایک کمرہ دیکھ پھر کر دیکھنے لگے۔ دروازے پر آویزاں خوش رنگ [illegible] دیکھ کر اس نے پوچھا کہ یہ کہاں کا بنا ہوا ہے؟"

"اسے میری پہلی بیوی نے بنایا تھا۔ وہ جو میرے نام کا بورڈ لگا ہوا ہے وہ بھی اسی نے بنایا تھا۔"

کالندی [illegible] ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ اتنے میں وہ دیوان خانہ میں جا پہنچے۔ کونے میں رکھے ہوئے گراموفون کو دیکھ کر کالندی بولی" اور گراموفون.....؟"

"ہاں اسی کے لئے خریدا تھا اسے گانے [illegible]"

کالندی کی خوشی پر پانی پھر گیا۔ اس نے گراموفون کو ہاتھ نہ لگایا۔ بھویں تن گئیں۔

راؤ صاحب ایک ایک چیز کی تاریخ بیان کر رہے تھے لیکن کالندی پر گویا [illegible] کی سی کیفیت طاری تھی۔ پہلی بیوی کی نشانیوں سے سجے ہوئے بنگلے کو دیکھ کر اس کا سارا حوصلہ کافور ہو گیا تھا۔ سامنے لگے ہوئے [illegible] اور پہلی بیوی کے فوٹو پر نگاہ پڑتے ہی اس کا جی چاہا [illegible] ٹھوکر مار کر اسے چور چور کر دوں

"یہ بیٹھنے کا کمرہ..... یہ کمرہ ان کو شادی کے وقت تحفے کے طور پر ملا تھا" اس کے مرنے کے بعد سے یہ کمرہ بند پڑا تھا۔ دیکھو تو سہی کتنی خالی [illegible] ہوئی ہے۔

راؤ صاحب بنگلے کی [illegible] کا حال سنا رہے تھے۔ کالندی آپے سے باہر تھی۔ اس کی سمجھ میں ایک لفظ نہ آیا۔ وہ تو دروازے کے پردے پر کڑھی ہوئی تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ پردے کو ہاتھ میں اُٹھایا اور چھوڑ دیا ممکن ہے اس کی سوتن ہی نے وہ تصویر بنائی ہو۔

"یہ سونے کا کمرہ......؟" آگے جانے اور سننے سے کالندی نے انکار کر دیا۔

باورچی خانے کی کتنی ہی چیزیں اس کی سوتن کی یاد دلاتی تھیں۔ وہ چڑھ گئی۔

راؤ صاحب سے کوئی ملاقات کرنے آیا، لہٰذا انہیں باہر جانا پڑا۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بال کھولے اس کا چہرہ کمہلا گیا تھا مسرت کی لہریں مٹ چکی تھیں۔ گھر کی سابقہ مالکہ کے خیال نے ایڑی سے چوٹی تک آگ لگا رکھی تھی۔ اس کی ایک ایک نشانی کو برباد کئے بغیر کالندی کو آرام نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان چیزوں کا نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑے گی۔ گھریلو اشیاء کی پہلی ترتیب کو بگاڑ کر نیا انتظام کیا جائیگا۔ ورنہ نئی دنیا میں نئے سرے سے بہار نہیں آ سکتی۔

کالندی نے دانتوں تلے دبا ہوا چوٹی کا ڈورا اور زور سے دبایا اور بالوں کو جھٹک کر پیچھے پھینک دیا۔

راؤ صاحب کچہری جانے لگے تو اپنے ہاتھ سے بنا کر انہیں پان دیا۔ اور ہنسی خوشی انکو رخصت کیا ان کے جانے کے بعد اس کے چہرے پر مضبوط عزم اور متانت کے آثار ہویدا ہو گئے وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبا کر بار بار اپنے ارادے کی پختگی کا ثبوت دے رہی تھی۔

کچہری سے موٹر واپس آنے پر اس نے ڈرائیور کو بلایا "اس کاغذ پر لکھا ہوا سامان ٹھیک سے لا سکو گے؟"

"جی سرکار!"

اتنے میں باورچی اپنے گھر جانے لگا۔ کالندی نے اسے قریب بلا کر کہا کیا باورچی خانے میں کسی نئے برتن کی ضرورت نہیں؟"

باورچی خاموش کھڑا رہا۔

جاؤ دیکھو کونسا برتن کم ہے۔ پرانے برتن نکال دو اور ایک نئی فہرست پیش کرو۔

باقی دو ملازموں کو بلا کر دیواریں صاف کرائی گئیں پھر ڈرائنگ روم کا سامان باہر نکلوا کر دوبارہ اپنے ہاتھوں سے ترتیب دیا گیا۔ ایڈورڈ خریدنے کے خیال سے گراموفون بیچا۔ بیک وقت ہوا کمروں کی پرانی تصویریں نکلوا دی گئیں لائے بہت فوٹو اور ان کے لئے۔ غالیچوں کو جھاڑ کر از سر نو بچھایا گیا۔ خوابگاہ کو مہمان خانے میں تبدیل کر دیا۔ اور پلنگ اٹھوا کر دوسرے کمرے میں بچھوا دئے اور اس کو نئے ساز و سامان کے ساتھ آراستہ کیا۔ غرض اسی طرح دوسرے کمروں کی بھی کایا پلٹ کر دی گئی۔ اب راؤ صاحب کی پہلی بیوی کی کوئی بھی چیز کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔

خوش آمدید کے پرانے بورڈ کے بجائے نیا بورڈ سجایا گیا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے تک تبدیل کر دئے گئے۔ باورچی خانے کو نئے ڈھنگ سے سنوارا۔ غرض باتھ روم کا رنگ بھی بدل گیا لائبریری بھی اس زبردست انقلاب سے محفوظ نہ رہی۔ کئی الماریاں ادھر کی ادھر تبدیل کر دی گئیں۔ پائیں باغ میں بھی مناسب تبدیلیاں شروع کر دی گئیں۔ برسوں سے گھسی ہوئی روشوں پر کئی ہوئی سرخی کے انبار لگ گئے۔ مالی کو باغ کی نگہداشت و ترقی کے نئے نئے احکام مل گئے غرض دن بھر یوں اٹھا۔

کالندی کے حکم سے بنگلے کی ترمیم و تنسیخ میں معروف رہا ادھر اُدھر بکھری ہوئی چند کتابوں پر کالندی کی سوتن کا نام لکھا ہوا تھا وہ بھی اس نے بالالتزام مٹا دیا۔

جس طرح بادشاہ اپنے مفتوحہ علاقے کے حکمرانوں کی چھوٹی سے چھوٹی یادگار بھی فنا کر دینا چاہتا ہے بالکل اسی طرح کالندی اپنے شوہر کی پہلی بیوی کی تمام نشانیوں کو ایک ایک کرکے مٹا رہی تھی۔

گھر کا نیا روپ دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسنے اب اطمینان کی سانس لی۔ اسے جیسے کسی روحانی مسرت کا گہرا احساس ہونے لگا۔ گھڑی میں دو بج چکے تھے۔ تین بجے راؤ صاحب آنے والے تھے۔ کالندی آئینے کے سامنے گئی بال بکھرے ہوئے اور چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی وہ عجلت سے غسل خانے میں گھسی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

پہلے کالندی نے اپنی کنگھی سے ساڑی درست کی پھر پنڈلیوں تک پاؤں دھوڈالے لوٹا فرش پر رکھ کر وہ پھر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس نے بالوں کی دراز ریشمی لٹیں ایک جھٹکے سے سنواریں گردن کو بائیں طرف جھکا کر داہنے کان کی لونگ نکالی اس کے بعد گردن داہنی طرف موڑی بائیں کان کی لونگ نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ یکایک رک گئے اور وہ بجد متین نظر آنے لگی اس کا چہرہ زرد اور نامعلوم ہو رہا تھا۔

وہ نہ جانے کتنی دیر اسی حالت میں کھڑی لونگ کو دیکھتی رہی رخساروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ہونٹ سوکھ گئے اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

یہ لونگیں اس کے پہلے شوہر نے بڑے پیار سے اسے

دی تھیں

اس نے اپنی سوتن کے لگائے باغ کو روند کر تہس نہس کر ڈالا تھا اور اس طرح ماضی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ غیر ارادی طور پر دل میں اس کے اپنے ماضی کی یاد تازہ ہو گئی۔ . . . . . پہلے شوہر کی تصویر آنکھوں کے آگے ناچنے لگی اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔

بابو راؤ صاحب کچہری سے واپس آکر کالندی کی پوچھ گچھ کر رہے تھے

گھر کا انقلاب نقشہ دیکھ کر انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ یکایک انھوں نے جیب سے گھڑی نکالی اور ہمیشہ کی عادت کے مطابق گھڑی کا پچھلا ڈھکنا کھولا۔ اس میں اپنی پہلی بیوی کی تصویر دیکھ کر وہ چونک پڑے اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئے

اس عالم آشنا کی نہیں ہے نظر کہاں
مجھ کو چھپائے دامنِ شام و سحر کہاں

وارفتۂ جمال کو اتنی خبر کہاں
لوحِ جبیں کہاں ہے نیا سنگِ در کہاں

اب آندھیوں میں آئے نشیمن نظر کہاں
دے گا کسی کا ساتھ کوئی عمر بھر کہاں

ہے میرے سازِ دل پہ کوئی نغمہ گر کہاں
نالہ تو کر رہا ہوں مگر وہ اثر کہاں

جھپکی ہوئی نگاہ سے دیکھا کئے مجھے
تارے بھی عافیت سے رہے رات بھر کہاں

روپوش تم تو جلوہ دکھاتے ہی ہو گئے
یہ تو بتا دو جائیں خرابِ نظر کہاں

ان کا ہی کچھ نشان ہے نہ میرا ہی کچھ پتہ
گمراہیوں میں چھوڑ گیا راہبر کہاں

آ، دو دکر گلستاں میں نہ آیا کرے بہار
اب خوں فشانیوں کے لئے ہے جگر کہاں

درد آشنا سمجھا نہ ہوا کوئی چارہ ساز
دل میں چھپا ہوا تھا دو تیرِ نظر کہاں

ایم سیزرونوف وزیر خارجہ روس اور سفیر جرمنی کی بلمزا ملاقات کے بعد روسی حکومت نے مکمل اجتماع افواج کا حکم دیدیا اور اس نے اپنے سفیر مقیم پیرس کو تار دیا کہ

"جرمنی سفیر نے آج کھلم کھلا مجھے بتا دیا کہ اگر روس اپنی لام بندیوں کو نہیں روکتا تو حکومت جرمنی لازمی طور پر فوجی نقل و حرکت شروع کر دے گی۔ درحقیقت یہ سب آسٹریا کی آٹھویں کور کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ آسٹرین شہنشاہیت کے امن شکن اقدامات تیزی کے ساتھ یورپ کو عالمگیر جنگ تک لئے جا رہے ہیں۔ آپ براہ کرم فرانسیسی حکومت کو تمام صورت حال سمجھا دیجئے۔"

کاؤنٹ پورٹلیس (سفیر جرمنی) کے روسی دفتر خارجہ سے رخصت کے بعد فوراً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دفتر خارجہ کے اراکین کو خود زارِ روس مخاطب کر رہا تھا

"میں نے ابھی ابھی قیصر جرمنی کا ایک پیغام وصول کیا ہے جسکا مضمون یہ ہے کہ:-

"آرچ ڈیوک (ولی عہد آسٹریا) کا قتل ہم سب کے لئے یکساں طور پر قابلِ مذمت ہے اور میں ذاتی طور پر اس چیز میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ کی حکومت بھی آسٹریا و سربیا کی نزاع کو دوستانہ طور پر ختم کرنے کی خواہشمند ہوگی۔ میں حکومت آسٹریا کے اراکین پر زور ڈال رہا ہوں کہ وہ روس اور دوسری حکومتوں کے مشورے سے کسی دوستانہ اور امن پسندانہ معاہدہ پر متفق ہو جائے مجھے امید ہے کہ آپ میری امداد کرینگے۔"

زار روس کے پیغام کے جواب میں ایم سیزرونوف نے جواب دیا کہ

"ابھی ابھی سفیر جرمنی نے مجھ سے ملاقات کی ہے اور دھمکی دی ہے کہ اگر روسی حکومت فوجی کارروائیوں کو نہ ملتوی کرے گی تو جرمن گورنمنٹ بھی جوابی طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوگی۔"

زار کو تعجب ہوا کہ قیصر اور اس کے سفیر کے اقوال میں کسقدر تضاد ہے؟ بہرحال زارِ روس نے قیصر کو دوستانہ جواب دیا کہ:-

"روسی حکومت سروی و آسٹروی نزاع کو (HAGUE) بین الاقوامی عدالت کے سپرد کر دینے کو طیار ہے۔"

قیصر کو جواب دینے کے بعد روسی وزارت خارجہ کے دفتر میں فوجی جنرلوں کی ایک نجی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ بحث کی گئی کہ چونکہ عام اجتماع افواج کا تریب

امکان ہے اس لئے مکمل اجتماع افواج کا حکم دیدینا بڑی گڑبڑ پیدا کرے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ خطرے کو ملحوظ رکھ کر عام فوجی نقل و حرکت کا حکم دیدیا جائے چنانچہ روس کے جنرل سٹاف نے زار کی تائید حاصل کر کے پیرس و لندن کے روسی سفیروں کو اطلاع دیدی اسی روز شام کے وقت ایم سیزونوف نے آسٹروی سفیر کو شرف ملاقات بخشا اور ان دونوں کے درمیان وائنا اور سینٹ پیٹرسبرگ کے مابین مراسلات بند ہوجانے کا تذکرہ آیا۔ ابھی یہ دونوں اچھی طرح گفتگو بھی نہ کرنے پائے تھے کہ اچانک وزیر خارجہ کو ایک ٹیلیفونی پیغام وصول ہوا جسکا مدعا یہ تھا کہ:۔

"بلغراد (پایہ تخت سرویا) پر بمباری شروع کر دی گئی ہے......"

اس پیغام کو سن کر ایم سیزونوف کا طرز عمل بدل گیا اور اس نے آسٹروی سفیر سے جھنجلا کر کہا کہ:۔

"آپ صرف وقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپکا مدعا یہ ہے کہ ایک طرف تو صلح کی گفتگوئیں چھیڑی جائیں اور دوسری طرف بے بنے شہروں پر بمباری کی جائے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اچانک سرویا کے پایۂ تخت پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ صلح کی بات چیت کے وقت آپ کی پوزیشن مضبوط ہوجائے"

آسٹروی سفیر اس تیز گفتگو کے بعد سخت رنج کی حالت میں روسی دفتر خارجہ سے اٹھ آیا

روس کی فوجی لام بندیوں کا ذمہ دار جنرل ڈبرو ولسکی تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ۲۹ جولائی سنہ ۱۹۱۴ء کی صبح کو نو بجے کے قریب وہ وزارت جنگ کے دفتر میں گیا اور جزوی اجتماع افواج کے حکم کو ٹائپ کرنے کیلئے کلرکوں کو دیا۔ مگر تیس منٹ بعد جنرل کو زار روس کا دوسرا حکم وصول ہوا کہ فوجی کارروائیوں کو ملتوی کر کے عام فوجی نقل و حرکت کا حکم دیدیا جائے۔ چنانچہ ڈبرو ولسکی نے اپنے سابقہ حکم کی تمام کاپیاں واپس کرلیں۔ پھر اسی روز آدھی رات کے قریب جنرل کو زار کی طرف سے دوسرا حکم وصول ہوا جس کا مفہوم یہ تھا کہ "جزوی اجتماع کی کارروائیوں کو جاری رکھا جائے۔ زار کے خیال میں یہ تبدیلی قیصر ولیم کے اس پیغام کی وجہ سے پیدا ہوئی جس کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"میں وائنا میں صفائی کی کوشش کر رہا ہوں اس لئے روسی حکومت کی فوجی طیاریاں میرے مقاصد صلح کو خطرے میں ڈالدیں گی اور وہ سانحہ جس کو ٹالنے کیلئے ہم مشترکہ طور پر کوشش کر رہے ہیں اور قریب آجائے گا

عام فوجی کارروائی کے بجائے جزوی اجتماع افواج کی خبر سیزونوف کو رات کے گیارہ بجے کے قریب ملی۔ دو گھنٹے بعد اسکے اور جرمن سفیر کے درمیان دوبارہ ملاقات ہوئی روسی کہتے ہیں کہ جرمن سفیر نے ملاقات کی خواہش کی اور جرمن کہتے ہیں کہ سیزونوف نے جرمن سفیر کو بلایا بہرحال پھر دونوں کے درمیان یورپ کی سیاسیات زیر بحث آئیں۔ سیزونوف نے کاؤنٹ پورٹلیس سے کہا کہ صرف جرمن گورنمنٹ ہی آسٹریا کو اس کے عظیم ترین اقدامات سے روک سکتی ہے۔ اس کا جواب سفیر نے یہ دیا کہ عالمگیر جنگ کو ٹالنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ سرویا و آسٹریا کی نزاع کو مقامی بنا دیا جائے اور دول مغرب اس مقامی سانحہ سے دلچسپی لینا چھوڑدیں۔ سفیر نے وزیر خارجہ کو یہ بھی یقین دلایا کہ آسٹروی شہنشاہیت، ریاست سرویا کے کسی علاقے پر قبضہ کرنا نہیں چاہتی

اس سے روسی حکومت کو مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اس پر سیزونوف نے جواب دیا کہ روسی حکومت کبھی ریاست سرویا کو بہ حیثیت اک محکوم علاقے کے نہیں برداشت کر سکتی ہے۔[1]

اس کے بعد پورٹلیس نے فوجی کارروائیوں کیطرف توجہ کی۔ اور کہا کہ آپ کی حکومت کا یہ جنگی حکم مغربی سیاسیات کے افق پر چھا گیا ہے۔ سیزونوف نے جواب دیا کہ جب تک معاملات کے پرامن طریقے پر حل ہونے کی امید نہ ہو اس وقت تک اس حکم کے واپس لینے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اسی دوران میں عام اجتماع افواج کی خبر فرانسیسی سفیر پیلیولاگ کو ۱۱ بجے رات کو ملی: "اس وحشتناک خبر نے فرانسیسی سفیر کہتا ہے کہ مجھے بھونچکا کر دیا۔ کیا یہ ممکن نہیں۔ اس نے استدعا کی کہ" اس وقت اس حکم کو واپس لے لیا جائے۔ اور صرف جزدی اجتماع افواج پر قناعت کر لی جائے۔ اگرچہ وہ یہ بھی مانتا ہے کہ اس حکم کے جواز میں جو دلائل دئے گئے تھے وہ کافی قوی تھے۔ بہرحال آدھی رات کے قریب پیلیولاگ کو جزدی اجتماع افواج کے حکم کی اطلاع مل گئی اور اس نے اس اطلاع کو پیرس منتقل کر دیا۔

۳۰ جولائی کو اسووسکی نے فرانس کے وزیر جنگ سے ملاقات کی: وزیر نے کہا کہ وہ روس کی فوجی طیاریوں میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اس نے مشورہ دیا کہ ان کوششوں کے پیش نظر جو برلن و وائنا میں امن کے مقاصد کیلئے کی جا رہی ہیں روس کی فوجی طیاریاں اس قدر پوشیدہ ہونی چاہئیں کہ صورت حال میں گڑبڑ نہ پڑے۔ فرانسیسی وزیر جنگ کے مشورے کے جواب میں روس کے فوجی ایلچی (اسووسکی) نے یقین دلایا کہ ہم" امن کے کاز ..... کے لئے سب کچھ کرنے کو طیار ہیں۔ روسی حکومت بلاشبہ اس دوران میں حتی الامکان فوجی نقل و حرکت سے اپنے کو باز رکھنے کی کوشش کریگی۔

اس اثناء میں وائنا کے اندر زبردست سرگرمیاں جاری تھیں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کی شام کو سیزونوف اور آسٹروی سفیر میں بحث و گفتگو کا منقطع سلسلہ دوبارہ شروع کیا گیا تھا مگر بلگراڈ پر بمباری کی خبر سے وہ اچانک ملتوی ہو گیا تھا۔ اس سے قبل بھی وائنا اور سینٹ پیٹرسبرگ کے درمیان مذاکرات بند تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو روسی سفیر نے کاؤنٹ برچٹولڈ وزیراعظم ہنگری سے ملاقات کر کے یہ خواہش کی تھی کہ ریاست سرویا کے جواب کو مصالحت کو ابتدائی نقطہ کی حیثیت سے شروع کیا جا سکتا ہے" اسکے جواب میں کاؤنٹ نے کہا کہ اب ایسا کرنا ممکن نہیں کیونکہ آسٹریا اور ہنگری کی رائے عامہ کے لئے یہ چیز ناقابل برداشت ہوگی۔ اور پھر اسی صورت میں کہ اعلان جنگ کیا جا چکا ہے سرویا سے صلح کی سلسلہ جنبانی ممکن نہیں:" اگرچہ دوسرے روز سے کاؤنٹ نے تاجدار آسٹریا کو رپورٹ دیتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ" اگرچہ ہم نے سرودی نوٹ پر کسی قسم کی بحث و گفتگو کرنے کے لئے انکار کر دیا ہے: تاہم آئندہ بحث و نظر جاری رکھنے کے لئے ہم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ روسی و آسٹروی باہمی تعلقات پر عام گفتگو جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اسی روز آسٹروی سفیر سینٹ پیٹرسبرگ نے بھی اسی چیز کو دہرایا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کو پھر کاؤنٹ برچٹولڈ نے روسی سفیر سے ملاقات کی لیکن کسی خاص موضوع پر بحث نہ ہو سکی۔ اسی دن دو بجکر ۲۰ منٹ پر ☆

☆ کاؤنٹ برچٹولڈ نے کاؤنٹ زیپری (برلن) کو ہدایت کی کہ وہ ایم سیزونوف سے گفت و شنید کریں اسی دوران میں جرمنی کی رائے عامہ برابر مطالبہ کر رہی تھی کہ موجودہ ساکھ کو [illegible] کے لئے کوئی زبردست عملی قدم اٹھایا جائے۔

[1] آسٹریا کی دستاویزات جلد ۳ نمبر ۱۹

زباں پہ نغمے نظر میں جلوے حجابِ فرقت اٹھا رہا ہوں
چمن میں وہ مسکرا رہے ہیں قفس میں میں مسکرا رہا ہوں

غمِ جنوں کی کسے ہے فرصت جنونِ غم آزما رہا ہوں
قسم ہے احساسِ بندگی کی انھیں میں اپنا بنا رہا ہوں

جمالِ معنی رہیگا آخر رہینِ شرم و حجاب کبتک؟
مجھے بھی یہ آج دیکھنا ہے اُٹھیگا رخ سے نقاب کبتک؟

وہ لاکھ مستور ہوں نظر سے مری رسائی کہاں نہیں ہے
اِدھر نہیں ہے اُدھر نہیں ہے یہاں نہیں ہے وہاں نہیں ہے

نگاہِ جلوہ طلب کا پردہ حجابِ ہفت آسماں نہیں ہے
وہاں بھی اکثر میں جا چکا ہوں جہاں کوئی درمیاں نہیں ہے

بہل سکا جذبۂ حقیقت نہ بزمِ سینا کی جلوتوں میں
طلب کیا ہے کسی نے مجھ کو حریمِ اسریٰ کی خلوتوں میں

ہزاروں دعویٔ بے نیازی وہ بے نیازِ وفا نہیں ہے
ہزار اظہارِ خود نمائی وہ اسقدر خود نما نہیں ہے

ہزار ہو وہ جفا کا خوگر زباں پہ عذرِ جفا نہیں ہے
وہ باہمہ دوری و جدائی دلِ حزیں سے جدا نہیں ہے

غرورِ حسن و جنونِ غم میں نہیں ہے اب امتیاز باقی

نہ فرقِ ہجر و وصال قائم نہ حدِ ناز و نیاز باقی

وہ کنت کنزاً کا راز داں ہے تو کنت کنزاً کا راز ہو میں
وہ ناز افروز ناز پرور تو سر سے پا تک نیاز ہو میں
اسیرِ گیسوئے شوق ہے وہ شہیدِ تمکینِ ناز ہوں میں
مجازِ حسن و جمال ہے وہ ہلاکِ حسنِ مجاز ہوں میں

کرم کی امید کس لئے ہو اگر وہ محوِ کرم نہیں ہے
یہ کیسے کہہ دوں یہ کیسے مانوں کہ اسکو احساسِ غم نہیں ہے

اِدھر بھی اے جلوۂ حقیقت نگاہِ لطف آشنا کبھی ہو
جہاں کا حاجت روا ہے تو ہی کبھی کی حاجت روا کبھی ہو
یہ روز و شب انتظار کب تک ازل کا وعدہ وفا کبھی ہو
جو حسن تھا وقفِ لن ترانی وہ حسن جلوہ نما کبھی ہو

تو اپنے ناکامِ آرزو کو فسانۂ آرزو سنا دے
تجھے قسم اپنی رحمتوں کی پیامِ لا تقنطوا سنا دے

غریب کوکب کی حسرتوں کا شمار ممکن نہیں کسی سے
نہ مٹ سکیگی اذیتِ غم، سرورِ صہبائے شاعری سے
وہ تنگ آیا ہے در حقیقت خود اپنے احساسِ بیدلی سے
الٰہی مرگِ دوام بہتر غمِ جدائی کی زندگی سے

نقاب دیدی ز رخ بیفگن جمالِ عالم فروز خواہم
بہ جستجوئے تو آم پریشاں نہ ساز جویم نہ سوز خواہم

چار دن کی چاندنی

سید محمد یزدانی ایم۔ اے

میرے جسم کے ہر ہر گوشے میں اندھیرا ہے، میرے دل میں، میری نگاہوں میں، میرے خیالات میں، اور میری عجیب طبیعت میں، میری دنیا میں اور میری زندگی میں مثل شب تاریک کے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ گویا میری حیات کا ایک ایک لمحہ سیاہ جامے میں ملبوس اور اندھیری کمرے میں مقید ہے

لیکن اے میری زندگی تو اس تاریکی کے عالم میں کس طرح قائم و برقرار ہے؟ کیوں اور کس لئے؟ شاید چار دن کی چاندنی.... اسی امید پر میرے وجود کا انحصار ہے... ... اسی لئے باغِ امید کے گل شگفتہ نظر آ رہے ہیں۔ ہاں، اسی لئے کہ وہ ذرّاتِ الفت مثل تاروں اور ماہتاب کے چمک کر اندھیرے میں امید کی روشنی پہونچا دیتے ہیں۔

میرے دریائے دل میں ایک تلاطم اٹھتا ہے ہر ایک موج دماغ سے ٹکراتی ہے۔ کبھی کبھی چشموں سے جاری ہو کر دلِ حزیں کی کلفت کو کم کر دیتی ہے اور پھر سکوت۔ میرا دریائے دل ساکت ہو جاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں۔ اس ہیبتناک خاموشی میں جب سارا عالم خواب شیریں کے مزے لیتا ہے جب دنیا کی ہر شے غفلت کی نیند میں مصروف ہوتی ہے جب آسمان پر ستارے زمین والوں کی خاموشی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ جب مجھ کو چاند کی روشنی یاد آتی ہے۔ اس وقت میرے دل میں ایک درد، ایک ٹیس۔ آہ! اور ایک ہوک سی اٹھتی ہے

شب کا آخری پہر ہے اور میری طبیعت سخت بےچین ہے لیکن اب ماہتاب نکل آیا ہے۔ چاندنی۔ آہ! کیسی چاندنی چھٹکی ہے۔ باغ بہار کا ایک ایک شجر نظر آنے لگا۔ قدرت نے رنگا رنگ کے گل کھلائے ہیں۔ کلیاں چٹک چٹک کر شگفتہ ہو رہی ہیں۔ نسیم مسرت کچھ اس طرح دامن سنبھال کر چلی ہے کہ چمن کی شمیم اپنے جامے سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ دماغ کو ایسا معطر کر دیتی ہے کہ میرے ساکن حواس اسوقت مچلنے پر تیار... لیکن... میں... مثل بلبل... ہاں بے پر شکستہ

اُجالے میں سب کچھ نظر آ رہا ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ میری آہ کا دھواں یا میرے نالوں کی بھاپ اُٹھکر چار دن کی روشن زندگی پر دھندلاہٹ نہ پھیلا دے۔ میرے تخیلات کی کشمکش اور چمکنے والے ماہتاب کی دلفریبی نے میری دنیا کو آباد کر رکھا ہے۔ میری اندھیری کلفتیں عیش میں مبدل ہو جاتی ہیں لوگوں کی دنیا اسوقت سونی ہو جاتی ہے۔ لیکن میں.... میری دنیا... میرا دل... ہمیشہ سے سونا ہے... مگر یہ وقت میرے لئے انتہائی مسرت کا ہوتا ہے۔ چاند کے روشن رخ میں میری الفت کا پر تو نظر آتا ہے اسی سے میرا دل بہلتا ہے میں تمہیں اپنے قریب پاتا ہوں۔ لیکن آہ! صبح ہو جاتی ہے دنیا غفلت سے بیدار ہو جاتی ہے میرے لئے یہ وقت انتہائی دہشت انگیز ہوتا ہے۔ میں دنیا کے ہنگاموں سے باہر بھاگتا ہوں دنیا والوں سے دور... بستی سے علیحدہ... اس محشر خیال سے الگ اور ایک ایسی جگہ تلاش کرتا ہوں جہاں پھر سکون ہو... پھر خاموشی ہو... اور میں وہاں تمکو یاد کرتا ہوں

میرے لئے

عظیم حیدرآبادی عثمانیہ

فصلِ گل میرے لئے عہدِ خزاں میرے لئے
ہر قدم پر ہے نیا رنگِ جہاں میرے لئے

محوِ آرائش ہے وہ حسنِ جواں میرے لئے
زندگی کا ساز ہے نغمہ فشاں میرے لئے

سعیٔ تسکین ہے امیدِ رائگاں میرے لئے
ہر زمیں ہے آسماں ہی آسماں میرے لئے

ڈوبتی ہے کشتیٔ امید بحرِ ہجر میں
ایک طوفاں بن گئے اشکِ رواں میرے لئے

آسماں پر جس طرح ہے ماہِ تاباں کی چمک
کاش ہوتا وہ قمر بھی ضوفشاں میرے لئے

قصۂ عیش و مسرت اب سنے جاتے نہیں
بن گئی غمناک دل کی داستاں میرے لئے

جل رہا ہوں ایک مدت سے بعنوانِ حیات
وقف ہیں سوزِ دروں کی گرمیاں میرے لئے

چاکِ گل ہے در حقیقت چاکِ داماں کا پیام
لو بہار آئی بعنوانِ خزاں میرے لئے

مسکرا کر کہہ رہی ہیں آج وہ خود اے عظیم
آپ نے بیجا اٹھائیں سختیاں میرے لئے

جوانی اور محبت

مرزا انتظار بیگ کے قلم سے

اگر جوانی کی قیمت پر محبت کو خرید لیا جائے تو اس سے زیادہ سستا سودا دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

میرے نزدیک شاعروں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ جوانی و محبت کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔

محبت ایک غیر محسوس نشے کا نام ہے لیکن جوانی اگر محسوس کی حد سے نکل جائے تو اس سے زیادہ قابلِ نفرت چیز دنیا میں کوئی نہیں۔

جوانی کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے بے پناہ جذبے کا نام ہے لیکن وہ مقصد کیا ہے۔۔۔ محبت

جذبات کی رو میں بہنا جوانی ہے اور ان جذبات پر مجبوراً قابو پانا محبت ہے

محبت کے غلط استعمال کا نام۔۔۔ جوانی ہے

میرے پاس صرف ایک چیز ہے۔۔۔ جوانی لیکن اگر دوسری بھی ہوتی تو میں کائنات کا خوش قسمت انسان ہوتا۔

جوانی اور محبت میں صرف اتنا فرق ہے کہ جوانی کی تو تعریف کی جا سکتی ہے مگر محبت کی نہیں

جوانی رحمت بھی ہو سکتی ہے اور عذاب بھی۔ لیکن محبت اگر عذاب ہو گئی تو جوانی ہو جائے گی۔

ترجمہ

ڈاکوؤں کو بھگانیوالا
خوفناک امریکن پستول
گھوڑا
خوفناک آواز
نالی
STEVENS CO CROMWELL CONN U.S.A.
اصلی پستول کی طرح اسمیں کارتوس رکھنے کی چرخی بنی ہوئی ہے اور اس کے اندر چھ خانے بنے ہوئے ہیں ان چھ خانوں میں چھ کارتوس آجاتے ہیں کھٹکا دبانے سے چرخی خودبخود گھومتی ہے اور کارتوس کی زور سے چھوٹنے کی آواز آتی ہے کہ خود چھوڑنے والا بھی حیران رہ جاتا ہے اپنی جان و مال کی حفاظت کیلئے اس پستول سے بہتر اسوقت کوئی ریوالور نہیں ہے اس میں ۱/۴ انچ کارتوس چلتے ہیں اس پستول کا وزن ۱۵ اونس ہے۔ لمبائی ۶ انچ ہے۔ انسان دور سے دیکھکر خوفزدہ ہو جاتا ہے قیمت ایک پستول کی للعہ چار روپے آٹھ آنے۔
اس کے ساتھ ۲۵ کارتوس مفت دیے جاتے ہیں۔ زائد کارتوس منگانے سے ایکروپیہ میں ایک سو (۱۰۰) ملیں گے محصولڈاک ایک پستول پر ۸ آنے
ملنے کا پتہ:-
جی کے برادرس اینڈ کو نمبر ۵۵ دھلی
دو منٹ میں طاقت
ایک امریکن ڈاکٹر کی حیرت انگیز ایجاد ہے ٹینگ آئل
یہ وہ حیرت انگیز ایجاد ہے جس کے ایک قطرے میں مردی طاقت پوشیدہ ہے نہ پان باندھنے کی ضرورت اور نہ کپڑا لپیٹنے کی حاجت صرف ایک قطرہ لگائیے اور فوراً دیکھئے۔ کہ دنیا کے کمزوروں کو یہ دوا آبِ حیات ثابت ہوری ہے امریکن ڈاکٹر نے کئی سال میں یہ دوا تیار کی ہے اس کے بعد عام اعلان کیا گیا ہے ایک شیشی میں ۴۲ بار کیلئے دوا ہوتی ہے قیمت فی شیشی دو روپیہ سات آنے محصولڈاک بذمہ خریدار ہوں گے پتہ :-
اکسیری دواخانہ کلاں محل نمبر ۵ دہلی ۶
نصف گھنٹے تک
امساک کی ایسی دوا جو حقیقتاً بے ضرر اور فائدہ میں زود اثر ہو بڑی مدت کے بعد ہمکو حاصل ہوئی ہے۔ اس میں مفر صحت یا منشی جز ذرہ برابر نہیں ہے صرف دواؤں اور کیمیاوی ترکیب کو اس کے تیار کرنے میں دخل ہے اب دنیا میں امساک کی یہ ایسی اکسیری دوا تسلیم کرلی گئی ہے کہ جسکی مثال نہیں ملسکتی ایک گولی سے اسوقت تک اثر رہتا ہے جب تک نمک یا ترشی کا استعمال نہ کیا جاوے۔ سرعت کی شکایت کو دور کرنے اور شرمندگی سے بچانے میں خوشنصیبی بیمثل ایجاد ہے قیمت فی شیشی ایک درجن ۱۲ دو روپیہ۔ محصولڈاک ۷ ر سات آنے پتہ :-
اکسیر دواخانہ کلاں محل نمبر ۵ دھلی
محبوب آپکا غلام
"پر اسرار مست خوشبو" ایک عجیب ایجاد جو آج تک دیکھی نہ سنی گئی یہ ایک قسم کا روغن ہے جس کو اگر کوئی عورت سونگھ لے تو مست ہو جائے کسی کو اپنا بنانا ہو تو اسکے پاس سے گذر جاؤ وہ تمہارا ہو جائیگا۔ تمہاری تلاش میں رات دن ایک کر دیگا خوشبو میں ایسی تاثیر ہے کہ سونگھتے ہی مطلوب بے چین ہو جاتا ہے اور طالب کیلئے دن رات ایک کر دیتا ہے اس کو محبت کا جادو، تسخیر کرنے کا طلسم اور رام کرنے کا عطر کہا جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی عہ دو روپیہ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ ملنے کا پتہ:-
گڈلک ٹریڈ ایجنسی دریا گنج دھلی ۶

صنف نازک
نگرانِ اصول
ناہید اختر
عفت آنولوی
اراکین ادارہ
عنایت مجید بیگم
لاہور
نواب ذکیہ سلطانہ
ذکی
ذکیہ نگہت
بریلوی
سعیدہ خاتون
صابری

سرخ گلاب

تیسری قسط

محترمہ انور سلطانہ صاحبہ ماہرخ

گھر میں کھانے کو روٹی نہیں اور اپنے کو سمجھتے ہیں۔ لاٹ صاحب تم نے بتول کو تو دیکھا ہی ہے۔ ذرا خدا نے صورت شکل اچھی کیا دیدی اور دو لفظ لکھ پڑھ کیا گئی ہے کہ اپنے کو ملکہ سمجھنے لگی ہے۔ میرا ایسا مذاق اڑایا کہ میں رونی ہوگئی۔ وہاں ملی تھی نا خالہ کے یہاں شادی میں۔ دنیا بھر کی بدصورت پڑیلوں کی سی شکل کی چھ سات چھوکریاں اور تھیں اس کے ساتھ پہلے تو قہقہے لگاتی پھریں۔ پھر وہ بتول ان چڑیلوں کو لے کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی تعارف کرانے لائی ہوں"۔ میں اُن ذلیلوں سے کیا بولتی کھسیانی ہوکر میرے پاس سے تو چلی گئیں مگر تھوڑی دور جاکر خوب میری نقلیں اتاریں اور مذاق اُڑاکر مجھے جلایا۔ میں تو ان رذیلوں کے گھر نہیں جاؤنگی"۔

ماں نے سوچا کہ اس کا راستی پر آنا مشکل ہے۔ اس لئے انھوں نے کہا" تمہیں قاسم کی بیوی سے ملنا ہے بتول سے نہیں"۔ مگر بتول ہوگی تو وہاں ضرور ہی۔ بھاوج کے ہی ساتھ تو رہتی ہے اور کہاں جائیگی۔ ماں باپ کو تو کھالیا۔ شادی کہیں ہوتی نہیں ہے۔ سب قابلیت اور حسن پڑا جھک مار رہا ہے"۔ حاسد اور بدمزاج زہرہ تو اور نہ معلوم کیا کہتی مگر ماں نے یہ کہہ کر قصہ ختم کیا کہ رہتی تو بھاوج کے ہی پاس ہے مگر آج کل بہن کے یہاں گئی ہوئی ہے"۔

بہ مشکل زہرہ قاسم کے یہاں جانے پر راضی ہوئی

قاسم ایوب کا بچپن سے دوست تھا اگرچہ دونوں کے حالات میں بعد المشرقین تھا۔ مگر خیالات وعادات اور مزاج کی ہم آہنگی وقت کے ساتھ رشتۂ محبت کو استوار کرتی چلی گئی۔ میٹرک پاس کرتے ہی قاسم کی شادی ہوگئی تھی چونکہ اس کی والدہ مرچکی تھیں اور گھر میں صرف دو بہنیں کلثوم اور بتول تھیں۔ قاسم کی گذر اوقات اس کے والد کی معمولی سی پنشن سے ہوتی تھی۔ اور بنک کے کچھ شیئر (حصص) بھی ان کے کفیل تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد قاسم ملازمت کے حصول میں عرصے تک سرگرداں رہا۔ اسی دوران میں اس کے والد نے کلثوم کی شادی کردی۔ جو کچھ جمع تھا، شادی کی نذر ہوا۔ اور پھر قاسم کے والد کا انتقال ہوگیا۔ پنشن بند ہوئی۔ بنک دیوالیہ ہوگیا، آمدنی کے راستے بند ہوگئے اور قاسم پر ایک کوہ مصیبت ٹوٹ پڑا۔ مجبوراً اسے اپنی بیوی اور بہن کو اپنی سسرال بھیجکر بمبئی جانا پڑا۔ وہاں دو سال تک وہ ایک ملازمت کرکے اپنا پیٹ پالتا رہا۔ اور کچھ پس انداز کرکے بیوی اور بہن کو بھیجتا رہا۔ بتول اس دو سال میں کچھ عرصے بھاوج کے ساتھ رہی، کچھ عرصے بہن کے پاس

آخر خدا نے قاسم پر رحم کیا اور اسے اپنے شہر کے ریلوے ورکشاپ میں اسی (۸۰) روپے کی مستقل ملازمت ملگئی قاسم کے دل میں مدت سے یہ آرزو تھی کہ وہ بتول کی شادی ایوب کے ساتھ کرے۔ جانتا تھا کہ "دولت و ثروت گو میرے پاس نہیں ہے مگر ایوب کو اس چیز کی ضرورت بھی نہیں ہو اسے دو چیزیں چاہئیں۔ حسن صورت اور حسن سیرت یہ دونوں دولتیں قدرت نے بے انتہا فیاضی سے بتول کو دی ہیں۔ مگر قاسم کی یہ آرزو صرف آرزو ہی تھی۔ ایک ایسی آرزو جو کبھی لب تک نہ آئی ہو۔ قاسم جب ملازم ہو کر اپنے متعلقین سمیت وطن آیا تو اس نے ایوب کے نکاح کی خبر سنی تھوڑی سی شکایت تو ضرور ایوب سے ہوئی کہ نکاح کی خبر تک نہ دی مگر اسے کوئی رنج نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ بتول کے لئے بہتر سے بہتر رشتہ مل سکتا ہے۔

دعوت کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ قاسم کے مکان کا اوپر والا کمرہ جس کا زینہ سڑک کی طرف تھا منتخب ہوا کہ ایوب اس کمرے میں بیٹھے اور زہرہ کی نشست نیچے صحن میں اس حساب سے رکھی گئی کہ اوپر سے بآسانی دیکھی جاسکے۔ ایوب اس روز صبح ہی گھر سے شکار کا بہانہ کر کے چلا گیا تھا۔ دن کو تین بجے وہ قاسم کے مکان پر آیا اور اپنی منتخب جگہ پر قاسم کے ساتھ بیٹھ کر زکیہ کا انتظار کرنے لگا۔ زہرہ کو چار بجے بلایا گیا تھا مگر وہ سوا پانچ بجے پہنچی۔ ایوب جو سڑک کی طرف بیٹھا انسپکٹر صاحب کی کار کا انتظار کر رہا تھا۔ دور سے ہی کار کو دیکھ کر پہچان گیا۔ دل میں خیالات کا ایک طوفان موجیں مارنے لگا۔

بے چینی سے اس نے نیچے دیکھنا شروع کیا۔ دو ماماؤں کی معیت میں بڑے اہتمام اور پردے کے ساتھ زہرہ کار سے اتریں۔ مسز قاسم نے جو دروازے پر استقبال کیلئے کھڑی تھیں۔ خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔ زہرہ بیگم زریں ملبوسات اور مرصع زیورات سے آراستہ تھیں اس میں شک نہیں کہ زکیہ خوبصورت تھی مگر اس کا کیا علاج کہ زہرہ کو دیکھتے ہی ایوب سناٹے میں آگیا۔ اس کی آرزو پر اوس پڑ گئی۔ ہوائی قلعہ جو اس نے طیار کیا تھا، منہدم ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر مگر بے انتہا مایوسی سے کہا "قاسم زہرہ وہ نہیں ہے۔ آہ اب میں کیا کروں اپنی محبوبۂ دلنواز کو کہاں تلاش کروں؟" قاسم نے دیکھا کہ ایوب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ہے۔ اس پر مردنی سی چھا گئی ہے۔

قاسم کہنے لگا "ایوب ہمت سے کام لو۔ تم سمجھ دار ہو کر ناسمجھ کیوں بنتے ہو۔ دوست یہ حماقت ٹھیک نہیں زہرہ بیگم سے تمام عمر کا ساتھ ہے اس کے حسن کو نگاہ میں لاؤ کیسی نادانی ہے کہ تم ایک ایسی ہستی کے متلاشی ہو جس کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ مجھے اپنی اس وارفتگی کی بنیاد تو بتا دو یا ایک بے بنیاد بات کے لئے زندگی تباہ کرنا چاہتے ہو" ایوب شدت غم سے اپنے ہوش و حواس کھو رہا تھا وہ گم سم بیٹھا رہا۔ قاسم کے الفاظ گویا سنے ہی نہیں۔ اس کے سامنے وہی خواب والا منظر تھا۔ اس کی محبوبہ اس کی نظر کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس محویت سے بیدار کیا جائے۔ مگر قاسم نے اسکا شانہ ہلاتے ہوئے پھر کہا "بھائی نادان نہ بنو۔ آخر کیا سوچ رہے ہو؟ کچھ بولو تو سہی"

"تم کہے جاؤ" ایوب نے جواب دیا۔ "میں سنتا ہوں مگر سمجھ نہیں سکتا۔ مجھ سے زہرہ کا کوئی واسطہ نہیں۔ میں تمام عمر کسی کی تلاش میں خاک چھانتا رہونگا۔ یہ میرا عاجلانہ فیصلہ نہیں ہے"

"تم دیوانے ہوئے ہو؟" قاسم بولا۔

"ہاں" ایوب کا جواب تھا" وہ وقت دور نہیں جبکہ دنیا والے مجھے دیوانہ کہنے پر مجبور ہوں"۔

مسز قاسم کے برابر باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی مگر زہرہ . . . . . وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے کسی بات کے جواب میں ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا . . . .

. . . . . . ایوب نے برابر رکھی ہوئی میز پر سے ایک کتاب اٹھالی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ قاسم پھر ایوب کے دل بہلانے کے خیال سے بولا" اور خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا مگر حضرت تم نے اس بہانے سے میری بیوی کو خوب دیکھا"۔

لاحول ولاقوۃ" ایوب نے کہا۔ عجیب دقیانوسی ہو مجھ سے تو قسم لے لو، ان کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اگر فرض کرو دیکھ بھی لیا تو کیا ستم ہوا۔ میری بھی بھاوج ہیں کوئی غیر نہیں۔ پھر تم احسان کیوں کرتے ہو، اٹھو تم زہرہ کو دیکھ لو۔ چلو دونوں کا پلہ برابر رہے گا"۔

ایوب بگڑ کر کہنے لگا" تو گویا مجھے تمہاری" مخدومہ" کو دیکھنے کی کوئی خاص ضرورت تھی؟"

قاسم بولا" ممکن ہے ہو"۔

"ارے" ایوب نے حیرت سے کہا۔ اب تک تو نہ خواہش تھی نہ میں نے دیکھا، مگر اب دیکھتا ہوں۔ بتاؤ کیا کرتے ہو میرا"۔

یہ کہکر ایوب نے کھڑکی میں سے نیچے کو جھانکا۔ اور "اف" کہہ کر گویا وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اس کے منہ سے کچھ اور نکلنے کو ہی تھا مگر وہ دفعتہً سنبھل گیا۔ زہرہ ایک مغرور ملکہ کی طرح سامنے تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کی داہنی طرف مسز قاسم پاندان آگے رکھے بیٹھی تھیں اور تخت کے بائیں کنارے کے پاس وہی ایوب کی محبوبہ غارتگر ہوش و حواس کھڑی تھی۔ وہی حسن تھا وہی دلکشی تھی اور وہی خط و خال۔ وہی انداز اور وہی سادگی۔ اس کے خوبصورت بالوں میں سرخ گلاب کا ایک بڑا سا پھول لگا یا ہوا تھا۔ ایوب کو ایک چکر سا آیا۔ اور وہ بہ عجلت کھڑکی سے ہٹ گیا قاسم نے ہنسکر پوچھا:-

دیکھ لیا مسز قاسم کو؟"

جی ہاں۔ ایوب بھی جواب میں مسکرایا، مگر میں نے پہچانا نہیں۔ ذرا بتاؤ تو ان دونوں میں مسز قاسم کونسی تھی

چوری اور سینہ زوری" قاسم نے ہنسکر کہا۔ وہ اپنے دل میں خوش تھا کہ کس خوبی سے ایوب کا کام غلط کر دیا پھر اس نے کھڑکی کے پاس لے جا کر ایوب سے کہا" یہ ہیں میری" مخدومہ" جو ذکیہ کے پاس بیٹھی ہیں۔

اور وہ؟" ایوب نے اپنی محبوبہ کی طرف اشارہ کرکے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ میری چھوٹی ہمشیرہ ہے" قاسم نے لاپرواہی سے بتایا۔

ایوب کا چین آرام مٹ گیا۔ نیندیں اڑ گئیں۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ بتول کو نہ بھول سکا۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ اپنے دوست کا مار آستین ثابت نہ ہو، بتول کو بھلادے جیسے کہ وہ اسے جانتا ہی نہیں۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوا۔ جوں جوں وقت گذرا ایوب کی محبت کی خلش بڑھتی رہی۔ دن تڑپ تڑپ کر گذرتا تو رات کالا پہاڑ بن کر خرمن ہستی پر گری ؎

ابتدائے عشق میں ہی ہم گئے جاں سے گذر
ہو محبت کا الٰہی دیکھئے انجام کیا

یہ جانتی ہوں محبت ہی زندگانی ہے
اگرچہ گیت محبت کے گنگناتی ہوں،
اثر میں لیتی ہوں ہاں نغمۂ محبت سے
اگرچہ میری بھی نظمیں ہیں بعض رومانی
مری نظر میں بھی ہے عشق کی ہمہ گیری
میں اسکو جانتی ہوں خود خدا محبت ہے"
اسی کے سحر سے مہتاب و مہر ہیں روشن،
نظامِ زیست منظم اسی کے جادو سے
یہ اہلِ دل کو ہے قدرت کا تحفۂ معصوم
اسی کے آگے ہے یہ کائنات سر بسجود
مگر مجھے ہے ندامت کہ باوجود اس کے
مجھے تو عشق ہے قدرت کے شاہکاروں سے
میں جان دیتی ہوں رنگِ جمالِ گلشن پہ
ہے بے پناہ محبت تبسمِ گل سے

قبولِ مہر و وفا مقصدِ جوانی ہے،
گداز و سوز سے بھر اُٹھکے جھوم جاتی ہوں
خدا گواہ! نہیں انحراف الفت سے
جمال ریز ہے جن میں کہ عشق لافانی
عیاں ہے مجھ پہ بھی الفت کی سحر تاثیری
برب کعبہ! مرے دل میں اسکی وقعت ہے
اسی سے نور فشاں حسنِ وادی ایمن!
زمین و چرخ ہیں قائم اسیکے جادو سے
وہ بدنصیب ہے اس سے جو رہ گیا محروم
ہے اہلِ قلب و نظر کے لئے یہی "معبود"
کسی کی ذات سے الفت نہیں ذرا بھی مجھے
حسین ستاروں سے وجد آفریں بہاروں سے
نثار کرتی ہوں دل کو شفق کے دامن پر
جمالِ غنچہ و صوتِ جمیلِ بلبل سے

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ہندوستان میں تقلید کا مرض بہت بُری طرح پھیل رہا ہے اور اب تو گویا بالکل متعدی ہو چکا ہے۔ جہاں تک تقلید کا تعلق ہے اسے کوئی برا نہیں کہہ سکتا۔ بشرطیکہ اُس کا آغاز و انجام ضروری غور و فکر کے منازل سے گذر چکا ہو۔ مگر کورانہ تقلید تو درحقیقت بشریت اور انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما دھبہ ہے جس کا انجام صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ نہایت مہلک ثابت ہوگا۔

مردوں سے زیادہ عورتوں میں یہ مرض پایا جاتا ہے اور خصوصاً مسلمان عورتیں جو زیادہ تر جاہل طبقے سے تعلق رکھتی ہیں مگر جن پر قدرت کی خاص عنایات و نوازشات ہوتی ہیں، وہ اس مرض کی شکار ہو رہی ہیں۔ علم و دولت کی یکجائی تو ایک دوسرے کو سنبھال سکتی ہے۔ مگر جہاں دولت تو موجود ہو مگر علم کا فقدان ہو وہاں پر سوائے اس کے اور کیا ہوگا کہ نہایت مضحکہ خیز طریقہ سے دولت کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔ یہ کلیہ بالکل عام بھی نہیں۔ مگر زیادہ یہی صورت دیکھنے میں آ رہی ہے۔

جاہل اور کم عقل ہونا بھی حقیقت میں ایک گناہ ہے اور "دولتمند جاہل" ہونا تو میرے خیال میں گناہِ عظیم ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ جو جاہل ہوتے ہوئے دولتمند بھی ہیں اُن کا اس نعمت پر کوئی حق نہیں۔ یہ تو اللہ میاں کی دین ہے۔ جسے چاہا دیدیا۔ جسے چاہا محروم کر دیا۔ مگر میں یہ ضرور کہونگی کہ اس نعمت کا صحیح استعمال کرنے کے لئے "جاہل دولتمندوں" کو تہذیب و تمدن کے حصول کیلئے اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لانا چاہئے تاکہ وہ حقیقی معنوں میں "رئیس" کہلائے جانے کے حقدار ہو سکیں اور اگر "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" کے مصداق انکو اس جماعت سے خارج بھی قرار دیدیا جائے تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ایسی صورت میں اُن جاہل دولتمندوں کو اپنے ہی حال میں مست رہنا چاہئے اور اپنی امارت کے زعم میں دوسروں کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہئے۔

اس سلسلے میں چند واقعات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گو یہ واقعات اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ظاہر ہو جائیگا کہ اسی قسم کے سیکڑوں واقعات آئے دن ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ جو ہماری زندگی پر ایک ابدی نقش کندہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان معمولی واقعات کا تدارک کرنے کے لئے ایک منظم جماعت قائم کی جائے تو اس جماعت کو اس قدر کام کرنا پڑے جس کا ابتدا میں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا

ہمارا خاندان اگرچہ بہت تعلیم یافتہ نہیں لیکن اتنا جاہل اور بے بہرہ بھی نہیں جو تعلیم یافتہ کی حدود سے خارج سمجھا جا سکے۔ امارت البتہ ہمارے پاس ہو کر بھی نہیں گذری

مگر ہمارے ذرائع اس قدر محدود بھی نہیں جو ضروریاتِ زندگی
کے ہی مشکل سے کفیل ہو سکیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہم نہایت
اطمینان سے گذر بسر کر رہے ہیں اور خاندان کی عزت کو بچائے
جا رہے ہیں۔

عائشہ بہن کی شادی ہو چکی ہے اور چونکہ اُنھیں
خوشبو سے خاص رغبت ہے اس لئے اچھی اچھی دل پسند
خوشبوؤں کا استعمال کرتی رہتی ہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک
"جاہل دولتمند" کا مکان ہے کبھی کبھی اُن کے ہاں کی مستورات
ہمارے یہاں بھی چلی آتی ہیں۔ امیر ہوتے ہوئے بھی امارت
سے فائدہ اُٹھانے کے ڈھنگ نہ جاننے والے کس قدر بدقسمت
انسان ہیں۔ . . . میں تو انھیں بدقسمت ہی کہونگی جنھیں
خدا کی دی ہوئی نعمت کا صحیح استعمال بھی نہ آتا ہو۔ ذات کے
تو کمہار ہیں، مگر اللہ میاں نے جی کھول کر پیسہ عطا کیا ہے گھر
کے چند افراد حج بیت اللہ شریف سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔
اور اب حاجی جی کے نام سے عوام میں مشہور ہیں۔ کیوں نہو
اُن کے پاس دولت بھی تو ہے۔

ہاں تو حاجی جی کی بیوی جو ابھی نوعمر ہی ہیں۔ اکثر
ہمارے ہاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ عائشہ بہن پر بھی ان کی خاص
نظر کرم رہتی ہے۔ اور ان کے پاس ہی زیادہ بیٹھک بھی ہے
شاید اُن کے لباس میں ہی کچھ جاذبیت اور کشش ہوگی،
جو وہ بی پڑوسن اُدھر ہی زیادہ رجوع کرتی ہیں اور حقیقت
بھی یہی تھی۔ گو یہ بعد میں معلوم ہوا۔

ایک دن آپا سے پوچھنے لگیں کہ بہن آپ یہ کیا لگاتی
ہیں جو آپ کے کپڑے اس قدر مہکتے ہیں، مجھے تو اس خوشبو
میں بہت مزہ آتا ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی یہ ہے کیا ؟

آپا کو پہلے تو بے اختیار ہنسی آ گئی لیکن جلد ہی اس کو
ضبط کر کے بولیں۔ کہ یہ عطر ہے کوئی اور شے نہیں۔ اسی کی
خوشبو سے دل و دماغ معطر رہتے ہیں۔ پھر جب بی پڑوسن
کا اشتیاق بڑھتے بڑھتے "معلومات کی حدود تک جا پہونچا
تو آپا نے دو چار عطریات کے نام بھی بتادئے اور بات آئی
گئی ہوئی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد جو میری پڑوسن پھر ایک
دن معرف حجن ہمارے ہاں تشریف لائیں تو دوران گفتگو
میں ایک زبردست انکشاف ہو گیا، معلوم ہوا کہ اس دن
جو وہ گھر واپس گئیں تو جاتے ہی اپنے شوہر سے عطر کی فرمائش
کر دی اور وہ تمام نام بھی گنوا دئے جو آپا نے انھیں بتائے
تھے اور یہ بھی تاکید کر دی کہ شام کو یہ تمام نمونے آجانے چاہئیں

خیر چہیتی بیوی نئی نویلی دلہن اور حاجی جی کی منظور نظر
بھلا اس کی فرمائش کی تکمیل کیوں نہ ہوتی۔ اسی دن سب
کچھ آ گیا اور پھر اکثر آیا کیا، لیکن کتنا آیا اور کس طرح استعمال
کیا گیا۔ یہ ہمیں صرف اسی روز معلوم ہوا جب بی پڑوسن
نے اپنا کارنامہ نہایت فخریہ انداز سے ہمیں سنایا۔

کہنے لگیں "بہن سچ ہے اس خوشبو سے بھی جسے دماغ
کے ساتوں طبق "روشن" ہو جاتے ہیں۔ طبیعت بہت ہی خوش
رہتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ ہم باغ میں بیٹھے
ہوئے پھولوں کی خوشبو سونگھ رہے ہیں۔ آپ نے اس دن
جو نام بتائے تھے۔ میں نے سارے کے سارے منگا کر دیکھے
مگر مجھے تو بس "یہ بیلا" پسند آیا اور اب میں روز اسی کو لگاتی
ہوں۔ شام کو آتے وقت حاجی جی ایک پیسے کی پھریری روزانہ
میرے واسطے لے آتے ہیں اور یہی اب بھی میں نے لگا رکھا ہے"

عطر اور وہ بھی ایک پیسے کی پھریری" واللہ لطف ہی
آ گیا۔ یہ سن کر میرا اور آپا کا ہنسی کے مارے پیٹ پھٹا جا

تھا۔ مگر ضبط کرنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ یہ تفریح کا سلسلہ جو اکثر و بیشتر اسی طرح ہماری دلچسپی کا باعث بنتا تھا ہم سے چھن جاتا۔ بہرکیف ہم نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی اور اُن کی پسند کی داد دی۔

مگر آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ ایک مالدار شوہر کی دل پسند بیوی، جس کے پاس بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ نقد وزیور کی صورت میں موجود تھا۔ اس کی ضروریات ایک پیسہ روزانہ کے حساب سے "پھریری" کی صورت میں پوری ہوتی تھیں اور وہ اسی میں مگن تھی۔ کیونکہ اب اس کا لباس بھی معطر تھا۔ اس کے کپڑوں میں سے بھی خوشبو کی لپٹیں اُٹھتی تھیں۔ وہ بھی آجکل کی پڑھی لکھی عورتوں کی طرح فیشن پرستی میں دوسروں کے دوش بدوش جا رہی تھی۔۔۔

۔۔۔ اللہ غنی ۔۔۔ "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

ایک اور واقعہ سنئے!

چند روز ہوئے عائشہ بہن کی ایک سہیلی نے انھیں اپنے ہاں دعوت میں مدعو کیا اور یہ بھی لکھا کہ اگر اس محفل سے لطف نہ اُٹھایا تو تمام عمر کفِ افسوس ملنا پڑیں گے۔۔۔ یہ تاکیدی جملہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ اس قدر عجیب اور بااثر ثابت ہوا کہ آپا نے باوجود اپنی علالت کے بھی اس دعوت میں جانا منظور کر لیا۔ چونکہ طبیعت چند روز سے مضمحل اور پریشان تھی اس لئے ساتھی کی ضرورت درپیش ہوئی۔ اور چونکہ میرے اسکول کی تعطیل ہو چکی تھی اس لئے والدہ سے اجازت لے کر مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئیں۔

محفل واقعی نہایت شاندار تھی آپا کی سہیلی کے کوئی عزیز ولایت سے تعلیم حاصل کر کے کامیاب اور سرخرو واپس [illegible] جس کی خوشی میں یہ دعوت دی گئی تھی۔ باہر مردانے کی چہل پہل سے تو ہمیں نہ واسطہ نہ غرض لیکن گھر کا اندرونی ماحول ضرور غور طلب تھا۔ اس لئے میں نے اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔

بلا مبالغہ پچاسوں عورتیں چلتی پھرتی، اُٹھتی بیٹھتی بولتی، چالتی نظر آ رہی تھیں، طرح طرح کے لباس، کہیں ساڑھی، کہیں شلوار اور کہیں وہی آڑا پاجامہ اپنی اپنی جگہ نہایت خوبصورتی سے زیب دے رہے تھے۔ ہر طرف باسلیقہ اور بامذاق مستورات کے گروہ نظر آتے تھے۔ مگر اس ہجوم میں، اس دعوتِ تہنیت میں ایک بیگم ایسی بھی تھیں جو تقریباً حاضراتِ محفل کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ میں بھی ذرا آگے کو بڑھ گئی تاکہ انھیں خوب غور سے دیکھ لوں۔ آپا کو بھی ساتھ ہی کھینچ کر لے گئی تاکہ میں صورتِ حالات کو اگر اچھی طرح نہ سمجھ سکوں تو وہ میری امداد کر سکیں۔ ابھی ہم چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ صدیقہ (آپا کی سہیلی) بھی راہ میں مل گئیں، انھیں بھی گھسیٹ لیا۔ مگر جب انھوں نے ہمارے جذبِ شوق کے سمندر میں ایک طغیانی، ایک تلاطم، ایک طوفان سا اُٹھتا ہوا دیکھا تو گھبرا کر پوچھنے لگیں خیر باشد! آخر کس غنیم پر چڑھائی ہے؟ اور جب میں نے اشارے سے بتایا کہ اُدھر کا تماشہ دیکھنے جا رہے ہیں تو ہنس کر کہنے لگیں کہ اب تو وہاں ڈراپ سین ہو چکا۔ تم بہت دیر میں پہنچی ہو۔ ورنہ تماشا تو واقعی دیکھنے کے قابل تھا۔

اتنے میں ہم اس مجمع کے قریب پہنچ گئے۔

صدیقہ بولیں، کہ یہ صورت تو اب دیکھ لو پھر واقعات بھی سن لینا۔ بہت دلچسپ کہانی ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوشپوش، شریف صورت، سیدھی سادی بھولی بھالی بیگم ایک چارپائی پر دراز ہیں اور دو چار عورتیں ان کے دائیں

پاؤں کا ٹخنہ مل رہی ہیں

معلوم یہ ہوا کہ بیوی ہیں تو ایک نہایت ہی متمول اور امیر گھرانے کی بہو، لیکن تعلیم کے پاس سے بھی نہیں گذریں پرانے زمانے کی باتیں اب تک ان میں پائی جاتی ہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اپنی شان کو بڑھانے اور بجانے کے لئے دوسروں کی دیکھا دیکھی بہت سی ایسی باتیں کر بیٹھتی ہیں جو دوسروں کے لئے دلچسپی کا باعث اور انکی بے وقعتی کی علمبردار بن جائیں۔ مگر یہ بھولی بھالی اس قدر ہیں کہ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔

بات یہ ہوئی کہ وہ بیگم ایک عمدہ سی ساری میں، ملبوس تھیں اور اس کی زینت کو بڑھانے کے لئے ایک سینڈل شو بھی پہن کر آئی تھیں جو نہ صرف اونچی ایڑی کا تھا۔ بلکہ اس کی ایڑی اس قدر اونچی تھی کہ وہ آسانی سے چل پھر بھی نہ سکتی تھیں۔ شاید پہلی دفعہ ہی ایسی چیز کا استعمال کیا تھا، جو ہر ہر قدم پر پاؤں ڈگمگاتے تھے اور بار بار ٹھوکر کھا کر گرتی تھیں۔ مگر چونکہ امیر گھر کی بہو تھیں اور وضع دار گھرانے میں مدعو کی گئی تھیں۔ اور جو فیشن کے لحاظ سے اچھی خاصی نا آشنا تھی۔ اس لئے انھیں بھی اپنی بات اونچی رکھنے کے لئے اس قدر تگ و دو سے کام لینا پڑا۔ کہ جوتا بھی پہنا تو وہ بھی اونچی ایڑی کا۔ نئی چیز کا استعمال طور و طریق سے لاعلمی، چلنے پھرنے سے ناواقف۔ آخر ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہوئی چلتی رہیں۔ حاضرات محفل کے لئے تو گویا یہ ایک تماشا تھا جسکا نہ دیکھنا سخت گناہ تھا اسلئے سب کی توجہ ادھر ہی مبذول ہو گئی، جس سے وہ بیچاری اور بھی گھبرا گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ تو کچھ اس طرح تیورا کر گریں کہ پاؤں میں موچ آ گئی۔ اور بیچاری لمبی لمبی لیٹ گئیں

یہ بھی اسی اندھی تقلید کا نتیجہ تھا۔ جس کا ذکر میں اوپر کر چکی ہوں اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جسطرح بھی ہو سکے ہم اس متعدی مرض کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ ورنہ نتائج اور بھی زیادہ خطرناک اور ناقابل تلافی ہو جائیں گے

ایک روز کا اور مزیدار واقعہ سنئے۔ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اور غالباً مئی یا جون کا مہینہ تھا۔ ہمارے ایک قریبی عزیز کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا بہت سی فیشن پسند خواتین اور تعلیم یافتہ لڑکیاں حسب دستور اپنے اپنے شاندار لباسوں اور قیمتی زیوروں کی نمائش کے لئے موجود تھیں۔ شدت کی گرمی، بلا کا حبس اور پھر مجمع، تمام کمروں، دالانوں اور صحن میں عورتیں بھری پڑی تھیں۔ اسی مجمع میں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بھی موجود تھیں جو اپنے لباس کی نمائش میں سب سے پیش پیش تھیں اور جنھوں نے صرف دکھاوے کیلئے اپنے جسم پر اتنے کپڑے لاد رکھے تھے، حالانکہ گرمی کی وجہ سے وہ گویا پسینے میں نہائی ہوئی اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھیں اور پھر لطف یہ کہ اس لبادے پر انھوں نے زیوروں کی بھی ایک معقول تعداد استعمال فرمائی تھی۔

ہوا یہ کہ گھمس ہجوم اور گرمی میں ایک بار انھیں غش سا آ گیا اور وہ بیچاری یا بدست دگرے دست بدست دگرے دوسرے مکان میں لے جائی گئیں اور ان کے جسم سے جب ان فضول اور بے مصرف سامانوں کا بوجھ اُتارا گیا تب کہیں انکی طبیعت ٹھکانے آ گئی۔ خدا کرے ہماری ہندوستانی بہنیں تقلید کے مرض سے اپنے کو آزاد کریں اور ملبوسات معاشرت اور روزانہ کی زندگی میں سادگی کو اپنا شعار بنائیں۔

ایک نفیس مزاج مہارانی نے

اپنے صدر اعظم سے کہا کہ دنیا کے ہر بہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں۔ تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں۔ تعمیل حکم کیلئے فردوس مثال کشمیر جنت نظیر سوئٹزر لینڈ۔ شباب انگیز عثمانیہ کے گلپاش مرغزاروں میں گلچینی کی گئی۔ جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا۔ مہاراجہ کو فکر دامن گیر ہوئی، اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے ——

سیوکوں کی دکان رجسٹرڈ میڈ لسٹ پرفیومرز سے سیول سینٹ فلاور رجسٹرڈ، منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی۔ فوراً عمل کیا گیا۔ جب سیول سینٹ فلاور رجسٹرڈ آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایکبار پھر اپنی پوری بہاریں لئے ہوئے واپس آ گیا،

سیوکونکی دکان رجسٹرڈ میڈ لسٹ پرفیومرز امرتسر

چوک مراد آباد —— نیا بازار سہارنپور

ہمارے یہاں ہر قسم کی خونی بادی بواسیر کے لئے دوا مفت ملتی ہے۔ دوا حاصل کرنے کیلئے ڈاک ٹکٹ بھیجکر پتہ بالا سے معلوم کریں

برباد مرے حسرت و ارماں کا چمن ہے
دل ہجر میں آماجگہِ رنج و محن ہے
کیوں او ستم آرا ! یہی پیمانِ کہن ہے
سے صاف میں کہتی ہوں کہ اب زیست کٹھن ہے
______ تو عہد شکن، عہد شکن، عہد شکن ہے
______ ______ تو عہد شکن ہے

کیوں بھول گیا عہدِ محبت کی کہانی ؟ ______
پھر لوٹ کے آئیں گے نہ ایام جوانی ؟ ______
ہے عمر کی رفتار کہ دریا کی روانی ؟ ______
خاموش نہ ہو پھر یہ تقاضائے سخن ہے ______
______ تو عہد شکن، عہد شکن، عہد شکن ہے
______ ______ تو عہد شکن ہے

اللہ کرے تو بھی یوں ہی اشک فشاں ہو ______
محسوس تجھے بھی تپشِ سوزِ نہاں ہو، ______
جب تو بھی یونہی محرمِ فریاد و فغاں ہو، ______
تب سمجھے کہ یہ سوزِ محبت کی جلن ہے ______
______ تو عہد شکن، عہد شکن عہد شکن ہے
ریحانہ جمال ______ ______ تو عہد شکن ہے

للہ کبھی تو نگہِ لطف ادھر بھی ——————
دل سوزِ جدائی سے ہے بیتاب جگر بھی ——————
کرتا نہیں تو میری طرف ایک نظر بھی ——————
کیا یہ ہی اسیرانِ محبت کا چلن ہے ——————

—————— تو عہد شکن، عہد شکن، عہد شکن ہے
—————— —————— تو عہد شکن ہے

کس طرح بھلاؤں وہ طرب ریز زمانہ ——————
وہ نغمۂ عشرت وہ مسرت کا زمانہ ——————
جب تھا مرے ہونٹوں پہ محبت کا فسانہ ——————
یا آج نہ وہ ذوق نہ وہ رنگِ سخن ہے ——————

—————— تو عہد شکن، عہد شکن، عہد شکن ہے
—————— —————— تو عہد شکن ہے

ریحانہ! کہاں تک یہ شکایاتِ محبت، ——————
سنتا نہیں وہ حرف و حکایاتِ محبت، ——————
تو کہہ دے کہ اے رہزنِ جذباتِ محبت ——————
بے سود یہ سب کوشش درمانِ محن ہے ——————

—————— تو عہد شکن، عہد شکن، عہد شکن ہے
—————— —————— تو عہد شکن ہے

میں نے دریچے میں سے جھانکا۔ دو ننھی ننھی لڑکیاں بھاگی ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے بھاگنے کے انداز کو پہچان کر آواز دی

او۔ او صغیراً! کہاں جا رہی ہے، ادھر دیکھ بی بی گھونگریالے بالوں والی معصوم بچی نے مڑ کر دیکھا

کیا ہے بھیّا۔۔۔؟

ارے۔۔۔ کہاں جا رہی ہو تم دونوں؟ میرا سوال تھا

کہیں نہ بھیّا، ہاں گاؤں میں ایک ڈاکٹرنی آئی ہے ہم اسے دیکھنے جا رہے ہیں، بچی نے جواب دیا

تو کیا وہ اپنے ساتھ قیامت لائی ہے؟ اس پر دونوں معصوم دہقانی بچیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ صغیراً کی ساتھی چنبیلا جو ایک ٹھیک کی لڑکی تھی اپنی گول گول آنکھوں کو پھرا کر بولی

وہ آنکھیں بناتی ہے آنکھیں۔ یہ کہا اور مجھے دیکھتی ہوئی دونوں بھاگ گئیں۔ میں گھوم کر پیچھے مڑا۔ کمرے کے دروازے پر نمبردار کا چھوٹا لڑکا اظہر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔۔۔ سلام بھیا شاہد۔۔۔!

سلام" میں نے جواب دیا۔ میرے کمرے پر ہلکی سی نظریں ڈالتا ہوا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا میں نے ہنس کر کہا

بھئی یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی ہے۔۔۔ غریب گاؤں پر۔۔۔؟

کیسی مصیبت؟ اظہر نے استفسار کیا۔

ارے بھئی یہ کون ڈاکٹرنی آئی ہے۔ سنا ہے امراضِ چشم کی نہ صرف ماہر ہے بلکہ آنکھیں بناتی بھی ہے

او۔ ہاں اُسے کہہ رہے ہیں آپ! جی ہاں صبح کی ٹرین سے یہاں ایک لیڈی ڈاکٹر ٹپک پڑی ہیں۔ میں نے بھی صرف سنا ہی ہے۔ بچے کہہ رہے تھے کہ شاندار برقعہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ اس کی اسسٹنٹ بھی ہے۔ پردہ دار ہے۔ سب مردوں کے سامنے نہیں آتی۔ صرف اپنے مریض کے روبرو نقاب اُلٹ دیتی ہے

اچھا یہ بات ہے پھر تو کوئی مسلمان معلوم ہوتی ہے۔ ہو گی شریف زادی۔۔۔؟

ہاں یقیناً۔ اس نے جواب دیا۔ میں یکا یک غیر ارادی طور پر دریافت کر بیٹھا۔ بوڑھیا ہے یا کوئی نوعمر لڑکی؟

اظہر نے میری طرف مسکرا کر معنی خیز نگاہوں سے دیکھا

" پیدائش کی رپورٹ دیکھنا پڑے گی"

میں کہنے کو تو یہ کہہ گیا، مگر بعد کو بڑی شرمندگی ہوئی اظہر کی تنقید سے میں کٹ گیا۔ آف اس کی نگاہوں میں میری ہلکی تضحیک نظر آ رہی تھی۔ میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔ واقعی مجھے اس سے ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے تھا اگرچہ اظہر میرا ساتھ کا پڑھا ہوا تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے میں نے بی۔ اے اور اس نے ایف۔ اے کا امتحان پاس

کیا تھا - ہم دونوں گہرے دوست تھے ، مگر آج تک اس قسم کی باتیں ہمارے درمیان نہ ہوئی تھیں۔ گاؤں میں یہ باتیں ـــــ مذموم ، باعثِ شرم اور قابلِ سزا سمجھی جاتی ہیں - یہی وجہ تھی کہ میرے دوست اظہر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس میں ناگواری نظر آ رہی تھی ، مجھے بڑی کوفت ہو رہی تھی - ایک دم میری روح مسرت میں ڈوب گئی - اس کشمکش سے نجات ملتی نظر آئی - اظہر کہہ اُٹھا - اچھا بھیا اب میں جا رہا ہوں میں نے رسماً کہا :-

پھر آنا ، میں شام کو تمہارا منتظر رہونگا -

ہمارا گھر گاؤں کی سرحد شروع ہونے سے پہلے ہے ، گویا یہ کہئے کہ ریلوے اسٹیشن سے بالکل قریب کھیتوں کے آغوش میں دو اونچی خوشنما پہاڑیوں کے قریب واقع ہے شام کے وقت میرے کمرے کی کھڑکی سے گاؤں کا نظارہ بہت ہی ہوشربا اور دلفریب معلوم ہوتا ہے - لمبے لمبے گھنے سبز درختوں کی چوٹی سے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے گھروں سے نکل کر آسمان کی سمت لہراتا ہوا دھواں ، افق کی سرخ وادی میں سورج کا تمتماتا ہوا سرخ چہرہ جس کے احمریں رخساروں سے پھوٹتی ہوئی کرنیں اور اُن سے دیواروں کی پیشانیوں کا رنگیں ہونا - پتلی پتلی رتیلی سڑکوں پر سے مویشیوں اور گوالوں کا گذرنا یہ سب مناظر اپنے اندر ایسی جاذبیت رکھتے ہیں کہ انسان تقریباً مدہوش ہو جائے - چنانچہ ایسے شاعرانہ سمے میں شام کو گھر میں بیٹھنا میں کفر سمجھتا ہوں - میں نے کھمبوں سے کھیلتے ہوئے سورج کو دیکھا - پھر جلدی جلدی منہ دھو کر تولیہ ہاتھ میں لئے ہوئے باہر نکل آیا - دور ایک کھیت کی طرف پگڈنڈی پر چار پانچ چھوٹے چھوٹے لڑکے جا رہے تھے میں بھی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُن کی طرف آ گیا - میں نے ایک بچے سے پوچھا

"کدھر کی طرف سے آ رہے ہو ننھے . . ؟

"اجی بھیا" سب بچے ٹھہر گئے - ہم ڈاکٹرنی کو دیکھکر آ رہے ہیں

میرا دل چلّا اُٹھا - اوہ ، وہ صبح والی لیڈی ڈاکٹر -
اب اُن سے سب کچھ پوچھ لینا چاہئے - سب کچھ - میں نے ہمت کر کے کہا ، یہ تو بتاؤ وہ کیسی ہے ؟ کیسے علاج کرتی ہے ، تم نے اسے دیکھا ہے ؟ وہ کہاں ہے . . ؟

بچے گھبرا گئے ، ایک جو ہوشیار سا تھا کہنے لگا -

"اجی وہ کچھ آسمانی رنگت کی سی تو چادر اوڑھ رہی ہے - عینک لگائے ہوئے ہے - موٹر میں آئی ہے - سب کا علاج مفت کر رہی ہے - دو عورتیں اور ایک میلا سا آدمی اس کے ساتھ ہے - میموں کی سی رنگت ہے اور . . .

دوسرا لڑکا بات کاٹ کر بھولے پن سے کہنے لگا "اور اس کے بال بالکل ایسے ہیں جیسے تمہارے . . . . "

دور پرانے شیشم کی طرف سے کنوئیں والے چھپر سے ایک بھینس نکل کر بھاگی - اور ساتھ ہی ایک دہقانی کی بھاری آواز آئی - اُو شکورا . . . ارے او رکھاں مر گئے ، بچوں میں کھلبلی مچ گئی ، سب نے بھاگنا شروع کر دیا اور میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا

اب ہلکی ہلکی تاریکی بڑھنے لگی تھی - جنگل کا اداس اور غم انگیز منظر دیکھ کر میرا دل آہیں بھرنے لگا - صحرائی پھولوں کے ایک درخت پہ چند چڑیاں تھک کر بیٹھی تھیں اور ایک سوکھے سے کیکر کی شاخ پر فلفل اِدھر سے اُدھر

پھدک کر اور سیٹیاں بجا کر مجھے پاگل بنائے دے رہی تھی
منظر میں تقریباً روزانہ ہی دیکھتا تھا۔ مگر اس طرح دیوانہ
کبھی نہ بنا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا۔ مجھے اس نیلے برقعہ والی
حور کو ضرور دیکھنا چاہئے۔ ہاں وہ ضرور نور و نکہت کی
دیوی ہے۔ خدا کی قسم! وہ ضرور کوئی مہ جبیں دوشیزہ
ہے۔ میں اسے ضرور دیکھونگا ضرورت میں اِن خاموش رومانی
خیالوں میں الجھا ہوا گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ دو کھیتوں
کے درمیان والی راہ خاصی وسیع تھی۔ پھر اسے جاذبِ توجہ
اور دلکش بنانے کے لئے دونوں طرف کنیر کے حسین پیڑوں
کی لمبی قطاریں تھیں۔ سفید سفید پھول جن کے رخسارے
ستاروں کی طرح روشن تھے۔ اللہ یہ دلآویز پھول جن
کے پردوں میں مجھے خوابوں کے رومانی جزیرے نظر آتے
تھے۔ آہ یہ اس وقت کتنا حسین منظر پیش کر رہے تھے
یک نظر دیکھنے سے کہکشاں کا دھوکہ ہوتا تھا۔

میں نے وارفتگی کے عالم میں جیب سے فاؤنٹین پین نکالا
اور چند شگفتہ و تروتازہ پھولوں کی پتیوں پر لکھنے لگا۔
لیڈی ڈاکٹر۔ ۔ ۔ ۔ لیڈی ڈاکٹر۔ ۔ ۔ ۔ واللہ مجھے کیا
ہو گیا تھا۔ میں نے پھول کو بےساختہ چوم لیا اور دور تک
مڑ مڑ کر اسے دیکھتا ہوا نیم اور پیپل کی اوٹ میں گم ہو گیا۔

ایک دہقانی نوجوان جس کی میری طرف پشت تھی
ایک چھوٹی سی دوکان پر کھڑا تھا۔ گاؤں والوں نے مجھے
دیکھ کر سلام کرنا شروع کر دئے۔ ایک دیہاتی کی آواز
سن کر وہ نوجوان مڑا۔ مجھے دیکھ کر آگے بڑھا۔ میں چلا
اُٹھا۔ اور میاں الیاس تم کہاں؟

اہا ہا۔ بھیا شاہد! وہ مسرت کے ساتھ استعجاب
سے بولا۔ میں کل آیا ہوں۔

یہ ایک رنگین طبع اور رومان پسند نوجوان تھا۔
مدراس میں ملازم تھا اور میرا بڑا گہرا دوست! تعلیم تو معمولی
ہی سی تھی۔ لیکن ذہن و دماغ کی بلندی و رفعت سے بعض
رسائل بھی بخوبی پڑھ لیتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑی
خوشی ہوئی۔ میں سمجھا کہ جیسے مجھے کوئی قیمتی شے مل گئی۔
اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی خوشنما چوپال کی طرف چلنے
لگا۔ چاندا پنے حجلۂ جمال سے نکل کر درختوں کے پتوں سے
جھانک رہا تھا۔ چوپال کی بلند پیشانی اس کی روشنی سے
چمک رہی تھی۔

الیاس میری طرف تبسم آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا
کہئے گاؤں میں کیسی گذر رہی ہے۔ آپ کا دل تو لگ گیا ہوگا
ہاں دل لگ گیا اور یہاں کے مناظر میں تو میں کھو
گیا ہوں۔ دفعتہً گاؤں کی سادہ رنگینیاں میرا دامن نہیں
چھوڑتیں۔ مجھے تو اب صدمہ ہے کہ میری چھٹیاں قریب الختم
ہیں اور میں پھر شہری چیخ پکار میں گھِر جاؤنگا۔

اچھا! الیاس نے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر کہنے لگا
مگر صاحب گاؤں میں رومان کی رعنائیاں تو شاید کم ہیں
میری بیماری اور رسالوں کے نسخہ جات نے اسے واقف
سا کر دیا تھا۔ میں اس کے اِس دلچسپ جملے پر جھوم گیا۔
میں نے مسرت سے مسکرا کر کہا۔ یار! ہاں یہ تو سچ کہتے ہو
مگر میری شاعرانہ افتادِ طبع یہاں کسی کو اپنا مطمحِ نظر بنائے
بغیر کب رہ سکتی تھی۔ میں نے یہاں کے پھولوں اور کھیتوں کو
اپنا محبوب بنا لیا ہے۔ گھنٹوں ان ہی کے نظاروں میں محو
رہتا ہوں۔ یہاں نسوانی حسن تو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے
وہ بھی جنگل میں یا کنوئیں پر۔ پھر بھی دیہاتی دیویوں کو نظر بھر
کر دیکھنے کی جراءت نہیں ہوتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شامتِ اعمال
کو بھی لرزہ آتا ہے۔

الیاس نے میرا جملہ کاٹا . . . خیر چھوڑیئے۔ آپ یہاں مجھ سے پہلے سے ہیں۔ یہ تو بتایئے کہ یہاں لیڈی ڈاکٹر کون آئی ہے۔ سنا ہے کوئی مسلمان عورت ہے اور بڑی حسین ہے

میں جیسے اچھل پڑا۔ میں نے سوال کیا، کون کہتا ہے؟ کون کہتا ہے، نہیں کوئی کہتا ہے اور بھیا! آنکھیں بڑی اچھی بنائی ہے۔ سمبر کے لڑکے اور امامی بھشتہ کی کیا لاجواب آنکھیں بنائی ہیں۔

خدا کی قسم! . . . میں گویا مسرت سے چیخ کر بولا

آپ نے تو دیکھی ہوگی شاید . . . ؟ الیاس نے پوچھا

نہیں مجھے یہ دولت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ کیا میں آنکھوں کا مریض ہوں۔ وہ ستم ظریف تو اسی کے سامنے آتی ہے جو مریض ہو۔ کاش میں اندھا ہوتا۔

خدا نہ کرے۔ کیا باتیں کرتے ہو۔ آپ توبہ کیجئے۔ ایسے کونسے انہیں جواہرات لگے ہوئے ہیں۔

نہ بھی ہوں جواہرات۔ مگر میں تو اسے کسی صورت سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو تخیل میں اتنی جمیل و لطیف ہو وہ بظاہر کتنی حسین ہوگی۔ اے خدا اسکا تصور بھی محال ہے۔ آہ کتنی حسین! موسم بہار کی صبح کے تبسم سے زیادہ دلفریب . . . . کاش کم از کم میری آنکھیں دکھتی ہی ہوتیں! میں نے دل کی گہرائیوں سے آرزو کی۔

اب دکھا لیجئے الیاس تبسم ریز ہو کر بولا

کیا ترکیب کروں میں نے پاگلوں کی طرح پوچھا

آنکھ میں پنسل یا قلم کی نوک مار لیجئے۔ یہ کہکر الیاس نے زور کا قہقہہ لگایا

آہ! تم سچ کہتے ہو الیاس! خدا کی قسم! میں یہی کروں گا۔ میں نے پرجوش اور باعزم لہجے میں کہا۔

اے بندۂ خدا! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ خدا کے واسطے کہیں ایسا نہ کر بیٹھئے گا۔ ناحق میرے منہ سے نکل گیا۔ معاً مجھے اپنی بیہودگیوں کا خیال آیا۔ میں دلی منفعل اور ارادے کے خلاف مسکرا کر کہنے لگا۔

ارے میاں یہ بھی ایک مذاق تھا کوئی ایسا بھی کیا کرتا ہے۔ میں اور کچھ کہنے کو تھا کہ میرا بوڑھا ملازم آدھمکا۔ کم بخت کی یہ بیجا مداخلت مجھے بڑی ناگوار گذری اس نے مجھے بزرگانہ لاڈ سے کہا کہ:۔

"رات کے کھانے کا بھی خیال نہیں" اور ظالم مجھے کھینچ کر لے گیا۔

ہائے اللہ! میں درد سے کراہ رہا تھا۔ میں نے رات کو پنجو کی مضراب اپنی آنکھ میں مار کر اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا کہ کیوپڈ کا تیر صرف دل میں تراز و ہوتا ہے۔ آنکھ سوج کر کپا ہو گئی تھی۔ سرخی کا یہ عالم کہ خون ٹپکتا معلوم ہو رہا تھا درد کی شدت سے میری جان نکلی جا رہی تھی، مگر دل مسرور تھا۔ کہ اس معجزۂ حسن و جمال کو جس کی معصوم خلوتوں تک ایک مرد کا تصور بھی بمشکل جاتا ہے۔ میں آج بآسانی دیکھ سکونگا۔ گھر والے سخت پریشان تھے۔ ٹرین کے آنے میں کچھ دیر تھی اور ایک نوکر شہر جانے کی تیاری کر رہا تھا دوا لانے کے لئے۔ میں نے اپنے مقصد میں ناکامی ہوتے دیکھی تو چیخ اٹھا۔

کیسا ستم ہے ہم تو مرے جا رہے ہیں اور اسے دوا لینے بھیجا جا رہا ہے۔ بغیر آنکھ دیکھے ڈاکٹر کس طرح دوا دیگا۔ اور پھر وہ اتنی مفید بھی نہ ہوگی۔

گھر والوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مسرتوں کی دیوی اپنے حجلہ سے مجھے جھانک رہی ہے اور میری کامیابی پر مسکرا رہی ہے۔ مگر فوراً ہی میرا دل آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ ایک صاحب کی رائے تھی.

"تو پھر شاہد کو لے ہی چلنا چاہئے"۔ کوئی دوسرے گوہر افشاں ہوئے " ہاں پھر کیا کیا جائے لیجانا ہی پڑیگا" میں چلایا میں تو اندھوں کی طرح نہیں چلوں گا۔ مجھے راستے میں شرم نہیں آئے گی کیا؟

والدہ چلائیں۔ یوں بھی نہیں، پھر آخر اور کیا چاہتے ہو۔۔۔؟" میں خاموش ہو گیا۔ یکایک ایک خادمہ۔ جسے شاید الہام ہوتا تھا چلا کر بولی:۔

"جب یہ بات ہے تو اُس ڈاکٹرنی کو کیوں نہیں دکھا دیتیں جو گاؤں میں آئی ہوئی ہے۔

اگرچہ میں تکلیف سے نیم جاں ہو رہا تھا، مگر مارے خوشی کے مسکرانے لگا۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا ڈاکٹرنی کو لینے کے لئے دو تین آدمی گئے میرا مسرت بداماں دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ میں نے آنے والے وقت کی شادمانیوں کا اندازہ لگانا شروع کیا۔ میں اپنی سُرخ آنکھوں سے تصور میں اس دیوی کو گلاب کی نو شگفتہ کلیوں میں لپٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میری تخیل کی دنیا دواؤں کی ناخوشگوار بو اور چشمہ لگائے ہوئے ایک نیلے برقعہ والی دوشیزہ کے تصور کی نکہتوں سے فردوس بداماں بنی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی ضو باریاں تصوری تعبیر میں میرا کمرہ منور سا کر رہی تھیں۔

یکایک والدہ کمرے میں تیزی آئیں، کرسیاں باقاعدہ بچھا کر اچھی طرح مجھے لٹایا۔ اور کہنے لگیں موٹر کی آواز آ رہی ہے۔ ڈاکٹرنی آ رہی ہے، تیار رہو۔ باوجود دہشت کرنے کے میری روح شادمانی سے ناچ رہی تھی۔ میں خود کو اس جمیل ساحرہ کے گیسوئے معطر بالوں کے سائے تلے پانے لگا۔ وہ میری تمنائیں، فردوسی لطافتوں میں ڈوبی ہوئی اب قریب سے قریب تر آ رہی تھیں۔ جیسے موٹر کے ہارن کی

آواز آ رہی تھی، میں اُچھل پڑا۔ اس وقت کی لطیف و مضطربانہ کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر استقبال کے لئے راستے میں کھڑا ہو جاؤں اور سب سے پہلے میری بیقرار نگاہیں اس کے شباب افروز و صبیح چہرے کے جمال پر تصدق ہوں۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ میں سینہ بھینچ کر رہ گیا موٹر دروازے پر کھڑا ہو گیا اور کتنے ہی منٹ گذر گئے۔ میرا دل سینہ چیر کر باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں اس وقت آنکھوں میں کسی قسم کی سوزش اور درد بالکل محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اللہ کتنی ہی دیر ہو گئی، ابھی تک کوئی نہیں آیا۔

یکایک پختہ صحن متعدد جوتوں کی آواز سے گونج اٹھا میں خاموش ہو کر اچھی طرح لیٹ گیا۔ سوچنے لگا۔ یوں دیکھو نگا پھر اس طرح نظر کرونگا۔ وغیرہ۔ اچانک کمرے کی فضا میں چند نسوانی آوازیں مچلنے لگی۔ والدہ نے پیار بھرے لہجے میں پکارا " بیٹا شاہد!۔۔۔ میں نے کراہ کر کروٹ بدلنی چاہی مگر فوراً ہی ایک شیریں آواز نے مجھے روکا۔" نہیں یونہی لیٹے رہئے۔ میرا دل میری آنکھوں تک کھنچ آیا۔۔۔۔یہی ظالم ہے، یہی وہ کافر ہے جس کے دیکھنے کی خواہش نے مجھے اس جان لیوا اور صبر آزما تکلیف میں مبتلا کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری امیدیں درست نکلیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کسی طرح جلد سے جلد دیکھ لوں۔ مگر تقدیر ابھی مجھے اور ستانا چاہتی تھی۔ والدہ نے مختصر الفاظ میں تکلیف اور وجہ تکلیف بیان کی۔

کسی خاتون نے بہت قریب آ کر پیار سے کہا:۔ اچھا! روشنی میں آنکھ دکھایئے۔ آپ کو کروٹ بدلنے میں تکلیف تو نہ ہوگی۔۔۔؟ میں سمجھا۔ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ ہے۔ کیونکہ آواز میں بڑھاپا تھا۔ میری جان میں جان آئی میں

لے کراہ کر کروٹ لی اور میری پُر شوق نگاہوں نے بے اختیاراً نیلے برقعہ والی مہ جبیں حور کا تعاقب کرنا شروع کیا۔

ائیں یہ کیا . . . ؟ یہ تو نہیں ۔ میں نے تڑپ کر دوسری خواتین پر نظر ڈالی۔ مگر میرے حسین تصور کے مطابق کوئی بھی نہیں ۔ میں نے بے چین ہو کر طفلانہ انداز میں پوچھا۔ ابھی کیا ڈاکٹرنی صاحبہ نہیں آئیں ۔ ؟ ایک عجیب دلچسپ دبی کیف ہنسی کی آواز آئی ۔ آپ آنکھ تو دکھائیے ۔ وہ بھی آگئی ہیں

یاالٰہی کہاں . . . ؟ میرے دل نے بیقرار ہو کر پوچھا میں نے اس خیال سے کہ معلوم ہو جائیگا ۔ یوں ہی اٹکل سے ۔ کہا " آداب عرض ڈاکٹرنی صاحبہ ! "

آداب عرض ، آداب عرض ایک عورت جو میرے سرہانے کھڑی کھڑی بولی ۔ میں نے آہستہ آہستہ بہ مشکل آنکھیں کھول کر اور گھوم کر دیکھا ۔ اُف کیا یہ ہے ڈاکٹر ۔ نہیں نہیں یہ ڈاکٹر تو ہرگز نہیں ہو سکتیں ۔ مگر نہ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں وہی نیلا برقعہ ، سفید رنگت ، چشمہ لگائے ہوئے ، چہرے پر افسوسناک جھرّیاں ، سنہرے بال ، آنکھیں قطعی اندر کو دھنسی ہوئی ۔ اُف معبود ! . . . . کیا یہ ہو سکتی ہے . . . ؟ . . . . وہ لیڈی ڈاکٹر . . . . ! جس کے تصور کی رعنائیاں مجھے مجنوں بنائے ہوئے تھیں ۔ جس کے صرف دیکھنے کے اشتیاق نے مجھے پاگل بنا دیا تھا ۔ میں نے اپنے دل کے درد کی تکلیف سے کراہ کر آنکھیں بند کر لیں ۔

کیوں کیا زیادہ خلش ہے بیٹا . . . ! خاتون ڈاکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ۔

اُو معبود ! میں مر گیا ۔ میرا خون اُڑنے لگا ۔ کاش اس طرح مجھے کوئی اور ہستی مخاطب کرتی ۔ آہ وہ میرے تصورات کی دیوی کاش !

آواز سُنکر میرا دل کباب ہو گیا . . . . آہ کسقدر المناک انجام

محترمہ حمیدہ خاتون صاحبہ قمر گولڈ میڈلسٹ کلکتہ

اللہ رے نظارۂ اعجازِ محبت
ہر ذرّے سے آتی ہے اک آوازِ محبت

سن لے وہ مری ٹوٹی ہوئی دل کی صدائیں
جس نے نہ سنی ہو کبھی آوازِ محبت

انجام کی منزل سے بھی دو گام ہے آگے
اللہ رے دیوانۂ آغازِ محبت

لرزش میں ہیں کونین کی رنگین فضائیں
یہ کس نے اٹھایا ہے ابھی سازِ محبت

سمجھا نہ ابھی تک یہ کوئی عقدۂ معصوم
میں رازِ محبت ہوں کہ تم رازِ محبت

منزل ہے مری منزلِ جبریل سے آگے
رگ رگ ہے مری واقفِ پروازِ محبت

اک جلوۂ بے عکس ازل سے ہے ابد تک
اللہ رے یہ سلسلۂ رازِ محبت

ہر روز قمر راتوں کے سناٹے میں مجھ کو
دیتا ہے کوئی عرش سے آوازِ محبت

خستہ پوری

ایک سیر میدہ۔ ڈھائی پاؤ گھی آدھی چھٹانک نمک۔ پہلے آدھ پاؤ گھی کو میدہ میں ملا دیں۔ اس کے بعد نمک کو دودھ میں، گھولیں اور زعفران پیس کر ملا دیں اور اسی دودھ سے میدہ کو اچھی طرح گوندھیں۔ پھر بطریق عام دستور نرم آگ پر تلیں۔ نہایت خستہ پوریاں ہونگی۔

آلو کی پوری

میدہ ایک سیر، آلو ایک سیر گھی تین پاؤ۔ نمک چھٹانک بھر زعفران تین ماشے، پہلے آلوؤں کو اُبال ڈالیں۔ پھر چھیل کر ملنا شروع کر دیں اور اس قدر ملیں کہ بالکل باریک ہو جائیں، مگر پیسیں نہیں۔ ورنہ خرابی پیدا کر دیں گے۔ اس کے بعد میدہ ملا کر دودھ سے گوندھیں اور زعفران پیس کر ملا دیں، مگر سخت گوندھیں اور حسب دستور پوریاں بنائیں۔ نہایت نرم اور مزیدار ہونگی اور پوریاں بیلن سے بنانا چاہئیں اور اسیطرح بجائے آلو کے اگر اروی کی پوری بنائی جاوے تو وہ بھی مزیدار ہونگی۔ مگر اروی سیر بھر میدہ میں آدھ سیر ہونی چاہئے اور نرم آگ پر پکائیں۔

پوری مانڈہ

میدہ ایک سیر، گھی ایک سیر دہی عمدہ پاؤ بھر نمک آدھی چھٹانک۔ پہلے میدہ میں دہی ملا کر آدھ پاؤ گھی ملا دیں اور گرم پانی میں ملا کر خوب گوندھیں اور سخت رکھیں اور تھوڑی دیر کے بعد پھر آدھ پاؤ گھی لے کر . . . اس کو اچھی طرح گوندھیں اور تھوڑی دیر کے بعد بڑی بڑی اور باریک پوریاں بذریعہ بیلن بنائیں اور موافق دستور کے نرم نرم آنچ پر پوریاں پکائیں نہایت خوش ذائقہ اور مزیدار ہوں گی۔

میٹھی پوری دال نخود

چنے کی دال کو نرم پخت کرنے کے بعد ایک سیر شکر کا قوام تیار کر کے شامل کریں۔ بعدازاں اس شیرے کو دال نخود میں خشک کر دیں۔ اس کے بعد دیگر مصالحہ جات شامل کریں۔ صرف نمک اور سرخ مرچ نہ ڈالیں۔ بھوننے کے بعد دال پیس لیں۔ اور پھر پوریوں کے گندھے ہوئے آٹے کی پوریاں بنا کر ان میں دال بھر لیں اور بریاں کریں اور ذرا سا نمک آٹا گوندھتے وقت شامل کر لیں تو اچھا رہے گا۔

پوری دال ماش

دال ماش تین پاؤ۔ گھی سیر بھر، آٹا دو سیر، دہی چھ تولے۔ دھنیہ خشک چھ تولے الائچی آٹھ ماشے ادرک چار تولے لونگ چار ماشے۔ پیاز پاؤ بھر نمک چار تولے سیاہ مرچ ۲ ماشے سرخ مرچ ۵ تولے۔ پودینہ خشک ۲ تولے سفید زیرہ ۶ ماشے سونٹھ ۱ تولہ۔ دھلی ہوئی دال ماش کو گھی میں بریاں کر لیں اور دیگچی میں پانی بھر کر سرپوش کی نوک سے کپڑا باندھ کر دال ابالیں اور بعد کو دال پیس کر مصالحہ کو ملا لیں اور آٹے کی پوریاں بھر کر پکائیں۔

چارلی چپلن مغربی اسٹیج کا سب سے بڑا کومیڈی ایکٹر مانا گیا ہے۔ وہ ظرافت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کی باتیں قہقہوں میں بسی ہوئی ہوتی ہیں۔ ناممکن ہے کہ آپ چارلی کو اسٹیج یا اسکرین پر دیکھیں اور ہنسنے پر مجبور نہ ہوں۔ اس کی لاجواب طربیہ اداکاری سے مسکراہٹیں چھلکتی رہتی ہیں۔ چارلی صرف اسٹیج ہی پر اپنی خوش فعلیوں کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ اس کی نجی اور خانگی زندگی بھی گوناگوں لطافتوں اور رنگ برنگ ظرافتوں سے بھری رہتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی زاہد خشک کیوں نہ ہو ایک مرتبہ چارلی سے مل لے اور پھر وہ اس بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مجسم قہقہے کو بھول جائے۔ مشہور ہے کہ جب ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی جنہیں بعض انگریزی نامہ نگاروں نے "روتی صورت" کا انسان بتایا ہے۔ گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے لندن تشریف لے گئے تھے تو بعض ظرافت پسند اور زندہ دل لوگوں نے گاندھی جی اور چارلی کے درمیان ملاقات کا انتظام کرایا تھا۔ مہاتما گاندھی اپنی متانت اور سنجیدگی کے لئے کافی شہرت رکھتے ہیں، مگر جونہی چارلی پر ان کی نظر پڑی وہ بیساختہ مسکرانے لگے اور جب گاندھی جی سے چارلی نے گفتگو شروع کی تو اس غم پسند ہندوستانی رہنما کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور آخر میں تو ہنستے ہنستے گاندھی مہاراج کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ . . . چارلی دنیا کا سب سے بڑا ہنسنے والا انسان ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تمام تر شہرت و عظمت کی بنیاد ہی قہقہوں اور مسکراہٹوں پر قائم ہے۔ مگر باوجود اس کے چارلی کی روح غم و ناکامی کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ وہ اپنی تجارتی سماجی اور فنی زندگیوں میں جس قدر کامیاب ہے۔ اسی قدر رومانی زندگی میں ناکام ہے۔ کچھ عجیب و غریب اتفاق ہے کہ اس سب سے زیادہ شہرت یافتہ انسان کو اپنی محبت میں ہمیشہ مایوسی اور حسرت نصیبی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ چارلی نے متعدد شادیاں کیں۔ دنیا بھر نے اسکی دلچسپیوں سے دلچسپی لی۔ مگر آخر کار ہر مرتبہ اسے عدالت طلاق کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے آئندہ کیلئے شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا۔ چارلی چپلن نے سب سے آخر میں ہالی وڈ کی مشہور حسینہ اداکارہ "پولا نیگری" کو دعوتِ محبت دی۔ اگرچہ چارلی اور پولا نیگری کی طبیعتوں میں بعد المشرقین تھا۔ چارلی مجسم قہقہہ۔ پولا نیگری سراپا آہ۔ مگر پھر بھی دونوں کی شادی ہو گئی۔ گو بقول سید انشاء مرحوم

میں ہوں مقطع تو ہے مشہور امیر اتنا اصیل نہیں،

اول اول تو شادی کامیاب ثابت ہوئی کیونکہ دونوں پر عشق و محبت کا خمار چھایا ہوا تھا۔ لیکن آخر طبیعت کا تضاد رنگ لایا اور چارلی اور اس کی محبوبہ میں طلاق واقع ہو گئی چارلی کو پولا نیگری سے شدید ترین محبت تھی۔ بلکہ اب تک اس کے دل کی راکھ میں محبت کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں وہ

اپنی آخری محبت کو آج بھی اسی جوش و جذبے سے یاد رکھتا ہے۔ آیئے ہم اس کی ناکام محبت کا افسانہ اسی کی زبان سے سنیں

ابتدائے محبت

میں نے سب سے پہلے پولا نیگری کو برلن میں دیکھا برلن کے ایک ریسٹورنٹ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جبکہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا ہوا ناشتہ کر رہا تھا۔ پولا نیگری کچھ فاصلے پر بیٹھی قہوہ نوشی میں مصروف تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری حرکات سے غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے مگر میں نے اس کی طرف خواہ مخواہ کوئی توجہ نہ کی حسین و پرجمال لیڈیوں کا میری شخصیت میں دلکشی محسوس کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ جبکہ قدرت نے میری سرادا میں زندہ دلی اور مزاحی کیفیت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ تھوڑی دیر میں ریسٹوران کا ملازم ناشتے کا بل لے کر آیا اور مجھے اجنبی سمجھ کر دق کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ آپ جانتے ہیں کہ پیسے کے معاملے میں میرا اصول جداگانہ ہے۔ فضول خرچی سو پندرہ کوسوں بھاگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بک بک جھک جھک شروع ہو گئی۔ وہ مجھ سے ذیل چارج کرنا چاہتا تھا اور میں تھوڑے سے پیسوں میں کام نکالنا چاہتا تھا۔ ابھی کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ پولا نیگری اپنی جگہ سے اٹھی اور اس معاملہ کا فیصلہ کرا دیا۔

قصے کا مزیدار پہلو یہ ہے کہ میں نقصان میں نہ رہا۔ یہ ہے اس کا فرادا حسینہ سے میرا پہلا تعارف جو آگے چل کر میری زندگی میں لطف کی شریک بن گئی۔ پولا نیگری نے صرف یہی نہیں کہ مجھے ہوٹل کے بوائے کے فریب سے بچا لیا بلکہ خود اپنی میز پر مدعو کر کے میری بڑی خاطر تواضع کی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ حد درجہ ذہین، خوش گفتگو اور نیاض ہے۔ پولا نیگری کو میں نے بتایا کہ میں دوسرے دن ہالی وڈ جا رہا ہوں۔

کچھ عرصے کے بعد جب کہ میں نگار خانے میں سرگشت کر رہا تھا مجھے یہ اطلاع ملی کہ ڈائرکٹروں نے پولا نیگری کو "قلوپطرہ" کا پارٹ ادا کرنے کے لئے ہالی وڈ بلایا ہے۔ میں فوراً اس سے ملنے کے لئے پہونچا اور وہ بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئی۔ اس روز میں اور وہ تمام دن ساتھ ساتھ پھرتے رہے۔ پولا نیگری خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھی، کیونکہ اسے اپنے کردار میں غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی تھی۔

دوسرے روز صبح سویرے میں ہوانا دار مکین ریاست کے نقالوں اور سازندوں کی ایک جماعت کے ساتھ جو رنگا رنگ کے لباسوں میں ملبوس تھے پولا نیگری کے مکان پر پہونچا۔ اور میں نے انھیں حکم دیا کہ وہ ہلکے ہلکے سروں میں بہار کے نغمے اور صبح کے گیت گائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک دلربا ترتیب اور ہم آہنگی کے ساتھ اپنے اپنے ساز چھیڑے۔ پولا نیگری ابھی تک خواب ناز میں تھی۔ گیتوں کی آواز سن کر وہ چونکی اور دریچے میں آکر مسکرانے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تھا میرا پہلا اظہار محبت۔ جس کی تازگی اور جدت نے اس سادہ مزاج نازنین کے دل کو پوری طرح مسخر کر لیا۔

آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات بڑھنے لگے۔ حسن اتفاق سے پولا نیگری اپنے خیالات اور مذاق کے اعتبار سے بالکل میری ہم خیال تھی۔ آرٹ موسیقی اور شاعری کے متعلق ہم دونوں کا نقطۂ نظر قریب قریب یکساں تھا۔ ہم پولا نیگری کے پاس بیٹھے ہوئے گھنٹوں حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ وہ کسی وقت بھی میری صحبت و ہمنشینی

سے نہ اکتاتی تھی ۔ مگر اس کے اندر ایک زبردست عیب یہ تھا کہ مجھ کو تنگ کرنے اور چھیڑنے میں پولا نیگری کو بڑا مزا آتا تھا ۔ وہ فضول خرچ اور مسرف بھی پرلے سرے کی تھی اور میں اس قدر اخراجات سے جلتا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہم دونوں میں لڑائی ٹھن جاتی تھی ۔ مگر چونکہ پولا نیگری کو میری ذات سے بے حد محبت تھی اس لئے آخر کار اسے مجھ کو منانا پڑتا تھا ۔ اور جب کوئی حسین عورت منانے پر اُترے تو کون سنگدل ہے جو اپنی برہمی قائم رکھ سکے ؎

اللہ اللہ کس قدر نازک محبت پر تھا ناز
سامنے جب بیوفا آیا تو پیار آ ہی گیا

پولا نیگری بلا کی خوش آواز مغنیہ تھی ۔ وہ جب پیانو یا وائیلن پر نغمہ سرائی شروع کرتی تھی تو بے اختیار یہ محسوس ہوتا تھا کہ تمام کائنات لطیف نغمہ بن کر فضا میں تھرا رہی ہے پولا نیگری کو "ہالی وڈ کی بلبل" کہا جاتا تھا اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا ۔ اس کی تانوں میں بیک وقت تھر ولنے کی کیفیت سماگئی تھیں ۔ اخبار والوں کو بھی رفتہ رفتہ ہماری محبت کا علم ہو چلا تھا ۔ اور وہ میرے اور پولا نیگری کے گرد ہر وقت منڈلاتے رہتے تھے ۔ امریکہ کے فلمی نامہ نگار بڑے چالاک ہوتے ہیں وہ روز آنہ کوئی نہ کوئی سنسنی خیز خبر اپنے کروڑوں ناظرین کے لئے حاصل کر لیتے تھے ۔ عموماً اُن کا عنوان یہ ہوتا تھا ۔ "ہالی وڈ کا سنسنی خیز رومان" "مشہور اداکارہ پولا نیگری کی داستانِ محبت" "چارلی کی رومانی سرگرمیاں" وغیرہ ۔ وغیرہ ۔ ہماری صلح اور لڑائی کی ذرا ذرا سی اطلاع نمایاں سرخیوں میں شائع کی جاتی تھی ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ان باتوں سے تھے پریشان، ہمارا کوئی راز راز نہ رہا تھا ۔ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ ہم پبلک کا آلۂ تفریح بن گئے تھے ۔

شادی

آخر کار ایک روز وہ آیا کہ پولا نیگری باقاعدہ طور پر میری حیاتِ ازدواجی میں شریک ہو گئی ۔ میری اور پولا نیگری کی شادی . . . . کوئی معمولی سا واقعہ نہ تھی اس مسرت انگیز خبر نے امریکہ سے لے کر یورپ تک دھوم مچادی ۔ ہزاروں تہنیتی و مبارکبادی کے تار ہمارے پاس ارسال کئے گئے ۔ اور دنیا بھر کے اخباروں نے اس تقریب پر بڑے بڑے آرٹیکل شائع کئے مگر ہر شخص متعجب تھا کہ آخر ہم دونوں میں نبھاؤ ہو گا تو کیسے ہو گا ۔ پولا نیگری قدرتاً غم پسند اور میں فطرۃً زندہ دل ۔ ہماری طبیعتوں میں مشرق و مغرب کا فرق تھا ۔ مگر ابتدائے محبت میں ان ناقابلِ حل معموں کو حل کرنے کا ہوش تھا کسے ؟

میں سراپا آرزو تھا وہ سراپا جوش تھا
ابتدائے شوق میں انجام کا کب ہوش تھا

لیکن روز بروز یہ حقیقت ظاہر ہوتی چلی جاتی تھی کہ اگر پولا نیگری کو اور مجھے اطمینان سے اپنی زندگی بسر کرنی ہے تو ہم کو اپنی محبوب عادتوں اور پسندیدہ چیزوں میں بہت کچھ تغیر و تبدل کرنا پڑیگا ۔ مشکل یہ تھی کہ پولا نیگری بے حد ضدی واقع ہوئی تھی ۔ وہ ایک مرتبہ جس بات پر جم جاتی پھر کسی طرح اس سے نہ ہٹتی ۔ نتیجے میں ہم دونوں کے درمیان بول چال بند ہو جاتی ۔ جس روز کوئی ایسا حادثہ پیش آتا تمام ہالی وڈ میں سناٹا چھا جاتا ۔ شوٹنگ بند کر دی جاتی اور بیچارے ڈائرکٹر پروڈیوسر (فلمساز) گھبرائے ہوئے پھرتے دو تین روز کے لئے غریب پولا نیگری الگ اپنے صوفے پر جا گرتی ۔ اور میں الگ اپنے بستر پر دراز ہو جاتا ۔ جب لڑائی ہوتی تھی تو پولا نیگری رو رو کر اپنی جان ہلکان کر لیتی تھی ۔ تمام ایکٹرسیں اور سہیلیاں اُسے سمجھاتے سمجھاتے تھک جاتی

تھیں مگر وہ لش سے مس نہ ہوتی اور ادہر میری چار پائی کے گرد ڈائرکٹروں، فوٹوگرافروں اور فلمی نمائندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ آخر کار بڑی مشکل سے صلح ہوتی۔ صلح ہوتے ہی تمام نگار خانہ جاگ اُٹھتا۔ اور تمام کام بدستور جاری ہو جاتے۔ لیکن اِن روز روز کے جھگڑوں سے تمام کمپنی والے بلکہ ہم خود سخت پریشان تھے۔ ہماری محبت کے پودے کو خطرناک گھُن لگ گیا تھا۔ ہمارے درمیان بدگمانیو اور بے اعتباریوں کے صدہا پردے حائل ہو گئے تھے۔

اسی زمانے میں پولا نیگری کی فرمائش سے ایک سرسبز پہاڑی پر میں نے ایک شاندار بنگلہ تعمیر کرایا۔ جس پر میرے ہزاروں ڈالر صرف ہو گئے۔ اِدہر میں اس کی روز روز کی فرمائشوں سے تنگ تھا۔ کبھی درزی کا بل، کبھی بزاز کا بل، کبھی جوہری کا بل، کبھی کسی کا بل۔ کبھی کسی کا بل۔ آخر میں کوئی قارون تو ہوں نہیں، ایک معمولی سا ایکٹر ہوں۔ ایک روز یہ ہوا کہ میں جو نگار خانے سے واپس آیا تو چار ہزار ڈالر کا ایک مزید بل میرے سامنے پیش کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ پولا نیگری کسی نرسری (نباتات خانے) سے بہت سے پودے خرید لائی ہے۔ یہ چیز میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں نے بل کی ادائیگی سے قطعی انکار کر دیا۔ یہ چیز پولا نیگری کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ نتیجے میں پھر وہی کشمکش شروع ہو گئی۔ اُدھر میرے دوستوں نے مجھ پر زور ڈالا کہ اگر مجھے اپنے فن اور آرٹ کو ترقی دینا ہے تو ہمیشہ کے لئے اپنی رومانی زندگی کو خیرباد کہہ دینا چاہئے۔ چنانچہ مجھے مجبوراً پولا نیگری کو طلاق دینا پڑی۔

کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

پولا نیگری کو میں نے کبھی ہیرے کی ایک بیش قیمت انگوٹھی تحفہ دی تھی جو بطور تحفۂ محبت اس کے پاس تھی۔ جدائی کے بعد پولا نیگری نے وہ انگشتری واپس کرنا چاہی مگر میں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔۔۔۔

۔۔۔ آج اگرچہ پولا نیگری کو چھوٹے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ میں اس کو بھول چکا ہوں اور اب تو یہ حال ہے کہ

نہیں آتی تو اُن کی یاد برسوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں،

وجدانیات

محترمہ ایس بانو طلعت صاحبہ

عشق میں بربادیٔ دل کا یہ حاصل ہو گیا
ذرّہ، ذرّہ حسن بنکر عرش منزل ہو گیا

حسن والے بھی مگر اس راز سے واقف نہیں
میرا ذوقِ عاشقی خود میرا قاتل ہو گیا

اللہ اللہ رے تمنائے شوق کی نیرنگیاں
جس کو میں طوفان سمجھا تھا وہ ساحل ہو گیا

اشکِ خونیں، نالہ رنگیں، فغانِ بے خودی
تین ٹکڑوں سے مکمل قصۂ دل ہو گیا

آ کلیجے سے لگا لوں اے جمالِ روح دوست
تیرے جلووں کے تصدق سہل مشکل ہو گیا

موت کی ہچکی سے آخر کھل گیا رازِ تمام
میری نظروں میں زمانہ حسن یا طل ہو گیا

دل میں رہ کر بھی مرے طلعت وہ مجھ سے دور تھا
میرا ارماں خود حجابِ دیدۂ دل ہو گیا

نئی دنیا

نامن مومن کی ایک دلفریب کہانی پر

اردو ادب میں جدید اسلوب بیان کا نمونہ

(۱)

نئی دنیا ——— نئی دنیا
مہ و انجم سے نرالی ——— دنیا
نئی دنیا ——— نئی دنیا
غم و افکار سے خالی ——— دنیا
بزمِ افلاک سے ——— دور
حدِ ادراک سے ——— دور

(۲)

نئی دنیا میں ——— جہیں
پھولوں کی نکہت ——— لے کر
نذرِ محبت ——— لے کر
دلِ بیباک سے ——— دور
حدِ ادراک سے ——— دور

(۳)

نئی دنیا میں ——— نہ ہو
کون . . . ——— ؟
غمِ سود و ——— زیاں
فصلِ گل عہد ——— خزاں
خس و خاشاک سے ——— دور
حدِ ادراک سے ——— دور

(۴)

سازِ ہر سوز ——— نہ ہو
دردِ دل دوز ——— نہ ہو

(۴)

نور و نکہت کی جمالی ——— بستی
بزمِ ہستی کی خیالی ——— بستی
دہرِ ناپاک سے ——— دور
حدِ ادراک سے ——— دور

(۵)

آدمیت ——— جہیں
شام . . . ——— ؟
ہمیں شام سے ——— کیا
صبحِ گلفام سے ——— کیا
غمِ ایام سے ——— کیا
چرخِ سفاک سے ——— دور
حدِ ادراک سے ——— دور

(۶)

نئی دنیا ——— نئی دنیا
نئی دنیا کو بسانا ——— ہوگا
نئی بستی کو بسانا ——— ہوگا
نئی دنیا ——— نئی دنیا
کوئی کتنا ہی ——— کہے
[illegible] دل میں ——— رہے
[illegible] سے ——— دور
حدِ ادراک سے ——— دور
نئی دنیا ——— نئی دنیا

محمد نیاز مصر

رضیہ سلطانہ

۱ گرم پانی میں قینچی ڈال دینے سے نازک اور باریک کپڑے کاٹنے میں آسانی ہوتی ہے

۲ اگر برسات کے موسم میں کمرے کے اندر پودینہ لگا دیا جائے تو مکھیاں ہرگز نہ آئیں گی

۳ کپڑے میں لونگ باندھ کر لٹکا دی جائے تب بھی مکھیوں سے نجات مل جائے گی۔

۴ چاندی کو زنگ سے بچانے کے لئے کافور کے ٹکڑے قریب رکھ دینا چاہئیں

۵ اگر اونی یا سلکی کپڑے پر ابھونیا کے داغ پڑ جائیں تو انھیں سرکے یا لیموں کے رس سے دھو دیں

۶ اگر چاندی کے برتن پر داغ پڑ گیا ہو تو اسے آلو کے ابالے ہوئے پانی سے دھوئیں

۷ پھولوں کو تروتازہ رکھنے کیلئے گلدان کے پانی میں صابون کے ٹکڑے چھوڑ دیں۔

۸ مشین کی سوئی کو تیز کرنے کے لئے چینی کی پلیٹ میں رگڑ کر استعمال کریں۔

۹ خشک لیموں کو تازہ کرنے کیلئے نیم گرم پانی میں دو گھنٹے کیلئے چھوڑ دیں۔

۱۰ قبض دور کرنے کیلئے نہار منہ تازہ پانی کا ایک گلاس استعمال کریں۔

۱۱ اگر نیم کے پتوں کو پانی میں شامل کر کے غسل کریں تو بہت سی جسمانی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔

"دودھ"

صاف دودھ سے بچوں کی نشوونما اور تندرستی پر جس قدر اچھا اثر پڑتا ہے وہ ظاہر ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر صاف اور خالص دودھ ملنا مشکل نہیں تو وقت طلب ضرور ہے، کبھی ہندوستان دودھ اور گھی کا ملک کہا جاتا تھا مگر آج کیا شہر اور کیا دیہات کسی جگہ بھی آپ قابل اعتماد دودھ گھی حاصل نہیں کر سکتے۔ صاف دودھ کیلئے مویشیوں کا تندرست اور صاف رہنا حد درجہ ضروری ہے۔ بہت سے ایسے مویشی ہوتے ہیں جو تپ دق، منہ اور پاؤں کی بیماریوں، ٹائیفائد اور کھر پکا منہ پکا میں مبتلا رہتے ہیں۔ دودھ دوہنے سے پہلے مویشیوں کو صاف کر لینا بہت ضروری ہے۔ تاکہ ان پر گرد و غبار اور گندگی کی جو تہ چڑھی ہوتی ہے وہ دور ہو جائے خصوصاً اُن کا پچھلا حصہ نہایت احتیاط سے دھو لینا چاہئے نیز تھنوں کے قریب جانوروں کے بال کاٹتے رہنا مناسب ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر دودھ میں گرد آلود ایک بال بھی گر جائے تو اس میں پچیس ہزار کے قریب کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ دودھ دینے والے جانور کو بدبودار چارہ مثلاً سائلیج دربائی ہوئی گھاس نہ دیں کیونکہ خود دودھ کے اندر بھی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ مستورات کو بھی ایام رضاعت میں ثقیل و بدبودار غذا سے پرہیز رکھنا لازم ہے ورنہ بچہ اور ماں دونوں بیماریوں میں مبتلا رہیں گی۔

تری باتوں میں رنگِ جذبۂ اخلاص پاتی ہوں
تری عرضِ محبت پہ میں اکثر مسکراتی ہوں
خدا شاہد کہ دردِ زندگی کو بھول جاتی ہوں
میں تیری نوجواں نظمیں طرب میں گنگناتی ہوں،

ترا ہر شعر میرے جذبِ پنہاں کو جگاتا ہے
مجھے اے دوست تیری بیخودی پر پیار آتا ہے

تجھے اے دوست اِن تاروں بھری راتوں کی مستی میں،
سکوتِ شام میں اور صبح کی جلوہ پرستی میں،
سرِشکِ خوں کی دنیا میں غم و ماتم کی بستی میں
غرض یہ ہے کہ اس ہنگامۂ دنیائے ہستی میں

تجھے اے دوست! سارے دکھ بھلا کر یاد کرتی ہوں
میں اکثر یاد کرتی ہوں، میں اکثر یاد کرتی ہوں

نہیں گو اس چمن میں آمدِ فصلِ بہار اب تک
نہیں میرے دلِ معصوم کو صبر و قرار اب تک
لبوں پر مسکرا دیتی ہے آ، شعلہ بار اب تک
مجھے آیا نہیں تیری وفا پر اعتبار اب تک

یقیں کرتی نہیں عشق و محبت کی کہانی پر
مجھے اے دوست رحم آتا ہے تیری نوجوانی پر

وہ ایامِ مسرت، وہ لڑکپن کی حسیں راتیں
وہ میری شوخیاں، رعنائیاں اور دلنشیں باتیں
وہ آپ ہی آپ میرا گنگنا نا مست ہو جانا
وہ میٹھی میٹھی لے کا چپکے چپکے پست ہو جانا
وہ ہم عمروں کی ہم چشموں کی صحبت یاد ہے اب تک
وہ رنگیں مختصر، محدود فرصت یاد ہے اب تک
مرا ہر روز، روزِ عید تھا ہر شب شبِ رنگیں
شکن نا آشنا ہوتا تھا میرا دامنِ بالیں
غرض میں تھی، خوشی تھی اور نشاط و کامرانی تھی
مری "دوشیزگی" اک کیف آور زندگانی تھی
مجھے کیا ہو گیا، اب ہر گھڑی خاموش رہتی ہوں
زمانے کا تغیر دیکھ کر مدہوش رہتی ہوں
میسر اب بھی راحت ہے محبت اور عزت ہے
سکونِ زندگی میں پھر بھی اک اندازِ وحشت ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا آخر؟
شبابِ زندگانی دم زدن میں کھو گیا آخر!
مجھے توفیق دے یارب فرائض سے نہ غفلت ہو
کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو ہم چشموں میں خفت ہو
انھیں کمزور ہاتھوں میں خدایا ایسی قوت دے
نمونہ بن کے دکھلا دوں مجھے کچھ ایسی ہمت دے

عزیزہ بہن ریحانہ فاطمہ صاحبہ نقوی امروہہ سے اطلاع دیتی ہیں کہ اُن کے چھوٹے ماموں جان سید محمد حسنین صاحب موٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ۔ مرحوم کا ابھی عنفوان شباب تھا اور قدرت نے حسن و جمال اور ذہن و لیاقت کی گراں قدر صلاحیتیں انھیں ودیعت فرمائی تھیں ۔ آہ ابھی غنچۂ نورسیدہ شگفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ خزاں کے ہاتھ سے مرجھا گیا ۔ اس حادثہ کی تفصیلات جو ہمارے علم میں آئی ہیں ۔ اتنی درد انگیز اور غمناک ہیں کہ انکی تفصیل بیان کرنے سے کلیجہ کانپ جاتا ہے ہم اس حادثۂ الیمہ میں رئیس صاحب (مدیر مسافر) اور انکے برادران عزیز کمال صاحب ، سید محمد تقی ، سید محمد احمد سعید ذیشان حیدر اختر نقوی اور جوانمرگ کے غم نصیب والدین اور محترمہ ریحانہ جمال صاحبہ ہاشمی ، بیگم مسعود صاحبہ ، رضیہ سلطانہ صاحبہ اور دیگر اعزا و اقارب کی خدمتیں اپنی گہری ہمدردیاں ادارۂ صنف نازک ارکان صنف نازک اور مسافر کیطرف سے پیش کرتے ہوئے مرحوم کیلئے دست بدعا اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کے خواستگار ہیں ۔ . . . آہ

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(سعیدہ صابری)

مسافر و صنف نازک کی تمام قدردان بہنوں کیخدمت میں گذارش ہے کہ رسالے کا سال (اگست ۱۹۴۰ء میں) ختم ہو رہا ہے ۔ انشاء اللہ ستمبر ۱۹۴۰ء کا پرچہ دوسرے سال کا پہلا پرچہ ہوگا ۔ زیر نظر سال میں جن مشکلات و مصائب کے بعد ہم نے رسالے کو اپنے ناظرین و ناظرات کی خدمات میں پیش کیا ہے ۔ اسے ہمارا ہی دل جان سکتا ہے ۔ جنگ کی ہنگامہ سامانیاں الگ کاغذ و سامانِ طباعت کی گرانیاں الگ ، اور پھر ہمارے قدر دانوں کی تغافل شعاری اور بے نیازی اس پر مستزاد ۔ بقول کسے ؎

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

لیکن اس کے باوجود بھی ہمیں فخر ہے کہ پرچے کی ادبی رعنائیاں اور صوری دلفریبیاں روزانہ ترقی پذیر ہیں اور صرف بارہ ماہ کی کوشش کے بعد مسافر و صنف نازک کا شمار ملک کے متعدد رسائل کی صف میں ہونے لگا ۔ اِن حالات میں ہماری یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ جن بہنوں کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو رہا ہو وہ نہ صرف یہ کہ آئندہ سال کے لئے مسافر و صنف نازک کی سرپرستی اور خریداری منظور فرمائیں بلکہ دیگر ادب نواز خواتین کو بھی خریداری اور سرپرستی کی طرف مائل کریں ۔ یقین کیجئے کہ صنف نازک آپکا محبوب ماہنامہ ہے اور اس کی ترقی و اشاعت آپ کا ادبی ، اخلاقی اور علمی فرض ہے ۔ اگر ہر بہن صرف ایک ایک خریدار بھی مزید فراہم فرما دیں تو صنف نازک کی بنیادیں حد درجہ مستحکم ہو جائیں گی ۔ امید ہے کہ ہماری اس آواز پر نسوانی دنیا کی طرف سے لبیک کہی جائے گی

(ادارۂ صنف نازک)

جو بہن مسافر و صنف نازک کے چار خریدار پیدا کریں گی انکی خدمت میں رسالہ سال بھر تک مفت ارسال ہوتا رہیگا

(ادارہ)

ڈاکو اور سکندر

تھا کوئی قزاق بے حد نامدار
کانپتے تھے جس سے سب اہلِ دیار
اس قدر مشہور تھا اس کے نام کا
غلغلہ تھا اس کے ہر اک کام کا
لوٹتا تھا وہ امیروں کو سدا
پر غریبوں کا تھا وہ حاجت روا
آخرش پکڑا گیا تدبیر سے
فوج نے باندھا اسے زنجیر سے
لائے اسکندر کے آگے بے حجاب
یوں سکندر نے کیا اس سے خطاب
سچ بتا کیا تجھ کو میرا ڈر نہ تھا
کچھ حکومت کا اثر دل پر نہ تھا
تو نے کتنوں کو کیا خانہ خراب
کتنے گھر لوٹے بعہدِ مہد و عتاب
لوٹ اور رہزن! جواب اس کا ہے کیا
کیا نہ تھا دل میں ترے خوفِ خدا
سن کے وہ قزاق بولا ہاں ضرور
مجھ سے لاکھوں ہی ہوئے اب تک قصور
لیکن اے شاہِ زمن! انصاف کر
اور تقصیر اب تو میری معاف کر
میں نے گر لوٹا امیروں کو سدا
تو نے قوموں کو پریشاں کر دیا
میں نے گھر چھینے اگر زردار سے
ملک ویراں ہیں تری تلوار سے
مجھ سے پہونچا چند لوگوں کو گزند
تجھ سے ہے سارا زمانہ دردمند
آج یہ قصہ جہاں میں صاف ہو
میں ہوں رہزن یا حضور! انصاف ہو

رئیس مراد آبادی

پھول کی سوانح عمری

صبح کو اک پھول گلشن میں کھلا
باغباں کو کوششوں کا پھل ملا
واہ کتنا خوشنما کتنا حسیں!
جس کا ثانی سارے گلشن میں نہیں
بلبلوں نے لیں بلائیں دور سے
قمریوں نے دیں دعائیں دور سے
نونہالانِ چمن ہنس ہنس دئے،
ٹہنیوں نے اپنے جھولے کس دئے
صبح کو تھا پھول میں یہ رنگ و بو
جس کی تھی سارے چمن کو آرزو

دوپہر

دوپہر کو ایک مالی آ گیا:
گلستاں میں ہاتھ خالی آ گیا
جب پڑی اس پھول پر اس کی نظر
پانی بھر آیا دہن میں دیکھ کر
پھول توڑا چل دیا بازار میں،
اور گوندھا اس کو جلدی ہار میں

شام

شام کو بازار میں دیکھا یہ رنگ
پھول ہے وہ زندگی سے اپنی تنگ
گو کہ اس کا رنگ و بو ہے دلفریب
اب بھی گو کیا ہار میں دیتا ہے زیب
لیکن اس کی تازگی رخصت ہوئی
فصلِ گل میں پھول کی یہ گت ہوئی
دیکھ ظلمِ گردشِ ایام دیکھ
اے سعید اس پھول کا انجام دیکھ
آدمی بھی درحقیقت پھول ہے
وہ نہ گر سمجھے تو اس کی بھول ہے

سعید ابن کوکب مراد آبادی

جب نسیم جانفزا صحن چمن سے آئے ہے
اس دل ناکام میں اک آگ سی لگجائے ہے
موسم برسات میں ہے ذرے ذرے پر بہار
میرے دل میں درد ہے میری لبوں پر ہائے ہے
غنچۂ دل کیا شگفتہ ہو کہ قسمت ہی خلاف
اب تو نام عیش سے بھی آرزو شرمائے ہے
بدلیاں چھائی ہیں کس انداز سے افلاک پر
اور ابر غم مرے قلب و جگر پر چھائے ہے
کون کو کو کہہ رہا ہے یہ گھنے باغوں میں آج
ہوک سے جسکی طبیعت اور بھی گھبرائے ہے
"پی کہاں" کا شور ہے یہ کس لئے آفاق میں
کون آخر اپنے پی کی یاد میں چلائے ہے
واہ کیا موسم ہے کیا رونق ہے کیا کالی گھٹا
روح تک اس منظر رنگیں میں کھوئی جائے ہے
اللہ اللہ یہ حسین راتیں یہ حسن نو بہار
جب نظر آئے ہے تو قلب و جگر تڑپائے ہے
کب پپیہا کہہ رہا ہے پی کہاں باغات میں
دیکھ عفت کوئی تیری نظم رنگیں گائے ہے

چڑیاں گلشن میں گا رہی ہیں
کیا حمد خدا سنا رہی ہیں
ہیں بلبلیں نغمہ سنج ساری
گلشن میں ہے موسم بہاری
پانی میں ہیں مچھلیاں بھی گویا
ہیں حسن ازل کی دل سے جویا
ہر ذرے کو آرزو یہی ہے
ہر بزم میں گفتگو یہی ہے
ہر شخص ہے محو حمد باری
سب گرم سخن ہیں باری باری
انسان ہوں یا کہ جن و انس ہوں
یا حور و ملک سے بیشتر ہوں
مخلوق ہے ساری نغمہ افشاں
ہر ذرہ ہے شوق سے پریشاں
وہ کون ہے جو کہ بے طلب ہے
تسکین حیات ذکر رب ہے
سلطان زبان شوق وا کر
اور حمد خدا ذرا ادا کر

کوّا

مس نواب نادرہ سلطانہ نادؔر مرادآبادی

جیسا کہ نقشے سے ظاہر ہے سیاہ و سفید ملا کر بنایئے۔

اولاد حاصل کرنے کا نیا طریقہ

دوا کی مدد سے ہر عورت کو حمل ٹھہر سکتا ہے

جن لوگوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ انہیں یہ سنکر بڑی خوشی ہوگی کہ ایک ایسی دوا ایجاد ہوئی ہے جس کی مدد سے عورت کو حمل ٹھہر سکتا ہے۔ یہ ایک دوا ہے جس کا نام " محافظ اولاد " ہے۔ تجربہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ اگر کسی عورت کو جس کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو یہ دوا مسلسل سات رات تک کھلائی جائے۔ اور ان سات رات تک مرد کا پرہیز رکھا جائے اور جب دوا ختم ہو یعنی ٹھیک آٹھویں رات عورت کو حمل رہ جاتا ہے۔ تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ دوا " محافظ اولاد " مسلسل سات رات استعمال کرنے سے عورت کا اندرونی جسم (یعنی بچہ دانی) بالکل اصلی حالت میں آ جاتا ہے اور جب آٹھویں رات .... تو اسی رات عورت کو حمل رہ جاتا ہے۔ اس رسالہ کی پڑھنے والی لاتعداد عورتوں پر اس عجیب و غریب دوا کا تجربہ ہو چکا ہے اور بے شمار جگہ سے کامیابی کی اطلاع ملی ہے۔ پس جن عورتوں کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو۔ وہ اس عجیب اور تجربہ شدہ دوا سے فائدہ اٹھائیں۔ اولاد پیدا کرنے یعنی حمل قائم کرنے کے لئے یہ دوا کافی تجربہ میں آ چکی ہے اور ملک کے بہت سے ڈاکٹر اور حکیم اس دوا کو اپنے مریضوں پر استعمال کر کے نیک نامی حاصل کر رہے ہیں۔ " محافظ اولاد " کی ایک شیشی میں ایک عورت کے لئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے اور اس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ایم۔ ایس۔ بی نمبر ۳۴ دہلی کو خط لکھ کر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ پیکل پر سات آنے محصول ڈاک لگتا ہے۔

ماہنامہ مسافر مراد آباد

جلد (۴) فہرست مضامین بابتہ ماہ اگست ۱۹۴۱ء نمبر (۱۲)

عادل ادیب شہر اسلامیہ مسافر خانہ ایڈیٹر و پبلشر نے اہل سنت برقی پریس مراد آباد میں چھپوا کر اسلامیہ مسافر خانہ مراد آباد سے شائع کیا

زادِ راہ

ممکن ہے کہ ہماری انفرادی زندگی میں دوستی اور دشمنی کے کچھ معنیٰ ہوں لیکن جہاں تک قوموں کی اجتماعی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حیاتِ اجتماعی میں نہ معاہدۂ محبت کوئی مفہوم رکھتا ہے اور نہ جذبۂ نفرت ...... ایک فردِ واحد کے لئے جو تاثرات و احساسات کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک قوم کے دل و دماغ کو حرکت میں لانے اُس کی روح میں ہلچل ڈالنے اور اُسکی پوشیدہ طاقتوں کو اُبھارنے میں قطعیً ناکام رہتے ہیں ہم اپنی شخصی حیثیت میں دوست دشمن سب کچھ ہوسکتے ہیں لیکن جب ہماری انفرادیت قوم کی عظیم الشان اجتماعیت میں گم ہوجائیگی تو پھر یہ سب چیزیں ہمارے لئے بے معنیٰ ہوکر رہ جائیں گی

۲۳ اگست کی صبح کو دنیا نے تعجب سے سنا کہ ہرفان ربن تھراپ اور موسیو مولوتوو نے جرمن کی قومی اشتراکیت اور روس کی اشتمالی ریاست کے نمائندوں کی حیثیت سے ماسکو میں ایک معاہدۂ "عدم تعرض" پر دستخط کردئے۔ ... یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے ... دنیا اِس خبر کو سننے کے لئے طیار نہ تھی۔ کیونکہ وہ موسیو اسٹالن اور ہر ایڈولف ہٹلر کے درمیان تاریخی دشمنی کے اندازے لگائے بیٹھی تھی ... کون یقین کرسکتا تھا کہ ہرفان ربن تھراپ اور کامریڈ مولوتوو ایک میز کے گرد دوستوں کی حیثیت سے بیٹھ سکیں گے۔ اور ہٹلر و اسٹالن دو حلیفوں کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئیں گے۔ مگر اِس معاہدۂ عدم جارحیت پر بحث کرتے ہوئے ہم یہ بھول گئے کہ یہ معاہدہ دو شخصوں کے درمیان نہیں ہوا۔ جو عارضی جذباتِ محبت و عناد سے متاثر ہوسکتے ہیں۔ بلکہ دو قوموں کے درمیان ہوا ہے۔ دو قوموں کے درمیان ... جن کے لئے نہ ضمیر کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ اور نہ وجدان۔ جبکہ ضمیر و وجدان ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے ... ۱۹۳۹ء کی ۲۳ اگست کو روس و جرمنی نے آپس میں نہ لڑنے کا عہد کیا۔ اور ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کی ایک خوشگوار صبح کو عہد و پیمان کی وہ سنہری زنجیر جو کریملن (روسی دفترِ حکومت) اور ویلیم اسٹریس (جرمن مرکزِ سیاست) کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئی تھی۔ ہیو ہر کے ایک لفظ کی ضرب سے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گرپڑی وہ لفظ تھا ... جنگ ... سرخ روس کے خلاف جنگ!

ہم پھر سراسیمہ ہوکر رہ گئے۔ ہٹلر و اسٹالن میں جنگ یہ جنگ ہمارے لئے تقریباً غیر متوقع تھی۔ ابھی تک ہمارے کانوں میں ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کے معاہدہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ الٰہی پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابل تلوار اُٹھالیں۔ مگر یہاں پھر ہم نے وہی ٹھوکر کھائی۔ نہ وہ دوستی۔ اسٹالن اور ہٹلر کے درمیان تھی۔ اور نہ یہ لڑائی دو انسانوں کی لڑائی ہے ... ... چند روز اور گذر گئے۔ یہاں تک کہ ۱۳ جولائی کو پھر ہمیں ایک ایسے ہی چونکا دینے والے واقعہ کو سُننا پڑا۔ ریوٹر نے بتایا کہ آج کریملن میں سر اسٹافرڈ کرپس (برطانوی

نمائندہ اور کامریڈ اسٹالن نے آپس میں ایک تاریخی
معاہدہ کیا ہے۔ اور یہ تاریخی معاہدہ کیا ہے ؛

من تو شدم تو من شدی	من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں	من دیگرم تو دیگری "

آج دنیا پھر اسی خلش و اضطراب سے دوچار ہے
یہ کس طرح ممکن ہے کہ وائٹ ہال لنڈن کے سامراجی حکمراں
ماسکو کے اشتراکی، لامذہب اور انقلابی رہنماؤں کی طرف
تعاون و دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ چرچل اور اسٹالن !...
سپید و سیاہ، آتش و آب، قند و زہر... مگر نہیں سب
کچھ ممکن ہے کیونکہ یہ قوموں کی حیات و ممات کا مسئلہ ہے
انسانوں کی جذباتی زندگی اور موت کا سوال نہیں

تو اپنے دل پہ زمانے کا اعتبار نہ کر

مسافر کا نیا سال شروع ہوتا ہے

مسافر کی زیرِ نظر اشاعت کے بعد اسکا پانچواں دور
شروع ہو رہا ہے اور اس مہینے کیساتھ ان مسافر نواز
حضرات کی میعاد خریداری بھی ختم ہوتی ہے جو ابتدائے
سال میں خریدار بنے تھے۔ نگینہ، کانپور، علیگڑھ اور
دوسرے مقام کے معاونین و خریداران کو ادارہ مسافر
کی پذیرائی و معاونت کیلئے طیار رہنا چاہیئے۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں "

ادارہ

مسافر کا سالنامہ

اگرچہ مسافر کا ہر نمبر اپنی شاندار خصوصیات کے اعتبار سے سالنامہ ہوتا ہے۔ لیکن مسافر کا سالنامہ...
... وہ سالنامہ... جو بلند پایہ تاریخی مقالوں، علمی مضمونوں، دل آویز افسانوں، عربی، فارسی، انگریزی
اور ہندی کے رومانی ترجموں، پُراسرار سرگذشتوں اور نظم کے اعتبار سے البیلی غزلوں، نغماتی گیتوں،
حسین و دلربا منظومات، قیمتی معلومات، صنعتی، اقتصادی، سیاسی اور تاریخی منتخبات کا مجموعہ ہوگا جسکی ادبی
رعنائیاں تصویری زینتوں اور مصوّر جنتوں سے آراستہ ہونگیں، جسکا ہر صفحہ شعر و ادب کے پھولوں کا مہکتا ہوا گلدستہ
ہوگا — یقیناً ادب اردو میں ایک بیش بہا اضافہ کریگا — اسکے شاندار بلاک، اسکی فردوس
نظر تصاویر۔ غرض اسکا ہر صفحہ بار بار پڑھنے اور بار بار دیکھنے کی چیز ہوگا۔ جو حضرات کہ اپنے مضامین، انکا
افسانے اور مقالے، غزلیں اور نظمیں اس نمبر میں درج کرانا چاہتے ہیں وہ ۱۵ اگست سے یکم ستمبر تک
اپنے مضامین دفتر کو ارسال فرمادیں۔ مشتہرین حضرات بھی یکم ستمبر تک اپنے اشتہارات بُک کرالیں۔ کیونکہ
یہ نمبر ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر ہندوستان کے ہر گوشے میں پہونچے گا — مکمل
تفصیلات اگلے پرچے میں ملاحظہ فرمائیے — سرِ ورق دیدہ زیب، طباعت و کتابت
لاجواب اور ہر چیز اپنی مثال آپ ہوگی — ادارہ —

شبِ اوّلیں

نغمۂ رومان و شباب — رئیس امروہوی کے قلم سے

میں جب کبھی اس نظم کے مصرعۂ اوّل "شبِ اوّلیں تھی شبِ اوّلیں تھی" کو گنگناتا ہوں۔ میرا تصوّر مجھے ایسی زرنگار چاندنی راتوں میں اڑا کر لے جاتا ہے۔ جو چاندی جیسے شفاف جسموں کی چمک دمک سے جھلملاتی اور سونے اور ریشم کی ایسی آب و تاب سے جگمگاتی ہیں۔ وہ البیلی راتیں، جب نوخیز جوانیاں اور معصوم ولولے، آپس میں ہلکے ہلکے سرگوشیاں کیا کرتے ہیں۔ جب دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، نبضوں کی رفتار بڑھ جاتی ہے اور معطر پسینے . . . . شفاف جبینوں اور گلابی رخساروں پر اس طرح بہنے لگتے ہیں جس طرح شبنم کی پاکیزہ بوندیں چنبیلی اور موتیا کے پھولوں کی پنکھڑیوں پر تھرتھرانے لگیں۔ یہ نظم مجھے ہمیشہ سے پسند تھی، ہمیشہ سے پسند ہے اور ہمیشہ پسند رہے گی۔ کیا آپ بھی میری پسند کو پسند کریں گے اچھا نظم سنئے!

(رئیس)

محبّت جواں تھی، تمنّا حسیں تھی　　جوانی کی دنیا بہشت بریں تھی

نظر غوطۂ حسن سے شرمگیں تھی　　کنارِ محبّت میں اک مہ جبیں تھی

شبِ اوّلیں تھی شبِ اوّلیں تھی

شبِ اوّلیں کا وہ مخمور منظر　　وہ جلوؤں کی خلوت وہ پھولوں کا بستر

فلک پر تبسّم کناں ماہ و اختر　　امنگوں کی جنّت بساطِ زمیں تھی

شبِ اوّلیں تھی شبِ اوّلیں تھی

وہ نیچی نگاہیں، وہ کافر اشارے　　وہ بیتاب جلوے وہ رنگیں نظارے

چٹکتی تھیں کلیاں، چمکتے تھے تارے　　غرض میری دنیا کی ہر شے حسیں تھی

شبِ اوّلیں تھی شبِ اوّلیں تھی

وہ بدمست بہکی ہوئی نوجوانی　　وہ تاروں بھری رات کی ضوفشانی

ہر ایک سانس تھا حاصلِ زندگانی　　محبت کو فکرِ جدائی نہیں تھی

شبِ اوّلیں تھی شبِ اوّلیں تھی

لبوں پر تبسم نگاہوں میں جادو　　وہ شام و سحر یعنی رخسار و گیسو

وہ جذبہ، وہ جلوہ، وہ نغمہ، وہ خوشبو　　ادا نوجواں تھی، نظر نازنیں تھی

شبِ اوّلیں تھی شبِ اوّلیں تھی

رئیسؔ اللہ اللہ! وہ عہدِ محبت　　وہ بیباک نظریں، وہ گستاخ خلوت

اُمنگوں کی گھڑیاں مرادوں کی ساعت　　جوانی، جوانی سے پہلو نشیں تھی

شبِ اوّلیں تھی شبِ اوّلیں تھی

زوال آمادہ فرانس کی خونچکاں تاریخ کا ایک خونچکاں ورق

فرانس کے پاس ۳۰ لاکھ فوج تھی، می ژینو لائن جیسی طلسمی قلعہ بندیاں تھیں، بمبار طیارے تھے اژدر دہاں ٹینک تھے، اعلیٰ ترین بحری بیڑا تھا۔ فرانس گذشتہ جنگ عظیم کا فاتح اور یورپی تہذیب کا مرکز تھا۔ فرانس نے نپولین کو پیدا کیا، روسو اور والٹیر کو جنم دیا۔ مگر ۱۶ جون ۱۹۴۰ء کو اس نے ہٹلر کے طوفانی دستوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے۔ . . . کیوں . . . ؟ فرانس کی تباہی میں ایک عورت کا ہاتھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرنچ وزیر اعظم موسیو رینو، کی محبوبہ "ہیلن" نازیوں کا آلۂ کار تھی اور موسیو رینو . . . ہیلن کے ہاتھ میں ایک بیجان مجسمہ . . . آیئے ہم آپکو اس فرانسیسی ساحرہ کے حالات سنائیں۔

۱۶ جون ۱۹۴۰ء کو جب موسیو پال رینا ڈ نے نازی لمانداروں کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں اور دنیا کی یہ عظیم رین قوم فلینڈرز کے میدانوں اور شمالی فرانس کے علاقوں ب ہر ہٹلر کے طوفانی دستوں کے روبرو سر جھکانے پر مجبور ئی ہے . . . اُس وقت دنیا کے مُنہ سے بیساختہ حیرت استعجاب کی ایک چیخ نکل گئی تھی . . . فرانس دنیا کی ف اول کی طاقت . . . . . وہ فرانس جس نے ہذیب جدید کی رہنمائی کی، جس نے جمہوریت و عوامی حقوق ، لئے یورپ میں سب سے پہلی مرتبہ آواز بلند کی۔ جس روسو کو پیدا کیا، والٹیر کو جنم دیا . . . وہ فرانس جو یین اعظم کا گہوارہ اور پچھلی لڑائی کا فاتح تھا۔ ہاں وہی،

فرانس، وہی یورپ کا خوبصورت دل، وہی جمہوریت و آزادی کا بازو . . . ۱۶ جون ۱۹۴۰ء کو چند دنوں اور چند ہفتوں کے اندر ختم ہو گیا، اس کے تمام زرخیز علاقے چھین لئے گئے انتہا یہ ہے کہ پیرس تک ہتھیا لیا گیا۔ ۳۰ لاکھ فوج کچل دی گئی۔ گذشتہ جنگ عظیم کا فاتح . . . مارشل پیتان . . . نازیوں کا ایک ادنیٰ ماتحت بن گیا۔ وہ لوگ جنھیں فرانس سے محبت تھی، جو فرانسیسی قوم سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اس ناگہانی، اچانک اور اچنبھے میں ڈال دینے والے انقلاب سے دنگ تھے . . . فرانس ختم ہو گیا۔ فرانس کا ختم ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ یورپ کی روح مر گئی، مغربی تہذیب کا چراغ گل ہو گیا اور جدید تاریخ کے

بازوشل ہوگئے . . . . مگر ایسا کیوں ہوا ؟ . . . . فرانسیسی بُزدل نہیں ہیں ۔ نپولین اعظم کے ساتھیوں اور جنرلوں کی اولاد پر بے حمیتی اور بے عزتی کا الزام لگانا، تاریخ کا منہ چڑانا ہے ۔ مگر پھر بھی فرانس ختم ہوگیا . . . . . یہ نئی لڑائی کا ایک اہم سوال ہے ۔ فرانس میں کیا ایسی اندرونی کمزوری تھی جو اُسے گھُن کی طرح چاٹ گئی ۔ اِس شاداب اور تروتازہ درخت کی جڑ میں وہ کونسا شگاف پڑ گیا تھا، جس نے آندھی کے ایک ہی جھونکے میں اُسے زمین پر گرنے کے لئے مجبور کردیا . . . . فرانس کیوں زوال پذیر ہوا ؟

موسیو ایم جے بوئس (M. J. Bois) اور موسیو اینڈرے ماروئس (ANDRE MAUROIS) دو فرنچ اخبار نویسوں نے اس معمّہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے موسیو ماروئس نے اپنی مشہور تصنیف WHY FRANCE FALL "فرانس کیوں زوال پذیر ہوا؟" میں اسباب زوال فرانس پر ایک مبسوط و مکمل بحث کی ہے ۔ جہاں انھوں نے فرانس کے لیڈروں کی نااہلی، فرانسیسی قوم کی عیش پرستی اور تن آسانی، جنگ کے لے عدم طیاری اور نازی جاسوسی کے اثرات کو بدنصیب فرانس کے زوال و انحطاط میں کارفرما دیکھا ہے ۔ وہاں اِس مشہور مصنف نے فرانس کے تباہ و برباد ہوجانے کا ایک عجیب و غریب سبب بھی بیان کیا ہے ۔ یہ عجیب و غریب سبب فرانس کی ایک عجیب و غریب عورت . . . . ہیلن . . . . تھی ۔ جس نے نازی دباؤ کے وقت فرانسیسی وزارت کو ہتھیار ڈالدینے کی ترغیب دی اور اپنے شوہر موسیو پال رینا ڈ، کو مجبور کیا کہ وہ ایسے نازک لمحے میں وزارت عظمیٰ کے منصب جلیل سے استعفیٰ دیدے غالباً یہ داستان موجودہ جنگ کی سب سے زیادہ ہوشربا، سب سے زیادہ پُراسرار اور سب سے زیادہ حیرت انگیز داستان ہے جسے ہم قارئین مسافر کی عبرت کیلئے درج ذیل کرتے ہیں ۔

فرانس کو ایک عورت نے تباہ کردیا جسطرح وہ ہمیشہ قوموں اور سلطنتوں کو تباہ کرتی آئی ہے ۔

یہ ہے وہ رائے جو زوالِ فرانس پر جنرل ڈی گالے (آزاد فرانسیسیوں کے رہنما) نے ظاہر کی ہے ——— وہ عورت کون تھی . . . . ؟

حسن و رعنائی کا مجسمہ، ناز و شباب کا پیکر، دلربائی اور جاذبیت کا مجموعہ . . . . . سپید رنگ، سیاہ اور شوخ آنکھیں جن میں شرارت اور سنگدلی کی بجلیاں چمکتی تھیں، نرم و گداز سینہ جو ہزاروں رازوں اور سازشوں کا خزینہ تھا ۔ ہیلن غیر معمولی طور پر حسین و خوش جمال تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کا حسن ایک فتنہ تھا ۔ اور پیرس کے اعلیٰ ترین طبقے اُس کی ساحری و غارت گری کے سامنے سپر انداختہ تھے ۔ وہ فرانس کے بدنصیب وزیر اعظم موسیو پال رینا ڈ کی محبوبہ اور حکومت فرانس کی غیر سرکاری مشیر تھی ۔ پوری وزارت اس کے اشاروں پر ناچتی تھی ۔ فرانسیسی چیمبر میں جو بھی فیصلہ ہوتا تھا، اُس پر مہر تصدیق ہیلن کے ہاتھوں ثبت ہوتی تھی غالباً وہ اپنے وقت میں سنہ ۱۹۳۴ء لغایتہ ۱۵ جون سنہ ۱۹۴۰ء دنیا کی سب سے زیادہ موثر اور طاقتور شخصیت تھی . . . ہیلن کے متعلق بہت کچھ کہا جاسکتا ہے مگر قبل اس کے کہ ہم داستان زوالِ فرانس کے اِس سب سے زیادہ عبرت ناک نقطے پر آئیں بہتر ہے کہ پہلے اُس عام اخلاقی حالت کا ایک نقشہ کھینچ دیں جو فرانس کی تباہی کا بنیادی سبب تھی ۔ اور جس نے ہیلن جیسی حسینوں کو ملک و قوم کی پشت میں چھرا گھونپنے کیلئے آزاد کردیا تھا ۔

زوالِ فرانس سے پہلے فرانسیسیوں کی دماغی اور اخلاقی حالت کیا تھی۔ ۔ ۔ ۔ ؟

ایم لوئس نے اپنی تصنیف (TRUTH ON THE TRAGEDY OF FRANCE) میں اس موضوع پر جی کھول کر بحث کی ہے اُس نے لکھا ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ فرانس اپنی کمتر فوجی طاقت کی بنا پر تباہ ہوگیا۔ میں فرانس کی بربادی اور تباہی کا اصلی سبب جون ۱۹۴۰ء کے ابتدائی ہفتے کی خونریز جنگوں کو نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں فرانس کی موت اس سے بہت پہلے واقع ہو چکی تھی۔ وہ پچھلی لڑائی کے بعد ہی مرگیا تھا کیونکہ گذشتہ جنگ عظیم کے فاتحوں کی تلواروں پر زنگ لگ گیا تھا۔ وہ ہتھیار کمر سے کھول کر عیاشی اور تن آسانی پر اُتر آئے تھے۔ می ژینو لائن بنا کر اُنھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اُن کے مقابلہ پر نہیں آسکتی۔ فرانسیسی فوج تربیت و اسلحہ کے اعتبار سے دنیا کی اعلیٰ ترین فوج تھی۔ مگر وہ جدید فنِ جنگ سے واقف نہ تھی۔ فرانس کے پاس سامانِ جنگ کی بہتات تھی۔ کثیر سپاہی تھے۔ وسائل اور ذرائع کی بھی کوئی کمی نہ تھی، مگر اسکا کیا علاج ؟ کہ سپاہیوں میں باہم اتفاق نہ تھا، اُن کے لیڈر ایک دوسرے سے حسد رکھتے تھے۔ نوجوانوں کی اکثریت جنگ کے خلاف تھی کمیونسٹ عقائد نے انھیں سرمایہ دارانہ جنگ کا مخالف بنادیا تھا۔ فوج کے اکثر رہنما فاشی خیالات رکھتے تھے۔ فرانسیسی حکومت میں موسیو لاول اور فلینڈن جیسے غداروں کی بھی کمی نہ تھی۔ تعجب تو یہ ہے کہ وہ پولینڈ، ناروے اور ڈنمارک کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مگر پھر بھی اُنھوں نے جرمن اقدام کے خلاف کسی طیاری کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ نازی سیلاب می ژینو لائن سے ٹکرا کر پلٹ جائیگا۔ جنرل گیملان اور جنرل ویگان نے اپنی تمام بہترین فوج کو می ژینو لائن کی مضبوط قلعہ بندیوں میں نظربند کردیا تھا۔ اس طرح فرانس کے کارآزمودہ سپاہی معطل ہوکر رہ گئے تھے۔ فرنچ کمانڈروں کو غبارہ باز سپاہیوں بمبار طیاروں اور نازی پانچویں دستہ والوں کی طاقت پر چنداں اعتبار نہ تھا۔ وہ آخر وقت تک یہ سمجھتے رہے کہ جرمن فوجوں میں کوئی تجربہ کار افسر موجود نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ان تمام ناطیاریوں، خود پرستیوں، عیاشیوں اور تفرقہ انگیزیوں کا جو انجام ہونا تھا وہ ہوا۔

ایم لوئس نے جرمن حملے کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ :-

ٹھیک اُس وقت جبکہ ہٹلر کی طوفانی فوجیں فلنڈرز اور جنوبی بلجیم میں اتحادی طاقتوں سے نبرد آزما تھیں۔ جرمن سپاہیوں کا ایک چھوٹا موٹر سوار دستہ جو دو ہلکے ٹینکوں اور ایک بھاری ٹینک سے مسلح تھا، فرانس کی طرف پلٹ پڑا۔ اور میدانِ جنگ سے کئی سو میل آگے نکل گیا۔ اِس بہادر دستہ نے راستے کے تار اور ٹیلی فون کے تمام سلسلے منقطع کردئے فرنچ سپاہیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو غیر مسلح کردیا اور اُن کے ہتھیار توڑ کر پھر انھیں واپس کردئے۔ اِس جرمن دستے کی یلغار بظاہر ایک مذاق تھی۔ مگر اُف یہ مذاق کتنا خوفناک تھا۔ ۔ ۔ ۔ موٹروں میں بھاگتے ہوئے فرانسیسی سپاہی اِن جرمنوں کو جا بجا ملتے اور جرمن اُن کے لئے ارزاں قیمت پر پٹرول مہیا کردیتے تاکہ وہ اور دور بھاگ جائیں بعض اوقات وہ اِن فرانسیسی سپاہیوں میں لوٹ کا مال مثلاً چاکولیٹ، سگار اور کھیل کھلار مہیا کردیتے۔ شہر آمنیر کے حواس باختہ شہریوں سے اُنھوں نے بطور مذاق کہا کہ ۱۴ جولائی کو ہم پیرس میں ایک قومی میلے کا انتظام کررہے ہیں

آپ حضرات بھی اس میں شریک ہوں

واقعہ یہ ہے کہ اس جرمن دستے کی بہادری اور خود اعتمادی تاریخ میں بے مثل ہے۔ میکسیکو کی فتوحات میں جنرل کورٹز کے سپاہیوں نے ایسی شجاعت و ثابت قدمی نہ دکھائی ہوگی اور نہ میکسیکو کا بدنصیب تاجدار "ماننی زیوما" اس قدر بدحواس اور بزدل ثابت ہوا ہوگا جس قدر کمزوری اور بزدلی کا ثبوت فرانسیسی جنرلوں نے دیا۔ محاذ سے پورے چار سو میل کے فاصلے پر یہ غارتگر دستہ جب ایک فرانسیسی قلعہ کے پاس پہونچا تو ایک کرنل معہ اپنی رجمنٹ کے وہاں مقیم تھا۔ جرمن کمانڈر نے اُسے جھک کر سلام کیا اور کہا "باقاعدہ جرمن فوج یہاں دس منٹ کے اندر پہونچ جائے گی۔ اگر آپ نے اطاعت نہ قبول کی ۔ ۔ ۔ ۔"

تو ۔ ۔ ۔ ۔ حواس باختہ فرنچ کرنل چلایا

تو ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو معہ آپ کے بارہ سو آدمیوں کو قتل کر دیا جائیگا۔

یہ سُن کر اس بہادر کمانڈر نے ہتھیار رکھ دئے مگر اس کی فوج کے تین نوجوان افسروں نے اسے بے عزتی سمجھا اور وہ بھاگ کر قلعہ "پانٹی دی" میں چلے گئے۔

ایک دوسرے فرانسیسی افسر کو یہ دیکھ کر غش آگیا کہ جرمن فوجیں دریائے لائر کا پُل اُڑا رہی ہیں۔ حالانکہ اُس کی ڈیوٹی اسی پُل کی محافظت پر لگائی گئی تھی۔ خود اُس نے اِس بات کا اعتراف کیا کہ ہم میں سے ہر چھوٹے بڑے نے غلطیاں کی ہیں۔ ہم میکانیکی (مشینی) جنگ کے طریقے سے ہی واقف نہ تھے۔ ہمارے سپاہیوں کو لڑائی پر اعتماد نہ تھا۔ آدھی فوج اشتمالی (کمیونسٹ) تھی اور آدھے افسر فسطائی (فیسسٹ)۔ اسی آفیسر کا بیان ہے کہ ہمارے پاس ٹینکوں کی کافی تعداد تھی۔ مگر وہ می ژینو لائن میں محفوظ رکھ دی گئی تھی۔ ہمیں جرمنی کی فوجوں نے فتح نہیں کیا۔ نازی جاسوسوں نے جیتا۔ جب ۲۸ مئی ۱۹۴۰ء کو بلجیم کی فوجوں نے ہتھیار رکھ دئے اور ہزاروں پناہ گزیں فرانس کی طرف اُمڈے تو ان میں جرمن جاسوس بھی بہے چلے گئے۔ اُنھوں نے فرانسیسی دیہات میں جرمن فوجوں کی فتوحات اور بہادری کے افسانے سُنانے شروع کئے ملک میں بزدلی پھیلائی اور جرمن فوجوں کے لئے راستہ صاف کردیا۔ انھیں جاسوسوں کی بدولت دریائے میوز کے پُل نہ اُڑائے جاسکے۔ جس سے ہرہٹلر کے مشینی دستے ہوا کی طرح فرانس کے قلب میں آگھسے۔ فرانس کے بہت سے غدار دشمن کو خبریں پہونچاتے ہوئے پائے گئے ایک اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے ایک خفیہ وائرلیس نکلا جو جرمن فوجوں کو اطلاع دیتا تھا۔ فلینڈرز میں دیکھا گیا کہ رات کو برٹش ٹینکوں پر بم برسائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قریب رہنے والی ایک بڑھیا جاسوسی کرتی ہے۔ سگاروں کے پائپ میں وائرلیس کے چھوٹے چھوٹے اوزار چھپے ہوئے پائے گئے۔ پیرس میں ہزاروں آدمیوں کے پاس یہ اوزار نکلے ۔ ۔ ۔ ۔ غرض یہ ہے کہ ادھر تو جرمن فوجوں نے فرانس پر حملہ کیا اور اُدھر خود مُلک میں خاموش بغاوت شروع ہوگئی۔ یہ حالات تھے جن میں فرانس نے ہتھیار رکھے۔ مگر اس بربادی کی تکمیل کس طرح ہوئی اسے بھی سُن لیجئے۔ اِس بربادی کی تکمیل کاؤنٹس ہیلن ڈی پورٹے COUNTESS HELLEN DE PORTE کے ہاتھوں ہوئی۔

ہیلن کون تھی:- ؟

کاؤنٹس ہیلن ڈی پورٹے جنوبی فرانس کے ایک متموّل کارخانہ دار کے یہاں پیدا ہوئی۔ اِسکا وطن مارسیلے تھا۔ بچپن ہی سے اُسے اعلیٰ تعلیم دلائی گئی جب ہیلن پندرہ برس کی ہوئی تو اُس کا باپ پیرس کو منتقل ہوگیا۔ اِس وقت ہیلن کا عنفوانِ شباب تھا۔ وہ بہت جلد پیرس کے اُمرا کی منظورِ نظر بن گئی۔ ہیلن کا گھر فرانس کے سیاسی مدبّروں اور قدامت پسند سیاست دانوں کی نشست گاہ تھا۔ ہیلن حسنِ صورت کے ساتھ ذہانت و تعلیم کی رعنائیوں سے بھی آراستہ تھی۔ اِسی لئے اعلیٰ درجے کے نوجوان فرانسیسی اُس پر پروانہ وار فدا تھے۔ اِنھیں قدردانوں میں پیرس کے ایک معزز گھرانے کا فرد کاؤنٹ ڈی پورٹے بھی تھا۔ کاؤنٹ سے ہرچند کہ ہیلن کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاہم نمود کے خیال سے ہیلن نے کاؤنٹ ڈی پورٹے کے پیامِ محبت کو قبول کرلیا اور اس سے شادی کرلی

کاؤنٹ سے شادی ہونے کے بعد ہیلن پیرس کی اعلیٰ سوسائیٹیوں اور اربابِ حکومت میں اور بھی روشناس ہوگئی۔ وہ بڑی کشادہ دلی اور فیاضی سے فرانس کے مدبروں کی مہمانداری کرتی اور اپنی جسمانی اور دماغی خوبیوں کی وجہ سے ہر مجلس میں عزت کی نظر سے دیکھی جاتی۔ رفتہ رفتہ فرانس کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اُسی کے گھر میں ہونے لگا اس سلسلہ میں کافی مالی فائدہ بھی اُٹھاتی اور حکومت و اراکینِ حکومت کا معتمد ہونے کی وجہ سے اُس کا اثر و رسوخ بھی حیرت انگیز طور پر بڑھ گیا تھا۔ اسی زمانے میں ہیلن کی ملاقات موسیو رینو سے ہوئی جو فرانسیسی چیمبر کا ایک پُرجوش ممبر تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں "رینو" اِس غارتگرِ حسینہ کے چشم و ابرو کا شکار ہوگیا۔ اور ہیلن بھی رینو سے کچھ کم متاثر ہوئی ہیلن نے بہ یک نظر رینو کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو تاڑ لیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں ایم ٹارڈیو کی وزارت میں سفارش کرکے اُسے وزیر مالیات بنوادیا۔ ساتھ ہی ہیلن نے فرانسیسی چیمبر اور دفاتر وزارت میں رینو کا قابلیت کا پروپاگنڈا شروع کردیا رفتہ رفتہ ہیلن اور رینو کے تعلقات بہت بڑھ گئے ۱۹۳۸ء میں رینو موسیو ڈلاڈیر کی کیبنٹ میں شامل ہوگیا اور پہلی مرتبہ فرنچ مدبّروں نے اُس کی قابلیت و صلاحیت کا اندازہ کیا۔ . . . اِس وقت تک رینو اور ڈلاڈیر کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ مگر ہیلن کی سازشوں کی وجہ سے اِن دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ موسیو لینڈ نے لکھا ہے کہ جس روز رینا ڈ موسیو ڈلاڈیر کے بجائے وزیر اعظم مقرر ہوا ہے۔ میں اس کے پاس موجود تھا۔ میں نے اسے سخت دل گیر اور رنجیدہ پایا۔ رینو بڑی بے دلی سے وزارت کے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اُٹھایا اور یہ دیکھکر کہ ہیلن اُس سے مخاطب ہے۔ رسیور جھنجھلا کر پٹک دیا خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑدو۔

بارولس نے لکھا ہے کہ رینو ہیلن کے ہاتھ میں ایک آلۂ بیجان کی طرح کام کرتا تھا اور اُس کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنی نازک اندام مگر فولادی عزم رکھنے والی ساحرہ کے احکام سے ذرّہ برابر سرتابی کرسکے . . . . اب رینو اور ہیلن کے تعلقات اس حد تک پہونچ گئے تھے کہ تمام پیرس اِن پر انگشت نمائی کر رہا تھا۔ آخر دونوں نے ازدواجی زندگی اختیار کرلی اور ہیلن مادام رینو کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ اسی زمانے میں ہیلن کو دنیا نا جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں اُس کی چند نازی رہنماؤں سے ملاقات ہوئی ہیلن پر نازی فلسفہ کا بہت گہرا اثر پڑا اور جب وہ پیرس واپس آئی ہے تو وہ پکّی فیسسٹ بن چکی تھی۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کے بعد

جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں فرانس اور برطانیہ نے ہٹلر کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے تو ہیلین نے نازیوں کے ایجنٹ کے طور پر پیرس میں اتحادیوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اُسے برطانیہ سے دلی نفرت تھی اور وہ اراکین حکومت کو جرمنی سے جداگانہ مصالحت کر لینے کا مشورہ دیتی رہتی تھی۔ ہرچند کہ رینو پوری طاقت سے جرمنی کی مزاحمت کے لئے طیار تھا، مگر وہ ہیلین کے سامنے بے بس تھا۔ رینو کی خواہش تھی کہ وہ جنرل ڈی گالے کو اپنی وزارت میں وزیر جنگ بنائے مگر ہیلین کو ڈی گالے سے چڑ تھی کیونکہ وہ جنگ جاری رکھنے کی رائے دیتا تھا۔ . .

. . . دو بجے رات تک رینو ہیلین کو سمجھاتا رہا مگر وہ کسی طرح ڈی گالے کو وزیر جنگ بنانے پر آمادہ نہ ہوئی آخر تنگ آکر اس نے کہا

تم اُسے زیادہ سے زیادہ اپنا انڈر سکریٹری بنا سکتے ہو مگر میں ڈی گالے کو وزیر جنگ کے عہدے پر نہیں دیکھ سکتی۔

آخر موسیو رینوڈ کو ضدی ہیلین کا دل رکھنا پڑا۔ اور جنرل ڈی گالے وزارت حربیہ کے عہدے پر سرفراز نہ ہو سکا۔

یہ وہی جنرل ڈی گالے ہیں جو آج آزاد فرانسیسیوں کے رہنما کی حیثیت سے وشی گورنمنٹ کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہیلین کی غداری کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اُس نے اس واقعہ کے بعد اپنے شوہر کی موجودگی میں جنرل ڈی گالے کو ایک خط لکھا۔ جس میں حسب ذیل الفاظ خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔

جنرل: تم یقین رکھو کہ میری غیر مشروط اطاعت ہی تمہاری بہبودی اور ترقی کی ضمانت ہے

یہ واقعہ ہے کہ تمام مشکلات کے باوجود موسیو رینوڈ جرمنی سے جنگ جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے متعدد تقاریر میں اس عزم صمیم کا اعادہ کیا تھا۔ جب مارچ ۱۹۴۰ء میں موسیو ڈلاڈیر کے بعد وہ برسر اقتدار آیا تو اُس نے اپنی تاریخی تقریر ان لفظوں میں شروع کی تھی۔

"ہم جمہوریت کے مقصد کے لئے ہر محاذ پر لڑیں گے"

مگر ٹھیک اُس وقت جبکہ رینو یہ تقریر کر رہا تھا ہیلین ہنس رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رینو کی قسمت میں بدترین شکست لکھی ہے۔ ۹ رجون ۱۹۴۰ء کو جب رینو کی کیبنیٹ پیرس چھوڑنے پر مجبور ہوئی تو جنرل ڈی گالے نے وزیر اعظم کو مشورہ دیا کہ حکومت کو ٹورس میں منتقل ہو جانا چاہئے اور برٹین کے قلعہ میں محصور ہو کر برطانوی حکومت سے امداد طلب کرنی چاہئے۔ لیکن ہیلین نے اُسے ڈانٹ دیا اور یہ تجویز ناکام رہی۔ اِس وقت ملک میں سخت انتشار پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف جرمن فوجیں قابض ہو چکی تھیں۔ نازیوں کے جاسوس ہر گوشے میں پھیلے ہوئے تھے پیرس جیت لیا گیا تھا۔ قوم بددل تھی۔ فوج منتشر تھی۔ افسران ایک دوسرے کے خلاف الزامات لگا رہے تھے۔ آخر پھر کونسل کا اجلاس طلب کیا گیا اور جنرل ڈی گالے کی تجویز پر طے ہوا کہ شکست خوردہ کابینہ کو کوئمپر QUIMPER میں چلا جانا چاہئے۔ چنانچہ فون پر کوئمپر کے کمانڈر کو ہدایت کی گئی کہ وہ شہر کی اہم عمارات فوجی افسران اور اراکین حکومت کے قیام کے لئے خالی رکھے۔ کوئمپر بریسٹ کا بندرگاہ اور زمین براعظموں یورپ، امریکہ، اور شمالی افریقہ کا نقطۂ اتصال ہے۔ اسی رات کو جب موسیو رینوڈ اور ہیلین CHATEAU DE کے قلعے میں

اُکھڑے ہوئے تو ہیلن نے کوئمپر جانے سے صاف انکار کردیا مجبوراً رینو کو حکومت بارڈیو میں منتقل کرنی پڑی ۔ آخر جب فرانسیسی حکومت کی کمزوری انتہا کو پہونچ گئی تو مسٹر چرچل بذاتِ خود ایک خاص طیارے میں سوار ہوکر تورس پہونچے اور ایک بند کمرے میں فرانسیسی وزرار اور مسٹر چرچل کے درمیان گفت وشنید شروع ہوئی۔ پال رینو نے فرانسیسی حکومت کی کمزوری، فوج کی تباہی اور جرمن فتوحات کی تمام تفصیلات چرچل کو بتائیں ۔ برطانوی وزیراعظم نے فرانسیسی حکومت کی مشکلات کو ہمدردی سے سُنا اور مشترکہ دشمن کے خلاف "اینگلو فرنچ یونین" (برطانوی، فرانسیسی ریاست متحدہ) کے قیام کی تجویز پیش کی۔ قریب تھا کہ فرانسیسی کابینہ اِس تجویز کو منظور کرلیتا کہ ہیلن آندھی کی طرح مشورت گاہ میں داخل ہوئی اور اُس نے فرانسیسی کیبنٹ اور مسٹر چرچل کی تمام تجاویز کو پلٹ کر رکھ دیا۔ اور علانیہ وزراءِ فرانس سے کہا کہ:-

"ہم اِن برطانویوں کی وجہ سے اپنے کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ نازی ہمارے گھر میں آگھسے ہیں ہمیں نازیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑیگا"

مارشل پیتان نے ہیلن کی رائے کی پُرزور لفظوں میں تائید کی اور آخرکار مسٹر چرچل کو ناکام واپس جانا پڑا۔ . . . . اُس کے چند گھنٹے بعد پھر برطانوی سفیر سر رینالڈ کیمبل موسیو رینو سے ملا اور اس نے جنگ جاری رکھنے کی صلاح دی مگر ہیلن کا جادو چل چکا تھا۔ آخر ۱۶ جون ۱۹۴۰ء کو رینوڈ نے وزارتِ عظمےٰ سے استعفیٰ دیدیا۔ اور موسیو پیتان حکومت خود وہ فرانس کے وزیر اعظم مقرر ہوئے ۔ اُس وقت ہیلن نے پال رینوڈ کو مشورہ دیا کہ وہ حکومت فرانس کی طرف سے امریکہ میں سفیر بن کر چلے جائیں ۔ چنانچہ ہیلن اور رینو اِس ارادے سے اسپین کو روانہ ہوگئے۔ . . . .

مگر اَب ہیلن کی باری تھی۔ وہ قسمت کی بساط پر پوری فرانسیسی قوم کی زندگی کا جُوا کھیل چکی تھی۔ اَب پانسہ تقدیر کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ ایک روز جب کہ ہیلن اور موسیو پال رینوڈ موٹر میں کسی طرف جارہے تھے تو اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی کسی طرف سے آئی اور فرانس کی ساحرہ ختم ہوگئی۔ . . . . بدنصیب ساحرۂ فرانس!

قرآنِ محبت

کوکب مرادآبادی

میں نے جو کہا اُس سے بہ اعلانِ محبت ‖ اتنا تو بتا اے گلِ بستانِ محبت
تو جانِ محبت ہے کہ میں جانِ محبت ‖ ہنس کر یہ کہا اُس نے بعنوانِ محبت
تم جانِ محبت ہو، میں ایمانِ محبت

در پردہ اشاروں میں ہے پیغامِ تمنا ‖ ہے خوب مرے واسطے انعامِ تمنا
آغازِ محبت کا ہے انجامِ تمنا ‖ ظالم کی ہر اک بات ہے الہامِ تمنا
کافر کا ہر اک حرف ہے قرآنِ محبت

بدمست ہے کتنا دلِ سرشار کا عالم ‖ نغمات کی بارش ہے کہ اشعار کا عالم
پھیکا ہے جمالِ گل و گلزار کا عالم ‖ اللہ رے رنگینیٔ افکار کا عالم
وہ بزمِ تصور میں ہیں مہمانِ محبت

یہ پھول، یہ پتے، یہ گلستاں کے نظارے ‖ یہ شمس و قمر اور یہ چمکتے ہوئے تارے
ہیں پردۂ ہستی سے یہ قدرت کے اشارے ‖ قائم ہے ہر اک چیز محبت کے سہارے
ہر ذرۂ ہستی پہ ہے احسانِ محبت

بے وجہ نہیں یہ اثرِ شورشِ مستی ‖ خود کیفِ حقیقت ہے مری بادہ پرستی
ہے جنسِ وفا عالمِ جذبات میں سستی ‖ معمور ہے داغوں سے مرا دامنِ ہستی
کوکب بھی ہے گلچینِ گلستانِ محبت

جس طرح چودھویں رات کا چاند

اپنی ٹھنڈی لطیف اور خوشگوار چاندنی سے دل و دماغ کو راحت و سکون پہونچاتا ہے

اسی طرح

انور خاں محبوب کمپنی انور گنج جبلپور سی۔ پی کی مشہور و معروف

چاند مارکہ بیڑی

بھی اپنی لطافت، خوشگواری اور فائدہ مندی کے اعتبار سے دل و دماغ، سینہ، جگر اور پھیپھڑے کو فرحت، طاقت اور سکون پہونچاتی ہے۔ وہ صاف خالص اور نباتی تمباکو سے طیار کیجاتی ہے۔ دھویں میں کثافت نہیں چاند مارکہ بیڑی کے استعمال سے صحت و تندرستی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا

اگر آپ

بہترین حقہ اور اعلیٰ ترین سگریٹوں کا حقیقی لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو یاد رکھیے کہ چاند مارکہ بیڑی ہی استعمال کرنی چاہئے۔ یہ ہر دلعزیز بیڑی ہندوستان کے ہر شہر ہر قصبہ و ہر گاؤں میں اپنا نام پیدا کر چکی ہے۔ اس کی خصوصیات بے نظیر اور اسکے اوصاف لاجواب ہیں چاند مارکہ بیڑی کے علاوہ انور خاں محبوب کمپنی کی تمام برانڈز انھیں خصوصیات کی حامل ہیں ؛؛

اس نیکنام کمپنی کی خوش ذائقہ اور مفید بیڑیوں نے ہندوستان کی بڑی بڑی نمائشوں میں سارٹیفکٹ حاصل کئے ہیں، ہر موسم، ہر آب و ہوا اور سفر و حضر کی حالت میں آپکی جیب میں انور خاں محبوب کمپنی کی بیڑی کا ایک بنڈل رہنا چاہیے

قائم شدہ سنہ ۱۹۱۰ء ——— رجسٹری شدہ سنہ ۱۹۳۵ء

اُس جانِ آرزو کے نام جس کی آرزو میرا مقصدِ حیات ہے

وہ خط جسے لکھنے والے نے خونیں آنسوؤں سے لکھا اور پھر . . . پھر اسے وہاں بھیج دیا جہاں اُسکا انتظار کیا جا رہا تھا . . . مگر سوالِ شوق ابھی تک تشنۂ جواب ہے اور نامہ نویس محبت ہمہ تن اضطراب — — — — — — — — —

کعبۂ مراد !

آج میرے سامنے کتنی سنگین حقیقت ہے کہ عورت بھی اتنی شدت کے ساتھ محبت کرنے کے بعد بھول جاتی ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو خود اپنے سینے میں جھانک کر دیکھو ایک لمحے کے لئے ماضیٔ قریب کو یاد کرو۔ آہ وہ ماضی جس کی شدت کے بل بوتے پر میں جی رہا ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس وقت تمہیں خط کیونکر لکھ رہا ہوں۔ اس لئے کہ جب تمہاری بے نیاز خاموشی اِن باتوں سے مستغنی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ میں کسی جذبے سے مجبور ہو کر تمہیں بھی مجبور کردوں۔ اور تمہارے سکون آمیز سکوت میں خلل انداز ہوں۔ آخراتنے روز میں نے انتظار کیا تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے صبر کرلیتا اور بجائے اس کے کہ تمہارے جذبات کو اپنی مجرمانہ بیکسی کی قابلِ رحم صورت دکھا کر متحرک کرنے کی کوشش کرتا۔ نہ اپنے اِن جذبات پر قابو پانے کی کوئی صورت نکالتا اور بہت ممکن تھا کہ بہت جدّ و جہد کے بعد میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن کیا ایک ایسے بے بس مجرم کے لئے جسے نہیں معلوم کہ کس ناکردہ گناہ کی پاداش میں یہ تکلیفِ انتظار دی جاری ہے۔ یہ جائز تھا کہ وہ اِس طرح خاموش رہتا؟

ممکن ہے کہ تمہارے قانونِ محبت میں یہ جائز ہو مگر میرے اِس نادان دل میں (جس نے تمہارے ساتھ محبت کرنے کا اس وقت دعوےٰ کیا تھا جب ا۔ یہ خبر نہ تھی کہ یہ راہ کس قدر دشوار گذار ہے) جب تک ایک ذرّہ بھی آفتابِ محبت کی تابانی سے رقصاں ہے۔ اُسوقت تک یہ ناممکن ہے کہ میرا قدم راہِ وفا سے کسی وقت ڈگمگا جائے

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

مگر کیا اِن دعوؤں سے تمہاری مہرِ سکوت ٹوٹ سکتی ہے؟ کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ میرا مایوسانہ لہجہ

تمہارے شیوۂ تغافل پر کوئی اثر ڈال سکے گا ؟ کیا ممکن ہے کہ میری بیتاب محبت تم سے ایک خط کی بھیک مانگے اور تم اس سوال کو ایک شان بے اعتنائی سے ٹھکرا دو۔

میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہاری واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں

دنیائے شوق و تمنا میں یہ حقیقت زرّیں حروف سے کندہ کی جائے گی کہ ایک مجبور اپنے ایک سچے دوست اور پرستار کی وفاؤں کا جواب ایک اندازِ بے نیازی، ایک نظرِ استغنا ایک بے پروا خاموشی سے دیتی ہے۔ اور پھر یہ کہتی ہے کہ تم نے مجھے بدنام کر دیا، میری زندگی خراب کر ڈالی، مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا . . . آہ !

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمہارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

دنیا کے قاعدوں کو توڑ دو، اصول اور کلیہ کوئی چیز نہیں۔ دستور ایک بے معنی چیز ہے۔ الفت کے مضبوط رشتے اگر انسانی ہاتھوں سے ٹوٹ جایا کرتے تو عشق کو غیر فانی کہنے کا مجاز دنیا سے اٹھ جاتا۔ اگر کوئی چاہے کہ قانونِ فطرت کو بدل دے اور اِس قید پابندی سے آزاد ہو جائے جو دنیا اور اُس کے تعلقات نے اُس پر عائد کی ہے تو کیا یہ ممکن ہے ! . . . . شاید یہ ہو جائے اور انسان رہبانیت کی قابلِ تحقیر زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر کیا یہ فانی ہاتھ اِس غیر فانی شئے کو مٹا سکتے ہیں جو دو انسانوں کو ایک نامعلوم طریقے سے مسحور کر لیتے ہیں۔ وہ رشتہ جو عشق ابدیت کی قسم کھا کر باندھتا ہے پھر کسی کے توڑے نہیں ٹوٹتا تو کیا اگر میں چاہوں کہ تم سے خفا ہو جاؤں۔ تم سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لوں تو کیا یہ میرے بس میں ہے ؟

اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں

مایوسی کا برا ہو کہ کتنے کتنے مہیب اور خوفناک مناظر تصور کے سامنے پیش کرتی ہے اور طائرِ وفا کے سامنے کیسے کیسے جال پھیلاتی ہے۔ لیکن بڑا قادر و قیوم ہے وہ خدائے محبت جس نے اِس نازک پرند کو وہ قوت ارادی بخشی ہے جس کے سامنے وہ تکلیف میں پھڑک پھڑک کر یہ چیخ اٹھتا ہے ؎

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مگر ناامیدی کے جال میں پھنس کر اس وفا کو جس کا نقش اُس کے ہر پَر میں کندہ ہے، بدنام کرنا نہیں چاہتا۔ نامرادی دنیا میں پیدا نہ ہوئی ہوتی تو انسان کو جنت کی خواہش باقی نہ رہتی۔ ناکامی اِس جہان پر اس قدر حاوی نہ ہوتی تو یہی دنیا غیر فانی ہو جاتی۔ مگر غافل اور نادان انسان نہ معلوم کیا کیا منصوبے گانٹھتا ہے، کیا کیا امیدیں قائم کرتا ہے۔ کیسے کیسے آرزوؤں کے پودے لگاتا ہے، اُن کو اشکوں سے سیراب کرتا ہے خونِ جگر کی غذا دیتا ہے آخر محنت و مشقت کے بعد وہ ایک خوشنما باغ کی صورت میں تبدیل ہو کر اُس کے دل کو فریبِ تسلی دیتا ہے۔ مگر اس کو خبر نہیں کہ خزاں آہ ظالم خزاں تاک میں ہے۔ اور قبل اس کے کہ اِس باغ میں پھل آئیں اُس کی پتیاں جھڑ جھڑ کر پریشان ہو جاتی ہیں۔ اِس وقت اُس بدنصیب کی کیا حالت ہو جاتی ہوگی۔ انسانی قلم اِس کیفیت کی تصویر کشی نہیں کر سکتا۔ دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ وہ باغ، وہ فضا، وہ بہار ایک خواب نظر آتا ہے یہی حال میری زندگی کا تمہارے ساتھ ہے۔ اب شاید

تمہیں ماضی کی یاد آرہی ہوگی

تمہیں تو ہو جسے کہنی ہے ناخدا دُنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

تم کہتی ہونگی کہ آخر اس شاعرانہ خیال آرائی کا کیا مطلب ہے؟ لیکن محبت کا تیر دل پر کھا کر انسان خود شاعر بن جاتا ہے۔ اور خیالات کی فراوانی بے اختیار اس کے قلم سے اِسی قسم کے الفاظ نکال دیتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ریکارڈ پر سوئی لگتے ہی نغمات بیدار ہو جاتے ہیں ممکن ہے تم اس جنون انگیز طرزِ تحریر پر ہنسو لیکن تم سے شکوہ نہیں۔ یہ امر حقیقی ہے جو ایک بیکس، ہجراں نصیب دور افتادہ کے جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ . . . . آہ یہ بھی کیسی سنگین مجبوری ہے!

کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے
یہاں تم آ نہیں سکتیں وہاں میں جا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہونچا نہیں سکتا

کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ غنچۂ مراد کھلے گا اور دامنِ حزیں کو گُلِ مقصد سے ہم آغوش کر دیگی . . . . ہاں یہ ممکن ہے اور صرف ایک صورت ہے۔ کیا میں اسکا اظہار کر سکتا ہوں؟ . . . . وہ صورت تمہاری ایک نظرِ کرم . . . . ایک لفظِ محبت . . . . نہیں صرف ایک حرف اپنی خیریت کا . . . . اس کے سوا اگر کچھ مانگوں تو گنہگار اس کے سوا کوئی حسرت ہو تو ملزم . . . . .

ابھی یہ سطور لکھ ہی رہا تھا کہ یکایک میرا ایک دوست شرافت آ گیا۔ وہی شرافت جو کبھی میری طرح خوش و خرم تھا جو مسکرایا کرتا تھا اور اُس کے مسکرانے اور خوش رہنے کا سبب . . . تمہاری عزیز ترین سہیلی تھی جس نے تمہاری طرح اس غریب کو ٹھکرا دیا۔ اور آج اُس کی زندگی [illegible] آہ ہو کر رہ گئی ہے بیٹھے بیٹھے نادرہ اس [illegible] رنگینیاں بیان کرنی شروع کر دیں۔ میں [illegible] شروع کر دیا۔ . . . . اور اپنا حال کیا لکھوں

کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا [illegible]
جو گانا چاہتا ہوں، آہ وہ میں [illegible]

اب ختم کر رہا ہوں اور تمہاری [illegible] رومال میں نکلے ہوئے آنسوؤں کو اسی رومال میں جذب کر رہا ہوں جس کے کونے میں کبھی تم نے روشنائی سے . . . .

وہ رومال آج بھی میرے پاس ہے اگرچہ بہت میلا ہو گیا ہے۔ اور دھونا اس لئے نہیں کہ تمہارے ہاتھوں سے لکھی ہوئی وہ آخری یادگار مٹ جاویگی . . . . . .

کہاں تک سُنوگی مجھ سے اپنی پرستش کا حال
بک رہا ہوں جنوں کے عالم میں
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

فقط سوگوار حیات

تصوّر میں اُن کا جمالِ حسیں ہے
ابھی تک مگر اُن کو دیکھا نہیں ہے

سُنا ہے نگاہوں میں ہے زندگانی
سُنا ہے اداؤں میں ہے نوجوانی
سُنا ہے اشاروں میں مستی بھری ہے
سُنا ہے وفاؤں کی دلمیں ہے ٹھانی
ابھی تک مگر اُن کو دیکھا نہیں ہے

سُنا ہے مجھے یاد کرتی ہیں وہ بھی
سُنا ہے کہ دم میرا بھرتی ہیں وہ بھی
مری رہ گذر سے مری سامنے سے
سُنا ہے کہ اکثر گذرتی ہیں وہ بھی
ابھی تک مگر اُن کو دیکھا نہیں ہے

سُنا ہے وہ کہتی ہیں میرا فسانا
سُنا ہے وہ گاتی ہیں میرا ترانہ
سُنا ہے کہ مخمور ہے نوجوانی
سُنا ہے کہ ہے مستیوں کا زمانہ
ابھی تک مگر اُن کو دیکھا نہیں ہے

سُنا ہے حیاتؔ اُنکو احساس بھی ہے
سُنا ہے انھیں حسن کا پاس بھی ہے
سُنا ہے کہ رنگین ہے نوجوانی
سُنا ہے محبت کی بو باس بھی ہے
ابھی تک مگر اُن کو دیکھا نہیں ہے

رُوس کے جادُو نگار ادیب چیخوف کے افسانے کا عکس لطیف

گاڑی پوری رفتار سے اپنی منزل مقصود کی جانب دوڑ رہی تھی - درجۂ اول میں ایک حسین عورت کسی قدر جھکی ہوئی بیٹھی تھی - اس کی نرم نرم مخروطی انگلیوں میں دبی ہوئی خوبصورت علکھبیا آہستہ آہستہ ہل رہی تھی اور مرمریں سینے پر آویزاں روسی وضع کا جھلملاتا ہوا زیور سانس کے مدوجزر سے اس طرح کانپ رہا تھا گویا سمندر کی مست موجوں کے درمیان کوئی کشتی ہچکولے کھا رہی ہو - وہ کچھ پریشان حال سی نظر آ رہی تھی - غالباً اس کو کوئی دلی کوفت لاحق تھی

مقابل کی نشست پر کمیٹین کا نوجوان سکریٹری بیٹھا تھا - ایک ادیب کی حیثیت سے وہ کافی شہرت و وقعت حاصل کر چکا تھا - ابھی چند مہینے کی بات ہے کہ اس نے ملک کے چوٹی کے جرائد میں چند ایسے دلولہ انگیز افسانے لکھے تھے جن میں فطرت انسانی پر اس قدر محققانہ اور پُر تاثیر پیرائے میں اظہارِ خیال کیا تھا کہ ہر ذوقِ سلیم رکھنے والے انسان کے دل میں اس کی قدر و منزلت ہو گئی اس وقت اس کی فکر انگیز نگاہیں عورت کے خزاں دیدہ چہرے پر مرکوز تھیں جس پر کلفتِ ذہنی غم و اندوہ بن کر چھائی ہوئی تھی - وہ اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر وہ سربستہ راز معلوم کرنا چاہتا تھا - جن کی غم انگیزیوں نے اس عورت کو اس قدر خستہ حال بنا دیا تھا - کچھ عرصے تک وہ گہری سوچ میں غرق رہا - پھر یکایک اس کے سنجیدہ چہرے پر سرخی کی ہلکی ہلکی لہریں اس طرح پھیل گئیں جیسے ساکن پانی پر کنکر پھینکنے سے لاتعداد چھوٹے بڑے دائرے لیکیا اُٹھیں: اس کے خشک ملاگیری لبوں پر ایک پھیکا سا تبسم اُبھر آیا۔

تمہارے پُر اسرار حالات مجھ پر منکشف ہو گئے - میں سب کچھ سمجھ گیا - اُس نے عورت کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا، تمہاری روح ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے - وہ اس شکنجے سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے جس نے اس کو مضبوطی سے جکڑ دیا ہے - یہ عزائمت شکن اور صبر آزما لمحہ ہے - لیکن تم دامنِ صبر کو ہاتھ سے مت چھوڑو . . . . . جان لو زندگی مسلسل جد و جہد کا نام ہے - میں وثوق سے کہتا ہوں کہ تمہاری مساعی شرمندۂ تکمیل ہو کر رہیں گی -

"والڈیمیر! تم میری یہ عبرت آموز داستان قلمبند کرا کے شائع کرا دو" - آخر عورت بولی (اُس کے لہجے میں رقت آمیز کیفیات تڑپ رہی تھیں) میری زندگی سراسر تحیر زا اور غیر مربوط واقعات سے لبریز ہے - جس کی کوفت ہر وقت مجھ کو گھلائے ڈال رہی ہے - میرے دل پر ہر لمحہ

مسرت و ارمان کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ یوں سمجھ لو
کہ میں ایک ایسی کہانی کی ہیروئن ہوں جو مجسم المیہ ہے
۔ والڈیمر صاحب! میری آواز کو عوام تک پہونچا دو۔ ایک
ایسی [illegible] کی ظلمت بکف تاریکیوں میں گھری ہوئی
روح کے احساسات کو الفاظ کے قالب میں ڈھال
دو۔ تمہارے قلم کی ہر جنبش تمہاری نگاہ کا ماہرانہ انسانی
نفسیات کو پیش کرنے والا ہے۔ تمہاری عالی فراست
کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس ہماری
ملاقات کو مشکل سے ایک ساعت گذری ہوگی کہ تم
نے چہرے کے اندازات سے وہ واقعات معلوم کر لئے جو
دل کی عمیق گہرائیوں میں دفن ہو چکے تھے۔

بہر اب تم ان واقعات کو بالتفصیل بیان کر دو

اچھا تو پھر سنو! میرا باپ ایک غریب منشی تھا۔
وہ بڑا زندہ دل اور کٹر واقع ہوا تھا۔ ہر انسان میں کم
وبیش کچھ نہ کچھ خرابیاں ضرور ہوتی ہیں اور جو ہستی ان سے
مبرا ہے وہ انسان نہیں فرشتہ ہے، فرشتہ۔ چنانچہ میرے
باپ میں یہ عیب تھا کہ وہ شرابی قمار باز اور ساتھ ہی ساتھ
رشوت خوار بھی تھا۔ اور میری ماں کس قسم کی تھی یہ مت
دریافت کرو۔ میرا دل اس کے تصور ہی سے ڈوبنے لگتا
ہے۔ بہر حال یہی ہے کہ ہم کردار کو چھوڑ کر ماحول کو پیش نظر
رکھیں۔ یہی ہماری تباہی کا سب سے بڑا سبب ہے۔
بہر نوع ہمارا خاندان مصائب و تخریب کے ان اندھیروں
میں پھنسا ہوا تھا جہاں سوائے ضلالت اور گمراہی کے
کچھ نہیں۔ اسی واسطے مجھ کو فکرِ معاش کے لئے جلد ہی
مجبور ہونا پڑا۔

ہوسٹل کی زندگی کس قدر گندی ہوتی ہے یہ تم
سے پوشیدہ نہیں۔ جہاں مخرب اخلاق ناول مطالعہ
کے لئے بڑی آسانی سے فراہم ہو سکتے ہیں۔ یہ زندگی کا
وہ دور ہوتا ہے جب رگ رگ میں جوانی کا گرم گرم لہو
ابلتا ہے، جب دل ارمان کا پیاسا ہوتا ہے۔ جب روح
شباب کی معیت کوشیوں میں سمو جانے میں جھجک
محسوس نہیں کرتی، تم جانتے ہو۔ یہ کس قدر نازک اور صبر
آزما دور ہوتا ہے۔ ہمارے قدم طوفان زدہ کشتی کی طرح
ڈگمگانے لگتے ہیں۔ ایک لہر اور صرف ایک لہر ہم کو خس
وخاشاک کی طرح بہائے جاتی ہے اور پھر ہم خود کو ایک
ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح مجبورِ محض پاتے ہیں۔ جو بلندیوں
سے اتر کر پستیوں ہی میں گرتا چلا جاتا ہے۔ سوچو تو جوانی
کی ایک ذرا سی لغزش کس قدر تباہ کن اور جاں گسل
ہوتی ہے۔ ہوش و خرد کے اس امتحان میں کامیابی کی
ہی زندگی کی حقیقی کامیابی ہے۔ تم تو ایک ماہر نفسیات اور
حساس طبع انسان ہو۔ زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی
واقف۔ بھلا تم ہی بتاؤ عورت کی اس فطری کمزوری کا
کیا علاج کیا جائے۔ جو روزِ ازل سے اس کے لئے ودیعت
کی گئی ہے۔

میں فطرتاً مستقل مزاج واقع ہوئی ہوں۔ میرے
دل میں ایک ٹھوس جذبہ پرورش پا رہا تھا۔ میں ان تمام
قید و بند سے آزاد ہو کر ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی خواہاں
تھی جو مسرت و ابتہاج سے لبریز ہو۔

کتنی عجیب شخصیت؟ والڈیمر نے زیر لب آہستہ
سے کہا اور اس کی نرم و گداز کلائی کو بیساختہ چوم لیا۔
... میں تمہارے ہاتھ کو نہیں بلکہ انسانی مصائب
کو بوسہ دے رہا ہوں۔

میں شہرت و عزت کے وہ بہار آفریں خواب دیکھ
رہی تھی جن کی کیف انگیزیاں مجھ کو ایک ایسی بلندی پر

دے گئیں جہاں رومان کے ہلکے ہلکے سائے حدِ نظر تک بکھرے ہوئے تھے۔ اور فضا محبت کی عطر بیزیوں سے مملو۔ عام عورتوں سے بالکل جداگانہ مطمع نظر جو زندگی کو ارفع و اعلےٰ بنا دے .... مگر .... مگر .... یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ آہ ایک بوڑھے جنرل نے میری راہ میں حائل ہو کر امیدوں میں اضمحلال اور امنگوں پر پانی پھیر دیا۔

تم سن رہے ہو والڈیمیر! یہ میری کتنی بڑی قربانی تھی۔ میں چاہتی تو اس رشتے کو رد کر دیتی۔ مگر میں نے اپنی تمناؤں کا دوسرے کی خوشیوں کی خاطر خون کر دیا۔ سوائے اس کے ایک کمزور عورت کر بھی کیا سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ والدین خوش تھے۔ دولت میرے قدم چوم رہی تھی لیکن سکونِ خاطر کا نام عنقا!

کتنا روح فرسا اور ہیجان خیز وہ زمانہ تھا۔ اب بھی جب یاد آجاتا ہے تو روح کانپ اٹھتی ہے ....

اُف جس وقت وہ محبت سے میری گردن میں باہیں ڈال دیتا تھا تو اسکا بھدا چہرہ عجیب کریہہ المنظر ہو جاتا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی میری روح نوچ کر پھینک رہا ہے۔ خیر مجھے اس کی غیبت نہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ اپنے وقت کا ایک شہرۂ آفاق جنرل تھا۔

کبھی کبھی میں اُن بے چینیوں اور روحانی اذیتوں سے عاجز آکر بغاوت پر کمربستہ ہو جاتی پھر یہ سوچ کر صبر آجاتا کہ بوڑھے کو ہر سانس موت کے قریب پہنچا رہی ہے۔ اس کے مرتے ہی میں آزاد ہو جاؤنگی اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے محبوب سے مل سکونگی۔ جس کی ذات سے میری تمام مسرتیں وابستہ ہیں۔ وہی جس کا تصور راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے والڈیمر

دنیا میں ایک ایسی بھی ہستی ہے جو میری متاع عزیز ہے جو میری روح ہے۔ میری زندگی ہے۔ اس نے اپنے پنکھے کو آہستہ آہستہ ہلانا شروع کر دیا۔ اسکا چہرہ بیحد اُداس ہو گیا۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

آخر مجھے بہت دنوں انتظار نہ کرنا پڑا۔ بوڑھے جنرل کو موت نے اپنے آغوش میں سمیٹ لیا۔ اب میرے پاس دولت کی فراوانی بھی تھی اور آزادی بھی۔ مجھ کو اپنا مستقبل درخشندہ نظر آرہا تھا۔ ہر طرف مسرت و انبساط کا دَور دَورہ تھا۔ لیکن سنو تو والڈیمیر! شاید تم میری طویل داستان سے اُکتا گئے ہو۔ . . . . واقعات اب قریب الختم ہیں۔ اب وقت قریب آپہونچا تھا کہ میں خود کو اپنے پیارے کے آغوش کی سپرد کر دوں۔ اس کی رفیق زندگی بن کر اُس کے دُکھ درد میں اسکا ہاتھ بٹاؤں۔ ہم دونوں بحر محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہتے تھے۔ لیکن آہ میرے یہ خواب آسا خیالات سراب کی طرح فریب نظر ثابت ہوئے یہ تمام باتیں کس قدر قابل نفریں اور بے سرو پا ہیں۔ والڈیمیر! فی الحقیقت میں بڑی بدقسمت اور غمزدہ ہوں۔ میری کشتئ حیات ساحل مقصود کے قریب پہونچ چکی تھی . . . کہ ایک اور خونخوار موج حائل راہ ہوگئی۔ مجھے پھر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ خوشی یہاں بھی نہیں . . . . . دور اُفتادہ اُفق کے پار اور اُس سے بھی دور، اُف کتنا عذاب ہے:

لیکن اب . . . . اب تمہاری راہ میں کونسی رکاوٹ پیدا ہوگئی؟ . . . . والڈیمر نے سراسیمہ ہوکر سوال کیا، مجھے تو بتاؤ وہ کون ہے؟

ایک . . . . دوسرا بوڑھا جنرل . . . . . . عورت کی آواز میں کسی شکستہ ساز کے نغموں کی طرح بے ربطی تھی۔ اُس کی شفاف پیشانی پر پسینہ کے قطرے اُبھر آئے اُس نے پنکھے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ والڈیمر کے چہرے پر غم و غصے کے اثرات ہویدا ہوگئے۔ وہ پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر ایک فلسفی کی طرح پھر گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔

گاڑی اب بھی اُسی رفتار سے دوڑ رہی تھی ہر سو دہی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ انجن کی سیٹی یا چھک چھک . . . . . دور مغرب کے احمریں سمندروں میں آفتاب میدان جنگ کے ایک زخمی سپاہی کی طرح خون میں نہایا کھڑا تھا۔ مشرق کی پہاڑیوں پر شام کی سیاہیاں پھیل چکی تھیں اور درختوں کے وسیع خواب افروز سائے کائنات کے سینے پر لرز رہے تھے۔

داستانِ ماضی

رومانِ شباب میں ڈوبی ہوئی نظم

جناب سید جمیل راز مظفر نگر

مجھے ماضی کی وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں

فضا جب نیند کی آغوش میں مدہوش ہوتی تھی
تسلط اپنا خاموشی جما لیتی تھی صحرا پر
بساطِ کہکشاں بھی جس گھڑی خاموش ہوتی تھی
بچھا دیتا تھا چادر نور کی جب چاند دنیا پر
مجھے ماضی کی وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں

تمہارا بن کے ساقی وہ مئے اُلفت پلا دینا
نگاہوں ہی نگاہوں میں محبت کے اشارے وہ
وہ میرا تار ہائے سازِ الفت کا جگا دینا
وہ رنگین رات، روشن چاند، شرمیلے ستارے وہ
مجھے ماضی کی وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں

سکوتِ شب میں ساحل پر ہماری وہ ملاقاتیں
بجا کر پریم کی بنسی پریمی گیت گاتے تھے
سُرور و کیف سے لبریز تھیں وہ پیار کی باتیں
کہانی شوق کی خوابیدہ عالم کو سناتے تھے
مجھے ماضی کی وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں

محبت ہی محبت میں کبھی تکرار کا عالم
تمہارا روٹھ کر مجھ سے مکمل ناز ہو جانا
ہجومِ درد سے وہ چشمِ گوہربار کا عالم
تبسم سے تمہارا پھر نیا انداز ہو جانا
مجھے ماضی کی وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں

اُسی ساحل پہ تھا آباد اک چھوٹا سا میخانہ
وہ میخانہ ہماری بیقرارِ الفت کا گہوارہ
محبت ہی کا ساغر تھا محبت ہی کا پیمانہ
محبت جامِ شیریں تھی، محبت آتشِ صہبا
مجھے ماضی کی وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں

ہمارا شوق بے پایاں ترقی پر تھا روز افزوں
نہ تھیں معلوم مستقبل کی یہ تاریکیاں مجھ کو
غمِ دنیا سے جب ناآشنا تھا یہ دلِ محزوں
بدل جاتی ہے قسمت بھی خبر تھی یہ کہاں مجھ کو
مجھے ماضی کی وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں

موجودہ جنگ کا سب سے زیادہ عجیب و غریب سب سے زیادہ ہوشربا اور پُراسرار محاذ

> ا... ریڈیو ہی کسی قوم کو فتح کرنے کے لئے اژدر دہان توپوں اور بمبار طیاروں سے زیادہ خطرناک ہے ——— یہی وجہ ہے کہ آج برلن، روما اور لندن کے ریڈیو ۲۴ گھنٹے متواتر ۴۳ زبانوں میں اپنے سینکڑوں نشریاتی مرکزوں سے اپنے اپنے حریفوں کے خلاف پروپاگنڈا کر رہے ہیں۔ تفصیلات ذیل میں ملاحظہ ہوں ———

امریکہ کے ایک مشہور ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ نے سال گذشتہ اپنی جون ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں ریڈیو کی جنگ کا ایک دلچسپ مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ جسے معاصر عزیز "جہان آزاد" فارسی کے تشکریہ کے ساتھ قارئین مسافر کی معلومات کیلئے بصورت ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہم اس مقالہ کے لئے اپنے مخلص دوست انور تمنا سہارنپوری کے ممنون ہیں ——— رئیس

جرمنی، انگلستان اور فرانس دن رات ۴۳ زبانوں میں سینکڑوں نشریاتی مرکزوں سے اپنے حریفوں کے خلاف شدیدترین پروپاگنڈا کر رہے ہیں اور دنیا بھر کی رائے عامہ کو اپنے موافق بنانے، حریف ممالک میں پھوٹ ڈالنے اور اپنے مقاصد کے لئے بین الاقوامی مقبولیت و ہردلعزیزی حاصل کرنے کیلئے ایتھر (ریڈیو) کی جنگ میں مصروف ہیں۔ غیر جانبدار اور جانبدار ممالک کی دلچسپی اور گہری توجہ حاصل کرنے کے لئے ریڈیو کی برقی لہروں کی زبانیں کبھی ظرافت آمیز نکتہ چینی کرتی ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کا مذاق اڑاتی ہیں، کبھی گالیاں دیتی ہیں اور کبھی دوستانہ پیرایہ میں ایک دوسرے کو مشورے دئے جاتے ہیں۔ یہ لڑائی یورپ میں پوری شدت اختیار کر چکی ہے۔ ابھی امریکہ میں ریڈیائی جنگ نے وہ صورت اور اہمیت حاصل نہیں کی۔ نازی جرمنی ریڈیو اسٹیشنوں کے ذریعہ برطانیہ کے خلاف پروپاگنڈے کی انتہائی طاقتیں صرف کر رہے ہیں۔ اور انگریزوں کے خلاف وہ وہ باتیں کہی جاتی ہیں جن سے تھوڑی دیر کے لئے دنیا بھر میں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ نازی ریڈیو سے برطانوی مدبرین کا کس طرح خاکہ

پیش نظر "راشن کارڈ" کا سسٹم شروع کیا تو لارڈ ہاہا نے انگریز عوام کو اس قانون کے خلاف خوب اُبھارا اُس نے کہا کہ :-

چرچل نے راشن (خوراک وغیرہ) کی تقسیم اور نگہداشت کا جو سسٹم شروع کیا ہے اس کا مقصد اپنی جیبیں بھرنا ہے۔

انگریز عورتوں کو اس طرح مخاطب کیا کہ :-

بہنو! حکومت کو کیا حق ہے کہ وہ تمہیں تمہارے شوہروں سے جدا رکھے۔ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے شوہر تم سے بچھڑ کر کن حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں....

برطانوی مزدوروں سے لارڈ ہاہا ہمیشہ اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ :-

"برطانوی مزدور بھی ہمارے بھائی ہیں۔ فیوہرر (ہٹلر) جانتے ہیں کہ یہ لڑائی انگریز سرمایہ داروں نے ان پر تھوپی ہے۔ ہمیں برطانوی مزدوروں کی تکالیف سے ہمدردی ہے"۔ لارڈ ہاہا کا اصلی نام ولیم جوئس ہے اور یہ لندن کا باشندہ ہے۔ ولیم سیاسی عقائد کے اعتبار سے پکا نازی ہے۔ اور جلا وطن ہو کر برلن میں مقیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نازیوں کے پروپاگنڈا اسٹاف میں اس سے زیادہ چلتا پُرزہ کوئی نہیں —— برلن ریڈیو کے دوسرے انگریز اعلانچی "سردان بلی اسٹوارٹ" ہیں۔ جو فوجی راز بیچنے کے سلسلہ میں لندن سے بھاگ کر برلن چلے آئے تھے اور اب روزانہ اپنی قوم کے خلاف زہریلا پروپاگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔

برلن ریڈیو کا پروپاگنڈا اسٹاف کبھی تو یہ بیان کرتا ہے کہ انگریزوں کی معاشی ناکہ بندی سے جرمن عوام کو سامانِ غذا وغیرہ کی کوئی تکلیف نہیں اور کبھی یہ حماقت کی جاتی ہے کہ مائکروفون سے کسی غریب عورت یا مزدور کی تقریر براڈکاسٹ کرائی جاتی ہے اور دنیا کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ برطانیہ کی اقتصادی ناکہ بندی کس قدر غیر انسانی اور وحشیانہ ہے.... ایک دوسرے موقعہ پر برلن ریڈیو نے برطانوی عوام کو خوفزدہ کرنے اور یہ جتانے کے لئے کہ انگلستان کے صنعتی رقبوں کے متعلق کتنی سچی اور ناقابل تردید معلومات نازی حلقوں کو حاصل ہیں انگلستان کے کارخانوں کی جزوی سے جزوی تفصیل براڈکاسٹ کی اور اعلان کیا کہ ان پر شدید بمباری کی جائے گی۔

نازی نشریاتی مرکزوں کا فرانسیسی اعلانچی "پال فرڈ نینڈ" جسے فرانس والے غدار وطن کہہ کر پکارتے ہیں زوال فرانس سے قبل ہر روز یہ کہتا تھا کہ

"جب تک ایک بھی فرانسیسی سپاہی باقی ہے انگریز لڑے جائیگا"

پھر فرانسیسی عورتوں کو مخاطب کر کے دریافت کرتا تھا کہ :-

میری فرانسیسی بہنو! تمہارے مرد کہاں ہیں پھر خود بخود جواب دیتا تھا.... کہاں ہوتے انگریز سرمایہ داروں کے لئے جانیں دے رہے ہیں۔

جرمنی میں غیر ملکی ریڈیو سننے کی سخت ممانعت ہے اگر کوئی شخص خارجی نشریات سنتا ہوا پکڑا جائے تو اس کے لئے سخت ترین سزا مقرر ہے۔ مگر اتنی سختی اور نگرانی کے باوجود ہزاروں، لاکھوں جرمن چھپ کر بی۔بی۔سی اور امریکہ کے براڈکاسٹ سنتے ہیں اور خفیہ خفیہ سب میں پھیلا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص دوسرے شخص سے پوچھتا ہے

کہو بھائی! رات کیا خواب میں دیکھا۔؟

دوسرا جواب دیگا۔ عجب خواب دیکھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ "آرک رویل" (جس کے متعلق برلن ریڈیو نے ڈبو دینے کا دعوے کیا تھا) غرق نہیں ہوا۔

اب دوسرا شخص کہیگا۔ عجیب بات ہے کہ میں نے بھی یہی خواب میں دیکھا۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں نازی پروپاگنڈے کا معلن اور نگراں ایک فاضل امریکن "کالٹن لویس" ہے۔ جو پچھلی لڑائی میں جرمنوں کے خلاف لڑا تھا۔ مگر اب چار سال سے جرمنی میں مقیم ہے۔ یہ ہفتے میں ایک مرتبہ امریکہ کے لئے ایک خاص پروگرام براڈ کاسٹ کرتا ہے وہ اپنے امریکن دوستوں کے نام لے لے کر انھیں مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے۔

پیارے دوست! کاش تم دیکھتے کہ مارشل گورنگ کے طیارے کتنے شاندار اور تیز پرواز ہیں۔ یہ دنیا پر چھا ینگے

میرے عزیز دوست اس وقت تمہارا فرض یہ ہے کہ تم یہ کوشش کرو کہ امریکہ، برطانیہ کی طرف سے فریق جنگ نہ بن جائے۔

بعض وقت برلن کے نشریاتی مرکزوں سے بڑے دلچسپ پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ ہوا باز اپنی زبانوں سے اپنی فضائی مہموں کے حالات سناتے ہیں۔ آبدوزکشتیوں کے کماندار سمندری تماشوں اور بحری عجائبات کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں۔ زیرآب لڑائیوں کے سنسنی خیز حالات بتاتے ہیں۔ ..... جرمنی کے ریڈیو اسٹیشنوں سے جس قدر مقالے، تقاریر، مضامین، خبریں اور علمی سلسلے نشر ہوتے ہیں، پوٹسڈم یونیورسٹی کے طالب علم نامہ نگاروں کے مرتبہ ہوتے ہیں اور انکی ترتیب وتدوین میں عوام کے مذاق اور انکی نفسیات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ریڈیو کی اسقدر شدید جنگ کے باوجود دونوں طرف سے کسی کے ریڈیو مرکز کو جام کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور اس لڑائی کا سب سے زیادہ عجیب وغریب پہلو یہی ہے۔

ستارے

(انگریز شاعر جیمز ٹاسر کی دلکش نظم کا ترجمہ)

(محترمہ مادرمنیہ سلطانہ پروین)

اے جگمگاتے ہوئے ستارے!

تجھے دیکھکر میں حیرت میں ڈوب گیا ہوں۔ یہ تیرا حسن وجمال! اے پیارے ستارے

تو ہم سے دور، ہماری دنیا سے دور! آسماں کی نیلگوں وسعتوں میں چمک رہا ہے..... اے معصوم ستارے۔

الماس کی طرح.... شاہانہ الماس کی طرح تیری درخشانی نظر فریب ہے۔

جب شاہ خاور دن بھر کی مسافت طے کر کے گوشۂ مغرب میں چھپ جاتا ہے تو اُسوقت اے درخشاں آسمانی موتی تو اپنی آب

تاب دکھاتا ہے اور تمام رات جھلمل جھلمل کرتا رہتا ہے۔

اندھیری راتوں میں مسافر تیری روشنی سے راستہ پاتے ہیں۔

تو میرے دل میں بسا ہوا ہے..... اے نجم سحری.. اے کوکب شب تاب! تو ہر وقت میری نگاہوں میں بسا ہوا ہے اور میرے دل میں جلوہ فگن ہے گو کہ تو..... دور، بہت دور ہے پھر بھی تیرا جلوہ دل کے قریب ہے۔ جب سبزہ پر شبنم کے موتی چمکتے ہیں اُسوقت آسمان پر تو جلوہ آرا ہوتا ہے۔

اے چمکیلے تارے! میری تمنا ہے، کاش تو دن میں بھی چمکتا رہتا.... اے پیارے دوست!

یوگوسلاویہ کا خوبصورت پایۂ تخت بلغراد جو اب ایک ویرانہ بن چکا ہے

۶؍ اپریل کی صبح کو پانچسو نازی بمبار طیارے "بلغراد" کے آسمان پر نمودار ہوئے اور ایک ایک ہزار پونڈ وزنی بم زمین پر برسنے لگے . . . . بازار اُڑ گئے، عمارتیں پاش پاش ہو گئیں . . . . محلے ویران ہو گئے ۔ دور دور تک آسمان سے موت اور ہلاکت برستی رہی . . . تیسرے روز بلغراد ختم ہو چکا تھا . . . . البتہ . . . شہر کے مختلف ویرانوں میں مجروحین و مقتولین کی ۲۴ ہزار نعشیں پڑی تھیں . . . . آہ بلغراد . . . . ! مشرقی یورپ کا سفید شہر

بلغراد کو مشرقی یورپ کا سفید شہر کہا جاتا تھا ۔ اور وہ واقعی سفید شہر تھا بھی ۔ اُس کے مرمریں در و دیوار، اس کی بلور نما سڑکیں، اُس کی الماسی حدود ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شہر آفتاب کے بطن سے پیدا ہوا ہے یا کسی عظیم ترین سمندری جھیل نے بلغراد کو اپنے بطن سے اُگلا ہے ۔ اور یہ شہر شفاف موتی کی طرح جھلملاتا ہوا سطح ارض پر نمودار ہو گیا ہے ۔ بلغراد کی شفاف فضائیں، بلغراد کا نکھرا ہوا آسمان، بلغراد کی چمکتی ہوئی سرزمین . . . . الغرض بلغراد حسن و رعنائی کا چمکتا ہوا ستارہ تھا ۔ وہ یوگوسلاویہ کی حسین اور صبیح آبادی کا مرکز تھا ۔ بیک نظر یہ محسوس ہوتا تھا کہ بلغراد کسی شاعر کا درخشاں خواب یا کسی مصور کا پاکیزہ تصور ہے ۔ وہ ہر قسم کی آلودگی اور آلائش سے پاک و صاف تھا ۔ مگر ۶ ۔ اپریل کی صبح ایک منحوس صبح تھی ۔ جب ہٹلر کے طوفانی دستوں نے یوگوسلاویہ کے خلاف اعلان جنگ کیا اور صرف دو روز میں مشرقی یورپ کا یہ حسین شہر . . . . تباہ شدہ مکانوں جلے ہوئے کھنڈروں اور بھیانک ویرانوں کا ایک مجموعہ بن گیا ۔ یقیناً بلغراد کی تباہی موجودہ عالمگیر جنگ کی غارتگریوں اور تباہ کاریوں کا ایک غمناک باب ہے ۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را!

ذیل میں ایک انگریز سیاح (MR GERTRUDE NORRAY) مسٹر جرٹروڈ مرے کے اُن تاثرات کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے ۔ جو موصوف نے بلغراد کی سیاحت کے بعد اپنے سیاحت نامہ میں ظاہر کئے ہیں ۔ مسٹر مرے نے بلغراد کی تباہی

سے چند روز پہلے اِس جنت ارضی کی سیاحت کی تھی۔ اِس لئے ہم اُن کے بیانات میں اِس چمن پُر بہار کی رعنائیوں اور رونقوں کی آخری تصویر دیکھ سکتے ہیں اور چشم تماشا کے لئے یہی منظر عبرت کافی ہے۔ ذیل کا مضمون ہمارے عزیز ترین دوست سید مسعود حسن صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ امید ہے کہ قارئین مسافر عبرت انگیز دلچسپی کے ساتھ اسکا مطالعہ کریں گے۔

(رئیس)

میں بھی دنیا کے اُن خوش قسمت انسانوں میں سے ہوں جنھوں نے بلغراد کو اُس عالم شباب میں دیکھا جبکہ بدخواہوں کی نظر اس کو لگ چکی تھی۔ میں نے جب بلغراد کی سیاحت کی تو وہ اپنی جوانی اور رعنائی کی انتہا کو پہونچ چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اِس جنگ میں راٹرڈم، لندن، ایتھنز اور برلن کو بھی بیشمار نقصانات پہونچے ہیں مگر بلغراد کی تباہی جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ وہ قرطاجنہ کے پایۂ تخت کی طرح اپنی تمام عمرانی خصوصیات ضائع کر چکا ہے۔ . . . ہاں بلغراد اب ایک ویرانہ ہے۔ ہولناک ویرانہ۔ اگرچہ نازی حملہ آوروں کے خلاف اسے ایک غیر مدافعتی شہر قرار دیدیا گیا تھا۔ مگر یہ تدبیر بعد از وقت تھی، کیونکہ مارشل گوئرنگ کے ہوا باز بلغراد کی تباہی پر مہر تصدیق ثبت کر چکے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بلغراد کی تباہی اور ویرانی نے یورپ کو ایک خوبصورت شہر سے محروم کر دیا۔ وہ مختلف قوموں کا مرکز تھا۔ وہ تاریخی تہذیبوں کا گہوارہ تھا وہ رنگا رنگ لباسوں اور فیشنوں کی نمائش گاہ تھا۔ میں نے لندن کو بھی اُس کے عالم شباب میں دیکھا ہے اور پیرس کی بھی زمانۂ امن وامان میں سیاحت کی ہے مگر بلغراد . . . . بلغراد پھر بلغراد تھا۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اگر آپ چند لمحے بھی بلغراد کے کسی وسطی مقام پر ٹھہر کر ہو کر ایک نظر ڈالتے تو آپ حیرت زدہ رہ جاتے۔ نقاب پوش مسلم خواتین، بڑی بڑی مونچھوں والے خوفناک لبانی پیرس کے جدید ترین فیشنوں میں ملبوس سرب دوشیزہ کردٹ نسل کی حسین عورتیں، سواستکا کا نشان لگائے مغرور جرمن، کچھ روسی، کچھ یونانی، کچھ اطالوی، کہیں کہیں برطانوی باشندے . . . . غرض پوری دنیا بلغراد میں سمٹ آئی تھی۔ . . . . اس کے علاوہ سڑک کی پٹریوں پر تندرست خانہ بدوش عورتیں کانسی اور شیشہ کے زیورات پہنے، بھدّے آویزے کانوں میں لٹکائے اِدھر سے اُدھر چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ کسی طرف سربین کسان بھاری بھرکم بوٹ پہنے عجب شانِ بے نیازی سے اپنے دار السلطنت میں محو خرام نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی سرخ وسیاہ ترکی وروسی ٹوپیاں اس ہجوم میں جھلکتی نظر آجاتی تھیں۔

تفریح گاہیں

بلغراد کے مختلف النوع باشندوں کی مناسبت کے لحاظ سے وہاں کی تفریحات کا احاطہ بھی کافی وسیع تھا وہاں کے طعام خانے، میکدے، نائٹ کلب ریستورانٹ کیفے وغیرہ اِس قسم کے روح پرور مناظر پیش کرتے تھے کہ انسانی روح وجد میں آجاتی تھی۔ اگر ایک جگہ ماہر فن رقاصائیں اپنے نیم عریاں جسموں کی نمائش کرتی نظر آتیں تو دوسری طرف روسی نوجوان سائبیریا کے پہلے

نغمے گاتے مسرور نظر آتے اور پھر منہ سے سگار ڈبائے نیلگوں دھوئیں کے بادلوں کو چیرتے ایسے کمروں میں شاداں نظر آتے جہاں نرم و دبیز قالینوں کا فرش ہوتا۔ اور کرسیوں کے بجائے شراب کے پیپے اِدھر اُدھر رکھے ہوتے۔ یہاں انگوری شرابوں کا دور جاری رہتا۔ اور خنجر آزمائی کے کمالات کا بار بار مظاہرہ کیا جاتا۔ اس دوران میں سربیا کے رواج کے مطابق ایک آدھ شیشہ کے گلاس کے ٹوٹنے کی جھنکار گونج اُٹھتی۔ جو مسرت و شادمانی کی علامت ہوتی۔ بعض وقت قہوہ خانوں میں اس قسم کے راگ گائے جاتے کہ پہلی مرتبہ یہ خیال ہوتا کہ بہادروں کے کارنامے اور مہیب قتل و غارت کے گیت گائے جا رہے ہیں مگر پھر معلوم ہوتا کہ وہ بھی کسی کافر ادا محبوبہ کی تعریف میں کوئی دلکش رومانی نظم ہے۔

نت نئی نیرنگیاں

بلغراد نت نئی نیرنگیوں کا مجموعہ تھا۔ ایک طرف موسم گرما کی آتشبار فضائیں وہاں کے باشندوں کو جھلسا دیتیں تو دوسری طرف موسم سرما کی بلاخیز خنکی اور برفباری رگوں کا خون تک جما دیتی۔ ایک طرف پرانی وضع کے بھدّے اور بد وضع مکانات تھے تو دوسری طرف جدید جدید طرز کی عمدہ اور دیدہ زیب عمارات تھیں۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے ریستورانوں میں لوگ ترکی مٹھائیاں اور اعلیٰ درجہ کی شرابیں کھا پی کر موجیں کرتے نظر آتے تو کہیں پیرس اور لندن کی وضع کے کیفے دھوم دھام بجلی کی روشنیوں میں دعوتِ نظارہ دیتے نظر آتے۔

الغرض بلغراد انتہا پسندی کا مجموعہ تھا۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی انتہا پسندی کا ثبوت دیتا۔ بلغراد والے سیاسیات میں بھی انتہا پسندانہ رجحانات رکھتے تھے۔

غم آلود شام

مجھے ۵ راپریل کی وہ غم آلود شام ہمیشہ یاد رہے گی جب میں نے بلغراد کو جرمن حملہ کے خوف سے سہما ہوا پایا۔ چاروں طرف طیارہ شکن توپیں نصب کی جا رہی تھیں۔ دفاعی انتظامات پوری تیزی کے ساتھ کئے جا رہے تھے۔ مگر اِن تمام ہولناک حالات کے باوجود کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ بلغراد کی زندگی کی آخری شام ہے

. . . . تیسرے روز میں نے بلغراد کے ویرانوں میں بھاری قدموں کے ساتھ ایک مختصر گشت کی اور بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بلغراد کی رُوح

آپ یقین کریں کہ ان ویرانوں میں میں نے بلغراد کی زخمی رُوح کو دیکھا وہ ایک غمزدہ بوڑھی عورت تھی جو ایک کھنڈر میں دیوانوں کی طرح چاروں طرف پھر رہی تھی غالباً وہ کروٹ نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اور اُس نے مجھے۔ چند لمحے تک ہم ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ معلوم نہیں پھر اُسے کیا خیال آیا کہ ایک شکستہ دیوار کی اوٹ میں چھپ گئی . . . . میں سمجھ گیا کہ اس کھنڈر میں یہ کچھ تلاش کر رہی ہے . . . . کیا معلوم اپنے نوجوان بیٹوں کی لاشیں ڈھونڈ رہی ہو۔ اسکے کپڑے بوسیدہ اور خون آلود تھے۔ اُس وقت مجھے بیساختہ یاد آیا:۔

پردہ داری میکند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب
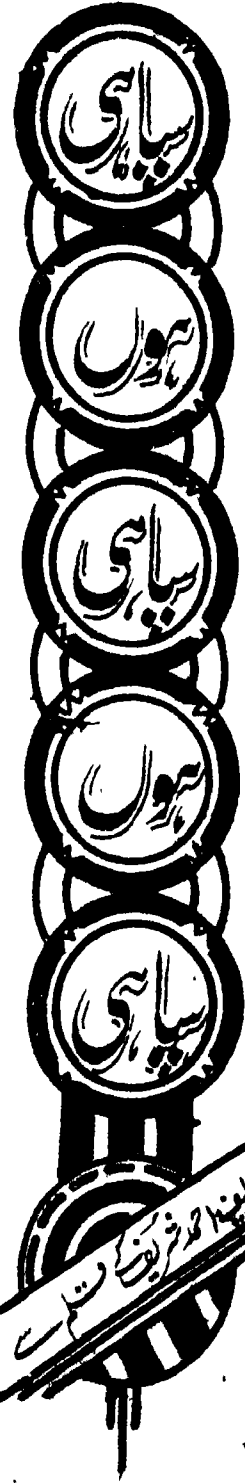
مری فطرت میں شانِ کج کلاہی ————
مرے تیور سے ظاہر شانِ شاہی ————
~~~~ قیامت ہے مری شعلہ نگاہی
~~~~ سپاہی ہوں سپاہی ہوں سپاہی

مرے انداز میں رقصاں جوانی ————
مرے لب پر پیامِ کامرانی ————
~~~~ میں خود عزمِ مکمل کی گواہی
~~~~ سپاہی ہوں سپاہی ہوں سپاہی

مرے بازو میں کہسار و نجی تمکیں ————
مری رگ رگ میں ہے پروازِ شاہیں ————
~~~~ مری فطرت نسیمِ صبح گاہی
~~~~ سپاہی ہوں سپاہی ہوں سپاہی

بگولہ بن کے اُٹھتا ہوں زمیں سے ————
خجل ہے بندگی میری جبیں سے ————
~~~~ مرے تیور میں قہرِ بادشاہی
~~~~ سپاہی ہوں سپاہی ہوں سپاہی

نفسیاتِ محبت و شباب کا افسانوی پیرائے میں عکسِ لطیف

ممتاز کی نگاہوں میں وہ زمانہ پھر گیا، جب صبیحہ عروسِ نو بنکر اُس کی آغوش شباب میں آئی تھی۔ وہ نکہتِ جوانی سے مہکتا ہوا زمانہ .... اور وہ نورِ جمال سے نکھرا ہوا ماحول... وہ صبیحہ جو اُس کے خوابوں کی ملکہ اور تصورات کی دیوی تھی... جس کی وہ دل و جان سے پرستش کرتا تھا۔ مگر آہ .... آج .... وہی .... صبیحہ ——

سنتے ہیں آپ ! میں کہتی ہوں، میں وہاں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی جھک مارتی رہتی ہوں۔ اور آپ ہمیشہ اِن ہی دماغ سوز کاموں میں کھوئے رہتے ہیں۔ مضمون نگاری، نظم گوئی، غزل وغیرہ وغیرہ۔ اغضب خدا کا۔ .... میں تو عاجز آگئی ہوں، میرا جی اجیرن ہوگیا ہے۔ بیجئے صاحب غیروں کے جذبات تو آپ کے تخیل میں آئیں اور آپ انھیں صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیں۔ .... لیکن خود اپنی شریک زندگی، اپنی رفیقۂ حیات کے لئے بھولے سے بھی یہ خیال نہ ہو کہ خود اس کے بھی کچھ جذبات ہیں یا نہیں؟ صبیحہ نے مندرجہ بالا باتوں کو اپنے خاوند کے کمرے میں داخل ہوکر کہا.... اُس کی آواز سے کرختگی اور غصہ کی جھلک نمایاں تھی۔

ممتاز ایک ادیب تھا اور ادیب بھی کیسا، ایک مشہور ادیب، ایک ماہر ادیب۔ دنیائے ادب اِسکی نگارش کا لوہا مانتی تھی۔ اس کے مضامین بڑے ٹھوس ہوتے تھے۔ زبان میں اس قدر لطافت ہوتی تھی کہ ہر پڑھنے والے کی زبان سے واہ، واہ، سبحان اللہ بیساختہ نکل جاتا۔ وہ اس وقت کچھ... لکھ رہا تھا لیکن صبیحہ کی بے موقع تقریر نے اُس کے قلم کو روک دیا وہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کہا سنو تو صبیحہ! میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ دنیائے ادب میں نام پیدا کروں اور تمہاری ضروریات کے لئے روپیوں کا ڈھیر لگادوں۔ لیکن تم ہو کہ عقل کے پیچھے لاٹھی لے کر دوڑتی ہو، آخر اتنی دماغ سوزی، اتنی کاوش کس کے لئے کرتا ہوں، تمہارے ہی لئے تو؟

جی، بجا ارشاد ہوا۔ کیوں نہیں یہ سب کچھ میرے ہی لئے تو ہوتا ہے۔ آپ نے کہا اور میں نے مان لیا۔ رہنے بھی دیجئے۔ صبیحہ۔ آپ ان چکنی چپڑی باتوں میں آنے والی نہیں۔ آج وہ فیصلہ کے لئے آئی ہے اور فیصلہ کرکے ہی واپس جائے گی۔

یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے صبیحہ، کیسا فیصلہ اور کس کا فیصلہ چاہتی ہو۔

یہی کہ یا تو آپ میرے جذبات کو سمجھیں اور غیر دلچسپ زندگی کو دلچسپ بنانے کا کوئی ذریعہ نکالیں ورنہ مجھے میرے میکے پہونچا دیں۔ میں اس خشک زندگی سے بالکل اُکتا گئی ہوں۔ مجھ میں اب ضبط کا یارا نہیں ہے۔

امّی! امّی! دیکھو زکی بھیا میری بلی چھینے لے رہے ہیں۔ . . . اوں . . . اوں . . . دیکھو . . . دیکھو چھین لیا . . . آں . . . اوں . . . آں . . . امّی . .
. . . اوں . . . اوں . . . . . آئی میری بچی روؤ نہیں کیوں زکی! کیوں رضیہ کو رُلا رہے ہو . . . . . اچھے بیٹے وہ ابھی بچہ ہے اور تم تو ماشاء اللہ سمجھدار ہو چلے ہو۔ نہیں امّی یہ بات نہیں ہے۔ انھوں نے کل اپنی بلی تو توڑ ڈالی اور اب میری بلی پر قبضہ جمانا چاہتی ہیں ڈھٹائی تو اُن کی دیکھئے۔

صبیحہ کے جانے کے بعد دبے پاؤں ممتاز بھی بچوں والے کمرے میں آگیا تھا۔ اور جبکہ ماں بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی وہ ایک طرف کھڑا ہوا ہنس رہا تھا۔ بچوں کو پچکارنے اور دلاسا دینے کے بعد صبیحہ جب دوبارہ اپنے خاوند کے کمرے میں پلٹی تو اُس نے دیکھا کہ ممتاز اُسی کے کمرے میں کھڑا ہوا ہنس رہا ہے۔ اُس نے برہمی سے تیوری چڑھائی اور کہا۔

"یہ آخر آپ بلا وجہ ہنس کیوں رہے ہیں؟"

وہ بولا "کچھ نہیں صبیحہ! یونہی ذرا ہنسی آگئی۔

آپ ایسے ہنسوڑے تو نہیں۔ صبیحہ نے طعن سے کہا ضرور آپ مجھ ہی پر ہنس رہے ہیں۔ ... کیوں ہے نا یہی بات؟

نہیں صبیحہ! یہ بات نہیں ہے مجھے تمہاری ان باتوں پر ہنسی آرہی ہے جو ابھی تم نے کہی ہیں اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ عورتیں بڑی کوتاہ عقل ہوتی ہیں۔

"میں عورتوں کے بارے میں آپ کی اس رائے کے خلاف ہوں۔ صبیحہ نے بیٹھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ اور ہاں کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یوں الگ الگ رہا کریں۔

نہیں، ہرگز نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں بالکل تم سے متفق ہوں۔ وہ آگے بڑھا۔ اپنا ہاتھ اپنی بیوی کے نازک کندھے پر رکھا اور کہا ... مگر صبیحہ جیسا تم سمجھتی ہو وہ بات نہیں ہے۔ میں تمہاری طرف سے بے فکر نہیں ہوں "کیا خاک آپ فکر کرتے ہیں" یہ کہتی ہوئی صبیحہ دریچے کی طرف گئی اور غصہ میں وہاں کھڑی ہو کر دریچے سے باہر کی طرف یوں ہی دیکھتی رہی۔ اگرچہ دراصل وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں رہی تھی۔

کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں سب کام چھوڑ کر صرف تمہارا دل ہی بہلایا کروں۔

"میں یہ کب کہتی ہوں ... صبیحہ نے جھلا کر کہا

ممتاز نے تیزی سے کمرے کے فاصلہ کو طے کیا اور بڑھ کر کسی حد تک نرمی سے اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

صبیحہ سوچو تو، اگر میں یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھوں تو آخر پیٹ کا دھندا کیسے چلیگا؟ یہ ضرور ہے کہ خدا کے فضل سے کسی بات کی کمی نہیں ہے پھر بھی انسان ہو کر کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا چاہئے۔ ذکی نویں سال میں ہے میں ہر چند چاہتا ہوں کہ اُسے تعلیم دے کر کم از کم ایسا کروں کہ وہ میری مدد ہی کر سکے۔ لیکن تم یہ بھی نہیں چاہتیں لاڈ پیار میں اُسے بھی خراب کر رہی ہو۔

کرتے دھرتے تو آپ کچھ بھی نہیں۔ اور یہ آپ کا قاعدہ ہے کہ آپ خطا ہمیشہ مجھ کم نصیب کی بتایا کرتے ہیں آپ کو مجھ سے نفرت ہے اور یہ بات بھی آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ میں کبھی خوش رہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ... میں آپ کو بالکل چھوڑ کر کہیں کو نکل گئی ہوتی۔ اور یہاں سے جا کر اپنی ماں کے پاس رہتی ... کیا یہی بات ہے نا؟

بس جی بس! میرا تو آپ سے جی جلا ہوا ہے۔ صبیحہ نے چلا کر کہا۔ میں تو اب یہ چاہتی ہوں کہ یہاں سے کہیں چلی جاؤں۔ آخر رزاق تو خدا ہے۔ کوئی نہ کوئی صورت تو نکل ہی آئے گی۔ میں تو کب کی سب کچھ کر گذرتی اگر بچوں کا پاس نہ ہوتا۔ اور میں ... میں تو آج ہی چلی جاؤنگی۔ ... لے بس میں تو اب جا کر سوتی ہوں۔ یہ کہتے ہی وہ گویا کود کر کمرے سے نکل گئی اور اپنے پیچھے زور سے کواڑ بند کرتی گئی۔

ممتاز وہاں سے اپنے کمرے میں آکر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے افسانوں کے مسودات کو ایک طرف رکھ کر بجھی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ اُمید اور مسرت کی کیسی تباہی اور بربادی ہے۔

وہ صبیحہ جو پوری وابستگی سے اُس کی چاہنے والی تھی اور جس میں وہ تمام نسوانی خوبیاں موجود تھیں ... وہ

کتنی سمجھدار — کتنی باسلیقہ، کس قدر مطمئن مکھ اور ہمیشہ ہر حال میں اس کی ہمدرد اور اس کے اشاروں کو سمجھنے والی — اسے اب کیا ہو گیا۔ یکایک اس کی کایا پلٹ گئی۔ . . . پُرکیف چاندنی راتوں اور مسرت و سرشاری کے منقرد دنوں کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا اُس زمانے میں کام کا کسے ہوش تھا۔ دنیا رہے یا جائے۔ ایک پیار کرنے والی عورت سب کا نعم البدل ہے۔ گذری ہوئی ایک ایک بات اُس کی نگاہوں میں پھر گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آئے۔ اُس کا رہا نہ گیا۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور آہستہ آہستہ چل کر صبیحہ کے کمرے کے پاس پہونچا اور آواز دی صبیحہ!

کیا تم دیوانی ہوئی ہو؟

صبیحہ نے دروازہ بے دلی سے کھول دیا اور کہا میں کیوں دیوانی ہونے لگی۔ بالکل تندرست اور باہوش ہوں۔ لیکن اب میں آپ کے پاس نہیں رہ سکتی۔

"میرا تم چاہے کچھ خیال نہ کرو۔ لیکن یہ تو سوچو کہ ان بچوں کو چھوڑ کر جا بھی سکتی ہو۔ کیا سچ مچ تمہارا ارادہ ہے کہ تم اپنے بچوں کو چھوڑ دو گی۔

نہیں، صبیحہ گرج کر بولی مجھے پریشان نہ کیجئے میں شب خوابی کا لباس پہن چکی ہوں۔ مجھے اس وقت سونے دیجئے اور آپ بھی جا کر سو رہیئے۔ اب میں صبح کو سوچونگی کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ جاؤنگی تو میں ضرور ہی۔ رہا بچوں کا سوال۔ ہوگا تو انھیں بھی ساتھ لے جاؤنگی۔

ممتاز کو اپنے کمرے سے نکال کر صبیحہ نے پھر دروازہ بند کر دیا۔ اور اپنے پلنگ پر دراز ہو گئی اور آپ ہی آپ غصے اور اشتعال کی حالت میں باتیں کرنے لگی میں ہی بیوقوف ہوں، میں ہی قصوروار ہوں۔ اب میں اس روز روز کی دانتا کل کل کو برداشت نہیں کر سکتی۔ کچھ دیر تو انھیں خیالات میں وہ اُلجھی رہی۔ اس کے بعد نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ اور وہ سو گئی۔ . . . . نیند کی حالت میں اُس نے ایک خواب دیکھا۔ وہ خواب نہایت خوفناک تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ممتاز بخار کی حالت میں ہاتھ پیر پٹک رہا ہے۔ اور ہذیان بک رہا ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کا سارا جسم پسینہ میں تر اور ہور ہا تھا رات کے ۱۲ بجے تھے۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ زکی اور رضیہ اپنے اپنے پلنگوں پر آرام سے خراٹے لے رہے تھے۔ صبیحہ نے لیمپ کو تیز کیا اور لبادہ اوڑھ کر باہر نکلی ممتاز کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں اور ممتاز اپنے پلنگ پر بے سدھ پڑا ہوا ہے۔ وہ تیزی سے اُس کے پاس پہونچی اور اُس کی صورت دیکھنے لگی۔ جسم پر ہاتھ رکھتے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اس کا خواب غلط نہیں تھا۔ واقعی ممتاز بخار کی گرمی سے بھُن رہا تھا۔ صبیحہ بدحواس ہو گئی۔ اِس سے اگر اس وقت سوال کیا جاتا کہ صبیحہ کیا واقعی تم چلی جاؤ گی تو شاید اس کا جواب یہی ہوتا کہ میں لے جانے کو کہا ہی کب تھا؟ اس کا وہ خیال رفوچکر ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنی بوڑھی دایہ کو جسے وہ اپنے ساتھ گھر سے لائی تھی جگانا ہی مناسب سمجھا۔ وہ باورچی خانہ کی طرف گئی۔ جہاں بوڑھی دایہ سو رہی تھی اور اُس کی ناک سے گھر گھر کی آواز نکل رہی تھی۔ . . . .

دائی اماں . . . . دائی اماں!

کیا ہے بیٹا! اتنی رات کو؟ اِس وقت . . . سب ٹھیک ہے نا، . . . . کوئی بات تو نہیں ہے؟

کہتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ گویا وہ سو نہیں رہی تھی۔

ٹھیک کیا ہے دایہ ماں! جلدی چلو۔ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی ممتاز کے کمرے میں پہونچیں۔

صبیحہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

یہ دیکھو انھیں کیا ہو گیا اماں؟

بوڑھی دایہ نے ممتاز کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر جلدی سے ہٹا لیا۔ . . . یا خدا کس قدر تیز بخار ہے۔؟

بیٹا! کب سے یہ حالت ہے۔

مجھے تو ابھی علم ہوا اماں۔ اب کیا کرنا چاہئے؟

گھبراؤ نہیں۔ تو تم ہاتھوں کی گدیلی سہلاؤ۔ اور میں پاؤں کے تلوے سہلاتی ہوں۔ ایسا کرنے سے بخار میں ابھی کمی ہو جائے گی۔ اور اس وقت ہو بھی کیا سکتا ہے؟ صبح ہو تو ڈاکٹر و اکٹر بلایا جائے۔

صبیحہ نے بوڑھی دایہ کے کہنے پر عمل کیا۔ ممتاز تو دنیا ما فیہا سے بے خبر تھا۔ اُسے نہیں معلوم کیا ہو گیا تھا۔ . . جوں توں کر کے رات ختم ہوئی

صبح ڈاکٹر آیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی دیر میں آیا ہے۔ ممتاز کا معاینہ کیا۔ پھر صبیحہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "نمونیہ ہے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن . . بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اچھے ہو جائیں گے"

دوا لکھی، فیس لی، چند ضروری ہدایات اور ہمدردانہ الفاظ کہنے کے بعد ڈاکٹر رخصت ہو گیا

دوسرے دن ممتاز کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ اور غیر معمولی تعجیل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا کہ علاج بدل دیا جائے۔ کیونکہ حالت دم بدم بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ آج سول سرجن بلائے گئے۔ بارے اُنھوں نے جو دوا دی اُس نے تریاق کا کام کیا۔ ممتاز کو افاقہ ہونے لگا آخر وہ دن بھی خدا خدا کر کے آیا کہ چھڑی کے سہارے وہ دو چار قدم چل پھر لیتے تھے۔

ممتاز اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا ہوا گذشتہ تین ہفتوں کے متعلق سوچنے لگا۔ صبیحہ نے اس کو چھوڑ کر چلے جانے کی احمقانہ دھمکی کا خیال اپنے دماغ سے نکال دیا ہے؟ اب تو اس نے بھی جی میں ٹھان لی تھی کہ اپنی بیوی کو دکھا دے کہ اب وہ ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے سرسری طور پر ایک مسودہ طیار کر لیا تھا۔ وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قول کے مطابق عمل کرنے کو طیار ہے اور جب بھی صبیحہ نے اپنی گفتگو شروع کی وہ فوراً تحریر اُس کے سپرد کر دیگا۔

آہ اس کی حسینہ و جمیلہ پری وش صبیحہ! وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اس کی تصویر کو جو کمرے میں آویزاں تھی ایک وارفتگی کے عالم میں گھورا دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے اتنی سختی کر سکیگا کر سکیگا یا وہ حد سے زیادہ سخت تھا اور ابھی اُسے اور نرم اور ملائم ہونے کی ضرورت تھی۔ وہ اُسے اپنی مسلسل تیمارداری میں فداکارانہ مصروف دیکھ کر پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگا تھا۔ لیکن جھگڑوں کو چکایا کس طرح جائے؟ اُسے . . . . . صبیحہ کی وہ باتیں تیر کی طرح لگی تھیں اور غم نے بالکل نڈھال کر دیا تھا اس ندامت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے بخار ہوا، بخار سے نمونیہ ہو گیا۔ اُس رات کو وہ کتنا بدحواس تھا دروازہ بند کرنا بھی تو بھول گیا تھا۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ابھی یہیں تک پہونچا

تھا کہ صبیحہ آہستگی سے اُس کے کمرے میں داخل ہوئی

صبیحہ، کیا تم ہو، اُس نے بغیر دیکھے ہوئے کہا

ہاں ممتاز میں ہی ہوں۔

[illegible] اُٹھا اور اُس کی نگاہ افسانوں کے مسودات پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے ایک تجویز کی ہے کہ جب تم انگلینڈ میں ہو گی تو میں تمہارے اخراجات کے لئے [illegible] قدر روپیہ دے سکونگا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔۔۔ اور میں۔۔۔ صبیحہ، ہیں یہ کیا، جب اس نے اُس کے چہرے کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہ نہایت پژمردہ اور افسردہ ہو رہا ہے۔ وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے کہا کیا بات ہے صبیحہ تم اتنی اداس کیوں [illegible] اور اس کی آواز سے ندامت سی کی حالت نمایاں ہوئی۔

نہیں ممتاز۔ لیکن میں۔۔۔ میں۔۔۔۔۔

وہ [illegible] باہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھی اور [illegible] کو مضبوطی سے اُس کی گردن میں حائل کر دیا۔

ہائے ممتاز۔۔۔۔۔۔۔ اس نے کہا اور اور سسکیاں لیتی ہوئی اُس کے اور قریب ہو گئی

میری پیاری، میری جان! ممتاز نے آہستہ سے کہا اور [illegible] اُس کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور [illegible] نہیں پوچھا۔ وہ مطمئن تھا کہ ایک فوری [illegible] وہ نہ جانتا تھا اور نہ جاننے [illegible] پروا ہی کرتا تھا کہ صبیحہ میں تغیر کیسے پیدا ہوا۔

ممتاز! میں ہی اب تک [illegible] وحشی بنی رہی۔

اور میں بھی کچھ کم احمق نہ تھا۔

اب تم مجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔

کیا جدا کر دیں گے؟ نادان صبیحہ نے پوچھا۔

تم اپنے دل کی کہو صبیحہ! کیا تم اپنے بچوں کو چھوڑ کر جا سکتی ہو؟

دونوں کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم نمودار ہوا اور دونوں کے ہونٹ قریب تر ہوتے گئے۔۔۔۔۔۔

(ترجمہ)

یقین کیجئے کہ

(۱) ہاتھی کی سونڈ میں کوئی ہڈی نہیں ہوتی۔ اس میں دس ہزار رگیں اور پٹھے ہوتے ہیں۔

(۲) زلزلہ کی رفتار فی لمحہ [illegible] فیٹ سے ۵۰۰ فیٹ تک ہوتی ہے۔

(۳) برطانیہ میں کام کرنے والے لڑکوں کی تعداد میں دس لاکھ سالانہ کی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔

(۴) ماہرین حکمت کا خیال ہے کہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ سال سے دنیا پر حیوانات آباد ہیں۔

(۵) چین میں دو ہزار سال قبل پہلی بار فوجی کتے تعلیم ہوئے تھے

(۶) ترکی باشندہ حسین بے دنیا میں سب سے چھوٹا انسان ہے اسکا قد صرف ۱۸ انچ ہے۔

(۷) دنیا میں ہر منٹ ۲۰ شادیاں ہوتی ہیں اور فی گھنٹہ ۶۰ طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔

(۸) ایک منٹ میں انسانی دل ۷۲ مرتبہ حرکت کرتا [illegible] سینما میں فلم ریل فی منٹ ۱۰۰ فیٹ کی رفتار سے حرکت کرتی

(۹) ہندوستان کی قومی آمدنی سولہ سو کروڑ روپیہ سالانہ ہے یعنی فی کس چار روپیہ ماہانہ۔۔۔۔۔۔

سعید اختر ابن کوکب مراد آبادی

وہ نگری

راز ہاشمی امروہوی

آؤ دیکھیں سکھی وہ نگری

وہ نگری ——

(۱)

جہاں پریم ہی پریم کے ہوں نظارے　　جہاں بستے نہ ہوں جیوں کے ہارے

جہاں ناچ رہے ہوں تارے

جہاں ہر شے میں ہو ایک جادوگری

— ایک جادوگری —

آؤ دیکھیں سکھی وہ نگری

— وہ نگری —

(۲)

جو ہمکو آشا کی مدرا سے مست　——　نہیں بدمست بنادے

جو ہمکو پریت سکھادے

ہوں فضائیں جہاں کی نغموں بھری

— آؤ دیکھیں سکھی وہ نگری —

— وہ نگری —

(۳)

وہ نگری — وہ سندر سپنوں کی بستی، وہ بستی جہاں کلیاں ہوں مہکتی"

—جہاں تازہ ہو بادہ پرستی—

جہاں ناچ رہی ہو—لال پری

لال پری

آؤ دیکھیں سکھی وہ نگری

وُہ نگری

مغل حرم سراؤں کی لطیف رومانی زندگی کے دو دلکش لطیفے

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کے اوراق پر بے شمار ایسے دلکش واقعات بکھرے پڑے ہیں۔ جن کے ہر پہلو میں عہدِ مغلیہ کی لطیف رومانی مزاج اور شاہانہ معاشرت کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان میں سے بہت سے واقعات ایسے ہیں جنھیں ”صدیوں کے گرد و غبار“ نے اپنے اندر چھپا لیا ہے اور وہ زمانے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ . . . مغلیہ شہنشاہیت کے مرمریں ایوانوں اور شاندار محل سراؤں کی لطیف کہانیاں بہت کم ہم تک پہونچی ہیں۔ ہم نے جہانگیر اور شاہجہاں کو فتح میدانِ جنگ میں دیکھا ہے لیکن ایوانِ حسن و جادو اور شبستانِ ناز و شباب میں بھی وہ کچھ کم شاندار اور دلچسپ نظر نہیں آتے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہمارے عزیز دوست تاباںؔ نقوی نے ایک قدیم ماخذ سے جس کی تاریخی حیثیت پر کسی دوسرے وقت روشنی ڈالی جائیگی، مغلیہ حرم کے دو دلکش فسانے قارئین مسافر کے لئے پیش کئے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان دونوں کہانیوں میں مغلیہ تاجدار کا فارق ہے — نورجہاں کا نرم و نازک اور اجودھیا بائی کا وفادار پیار ہمیشہ یادگار رہے گا۔ . . . ——— امید ہے کہ آئندہ بھی یہ پُرلطف تاریخی سلسلہ اوراقِ مسافر پر جاری رہیگا (مدیر)

ایک مرتبہ جبکہ چودھویں رات کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی جہانگیر نے خاص اہتمام سے جشن ماہتاب منایا محرمان خاص لباس فاخرہ میں ملبوس تھے اور لوازمات بزم اور فرش فروش وغیرہ وقت کی مناسبت سے ترتیب دئے گئے تھے۔ نورجہاں بیگم وقت کی دل آویزی کے مطابق زرتار لباس زیب تن کئے ساقی گری کے فرائض انجام دینے میں مشغول تھی اور بذلہ گوئی اور نکتہ سنجی سے بادشاہ کے عیش و نشاط کو دو بالا کر رہی تھی۔ عین اسوقت جب کہ نورجہاں الطاف خسروانہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اُسے خیال آیا کہ اگر اجودھیا بائی محفل کا یہ رنگ دیکھے تو اپنی عادت کے مطابق آتش رشک و حسد سے برافروختہ ہو جائے۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اگر اس شاہانہ جشن اور دل افروز محفل سے اجودھیا بائی بھی لطف اندوز ہو تو بہت مناسب ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ایسے وقت میں جبکہ وقت کا جام شراب عشرت سے لبریز ہے۔ بائی کا بلانا خلاف مصلحت ہے۔ مبادا کہ وہ اپنی حرکات ناملائم سے اس کیف و نشاط میں خلل انداز ہو۔ اور اگر اس نے اس وقت کچھ بھی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر کیا تو ساری مسرت

و شادمانی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

بیگم نے عرض کی نہیں اجودھیا بائی اس قدر نادان نہیں ہے کہ موقعہ اور محل کو نہ پہچانے اُسے حکم دیا جائے کہ وہ بھی شریک بزم ہو کر کیفیت طرب و عیش حاصل کرے۔

آخر کار جہانگیر نے ایک خواص کو حکم دیا کہ بائی کو بلایا جائے۔ حکم ملتے ہی بائی بآراستگی تمام سُرخ لباس زیب تن کئے بادشاہ کی خدمت میں روانہ ہوئی جوں ہی نور جہاں نے بائی کو سُرخ لباس میں ملبوس آتے ہوئے دیکھا۔ بادشاہ سے کہا

جہاں پناہ نے بائی کی بدسلیقگی ملاحظہ فرمائی؟ کہ حضور بدولت و اقبال سیر و تماشائے ماہتاب فرماتے ہیں اور حاضرین مجلس میں سے ہر ایک کا لباس بادلہ سفید کا ہے اور زیورات الماس کے۔ یہاں تک کہ تمام در و دیوار اور پوشش بھی اسی رنگ کی ہے [illegible] لباس کیا موزوں معلوم ہوتا ہے؟

اس اثنا میں بائی قریب پہونچ گئی اور [illegible] تسلیم بجا لا کر حسب الحکم نور جہاں کے پہلو میں نیر کی طرح سیدھی بیٹھ گئی۔ بادشاہ نے فرمایا۔ . . . بائی بولو! اس عالم میں کہ ہم نے سیر ماہتاب کی تیاری کی ہے [illegible] لباس سفید پہننا چاہیئے تھا [illegible] بائی نے [illegible] عرض کیا

خداوند ہمیشہ [illegible] عروسی کو برقرار رکھے سفید لباس بیوہ عورتوں کے لئے ہے۔ اور بعض ایسی بھی عورتیں ہیں جو اس لباس میں اپنے پہلے شوہروں کی تعزیت کرتی ہیں۔

بادشاہ نے تجاہل سے پوچھا۔ تم اس وقت کیا کر رہی تھیں؟ . . . . . عرض کی کہ پوتھی اور دوہرے پڑھ رہی تھی۔ بادشاہ نے پوچھا کہاں۔ عرض کیا یہ دوہرا سامنے تھا۔

دارو ں ری اس نار کا مہنا
اِک چھانڈ جن دوجا کیا

یہ بات اس وقت بادشاہ کی گرانی ندامت کا سبب ہوئی۔ اسی اثنا میں نور جہاں بیگم نے بادشاہ کی خدمت میں پیالہ پیش کیا لیکن اتفاقاً وہ بادشاہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اور ٹوٹ گیا۔ چونکہ پیالہ بیش قیمت الماس کا تھا۔ بادشاہ نے اُس کے ٹکڑے فرش سے چُن کر نور جہاں کو دیتے ہوئے کہا کہ ان کا زیور بنوا لینا بیگم نے وہ ٹکڑے بادشاہ سے لے کر دور پھینک دئے اور عرض کی کہ جہاں پناہ کو کیا زیب دیتا ہے کہ وہ ایک ٹوٹے ہوئے ظرف کے ٹکڑے اپنے دست مبارک سے اُٹھائیں۔

اجودھیا بائی نے فوراً کہا کہ بیگم تمہیں معلوم نہیں کہ بادشاہ کو ظرف شکستہ سے بہت الفت ہے اور اسے بہت عزیز رکھتے ہیں بیگم ناخوش ہو گئی۔ اور بادشاہ اس بات سے بہت ناخوش ہوا [illegible] اجودھیا بائی سے کہا کہ بائی اب تم رخصت ہو جاؤ [illegible] بائی نے [illegible] عرض [illegible]

[illegible] کچھ [illegible]

[illegible] واقعہ [illegible] اجودھیا بائی نے نور جہاں پر بہت کڑی چوٹ کی . . . واقعہ یہ تھا کہ ایک روز بادشاہ نور جہاں بیگم سے مصروف تکلم تھا اتفاقاً بادشاہ کا دہن نور جہاں کے قریب آیا تو نور جہاں نے عرض کی کہ بادشاہ کے دہن سے بوئے ناخوش

آتی ہے۔ مناسب ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔ دوسرے روز بادشاہ اجودھیا بائی کے محل میں رونق افروز ہوئے اور بزم نشاط گرم کی۔ فرمایا کہ بائی تم نے ہمیں کبھی نہیں بتایا کہ ہمارے منہ سے بوئے ناخوش آتی ہے؟ ....
جب نورجہاں نے ہمیں بتایا اور ہم نے علاج شروع کردیا اجودھیا بائی نے عرض کی کہ جہاں پناہ! یہ تو وہی عورت جان سکتی ہے کہ جس نے دو شوہروں کا منہ سونگھا ہو ....اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"جہاں پناہ ایں را ہماں زن داند کہ
دہان دو مرد بو یدہ باشد۔"

"پڑھ کر ضرور فائدہ اٹھائیے" اور "اگر نہ پڑھیں گے تو نقصان میں رہینگے"

یہ تو آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ آج کل اشتہاری دنیا نے پبلک کو بہت بدظن کر دیا ہے۔ اور کسی قسم کا بھروسہ اشتہاری دواؤں پر نہیں رہا اسی سبب سچ اور جھوٹ کی تمیز مشکل ہو گئی ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر اشتہار نہ دیا جائے تو پبلک تک اپنی آواز کس طرح پہونچائی جائے۔ آپ ضرورتمند ہونے کے باوجود بھی ہمارے اس سچے اعلان سے فائدہ نہ اٹھائیں تو آپکی بڑی بدقسمتی ہوگی۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگر آپ کو ان دواؤں سے فائدہ نہ ہوگا۔ اور حسب تحریر ثابت نہ ہونگی تو قیمت واپس کردیجائے گی بلکہ پندرہ روپئے انعام بھی ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری صداقت اور راستگوئی کے معترف ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں لکھ سکتے بس تجربہ سب کچھ بتا دیگا۔

مقوی طلا

اس صدی کا انمول اور بے بہا جوہر ہے اس حیرت انگیز تیل کی تاثیر ہے ایک منٹ میں فائدہ اٹھائیے نہ پان باندھنے کی ضرورت اور نہ کپڑا پہننے کی حاجت۔ نہ آبلہ و چھالے کا ڈر۔ لگاتے ہی جذب ہوتا ہے اور مردہ جذبات میں فوراً ہی بیداری آجاتی ہے ایک شیشی کے استعمال سے خواہ کسی قسم کے نقائص پیدا ہو گئے ہوں۔ مثلاً کجی، لاغری، کم خواہش، رگوں کا پھول جانا وقت پر شرمندہ ہو جانا۔ وغیرہ کو دور کرکے طاقتور بنا دیتا ہے۔ یقین کیجئے اس سے بہتر طلا آپ کو دنیا کے پردہ پر نہیں ملیگا۔ اسکے استعمال سے رگوں پٹھوں میں نئی زندگی اور جوش جوانی پیدا ہو جاتا ہے۔ زیادہ تعریف خلاف تہذیب ہے بس ایک شیشی منگا کر استعمال کیجئے اور اس کی حیرت انگیز خوبیاں خود ہی دیکھ لیجئے بالکل ناکارہ آدمی کو بھی قابل فخر مرد بنا دیتا اس طلا کا ادنیٰ کرشمہ ہے ہمیشہ کیلئے مردانہ کمزوری کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ نہایت زود اثر اور [illegible] ہے ہر طلا سے نئی روح اور نئی زندگی اس طلا کے استعمال سے مل جاتی ہے۔ یہ دوا تمام ملک میں اپنی زود اثری کی وجہ سے اپنا سکہ بٹھا چکی ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپے۔ رعایتی دو روپے محصولڈاک آٹھ آنے الگ۔

جریان!

شدید قسم کے جریان اور احتلام کو دعوے کیساتھ ہمیں روز میں دور کرتی ہے پیشاب سے پہلے یا بعد قطرہ کا گرنا مادہ کا پتلا ہو جانا سر چکرانا، دل دھڑکنا دماغ کا کمزور رہنا خواہش کا زائل ہو جانا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانا یہ سب جریان کی علامتیں ہیں اس دوا کے استعمال سے مادہ گاڑھا ہو کر کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے فربہی اور تر و تازگی پیدا ہوتی ہے اور ایک شیشی کے استعمال سے تمام مریض جریان کی شکایت دور ہو جاتی ہے یہ دوا جواہرات سے تولنے کے قابل ہے ہزارہا نامرادوں کو بامراد بنا دیا ہے [illegible] کے علاوہ [illegible] کی دھوم مچی ہوئی ہے جریان کے مرض کو دور کرنے کے لئے ہم ہر دواخانے کو چیلنج کرتے ہیں [illegible] کے استعمال [illegible] طبیعت میں پھر وہی جوانی کی امنگ۔ اور مادہ میں اولاد کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے فوراً آزما دیکھئے قیمت فی شیشی تین روپے رعایتی دو روپے محصولڈاک آٹھ آنے الگ۔

خوشوقتی

[illegible] اس کے استعمال سے ہر قسم کی دوا اور تمام مفرحات نشہ آور اجزا سے پاک ملجائیں تو ہم ایکسو روپیہ انعام دینے کو طیار ہیں ہمارا دعوے ہے [illegible] امساک کی پوری قوت پیدا ہوگی سرعت کی شکایت دور ہو جاتی ہے وقت پر شرمندگی اور خجالت سے بچا لیتی ہے اس کے استعمال سے امساک کی قوت مستقل طور پر قائم ہو جاتی ہے آپ ان گولیوں کو ضرور آزمائیں گھر کی تمام راحت ملجائیگی قیمت ایک شیشی ایک روپیہ رعایتی دو روپیہ۔

محصولڈاک مع [illegible] کی تینوں ادویات یکجا منگانے والوں کو محصولڈاک معاف ملنے کا پتہ: سعید برادرس اینڈ کو کلاں محل ایم ۱ دہلی

اسرار و رموز

حضرت راز یزدانی رامپوری

اگر بہار میں اندازۂ خزاں ہوتا
ہم آشیاں جسے کہتے ہیں آشیاں ہوتا

وہ سامنے سر منزل چراغ جلتے ہیں
جواب پاؤں نہ دیتے تو میں کہاں ہوتا

خرد نے بار محبت اٹھا لیا ورنہ
نہ یہ زمین ہی ہوتی نہ آسماں ہوتا

یہ ابر و برق یہ باد بہار کے جھونکے
اگر قفس میں نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا

محبت اور محبت کی مشکلیں تسلیم
سوال یہ ہے کہ کیوں کوئی مہرباں ہوتا

وفور ضبط سے جس کو گمان راحت ہے
شکست ضبط پہ آزردۂ فغاں ہوتا

بجا ہیں عشق کی خودداریاں مگر اے راز
اگر نصیب تجھے اُن کا آستاں ہوتا

طور پہ آ کلیم کے ہوش و خرد شکار کر
یوں نہ چھپا کے حسن رخ جلوؤں کو بیقرار کر

بجلیاں کوندنے لگیں تنکے نہ جل اٹھیں کہیں
طائر آشیاں نشیں آہ نہ بار بار کر

صبر کو ہاتھ سے نہ دے توڑ نہ رسم حسن و عشق
آہ نہ کھینچ شعلہ بار، چشم نہ اشکبار کر

نوک نشتر ناز کی تو لے نوید زندگی
غنچۂ آرزوئے دل رشک صد بہار کر

بحر فنا میں غرق کر اصل لقا کا واسطہ
موج بلا ہم آشنا مجھ کو بھی ہمکنار کر

شیشہ بدست رقص کر چھیڑ کے نغمۂ الست
بادہ بجام چشم سے بزم کو پرخمار کر

شاد یہ ایک عام ہے فلسفہ اہل ہوش کا
حسن کا آسرا نہ لے عشق پہ اعتبار کر

پیدائشی اندھے پن کے سوا آنکھ کی ہر بیماری کا علاج
ریڈیم آئی ڈراپس رجسٹرڈ
جس کے استعمال سے
بیس بیس سال کے پرانے مریضان چشم تندرستی حاصل کر چکے ہیں
آنکھوں کی بیماریوں کے جو مریض ہر طرف سے مایوس ہو چکے ہیں وہ ایکبار ریڈیم آئی ڈراپس آزمائیں یہ بینظیر دوا پیدائشی اندھے پن کے سوا آنکھ کی ہر بیماری کے لئے اکسیر ثابت ہو چکی ہے۔ سرخی۔ دھند غبار۔ جالا۔ خارش۔ پانی بہنا۔ آشوب چشم اور سوزش وغیرہ بیماریاں تو چند ہی یوم میں دور ہو جاتی ہیں اس سے بیس بیس سال کے پرانے ککرے۔ نظر کی کمزوری۔ چیچک کی وجہ سے آنکھوں میں نقص۔ آنکھوں میں پانی اتر آنا۔ ہر قسم کا موتیابند۔ اندھراتا (شب کوری) جیتا یعنی آنکھ کا پھولا بھی دور ہو جاتا ہے۔ تندرست آنکھوں والے اگر اسے استعمال کریں تو بینائی بڑھاپے میں بھی قائم رہتی ہے
جن مریضوں کی بینائی آنکھ کی کسی بیماری سے جاتی رہی ہو ریڈیم آئی ڈراپس کے استعمال سے ان کی آنکھوں میں دوبارہ روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر آخر عمر تک قائم رہتی ہے
قیمت چھوٹی شیشی بطور نمونہ صرف ایک روپیہ۔ بڑی شیشی تین روپیہ
محصولڈاک دونوں صورتوں میں سات آنے لگتا ہے۔ پورا فائدہ اٹھانے کیلئے بڑی شیشی منگوائیں
لوکل ایجنٹس
میسرز نرائن داس بھگوان داس کیمسٹس انارکلی لاہور و چاندنی چوک دہلی
میسرز بیلی رام برادرس سوداگران انگریزی ادویات انارکلی لاہور
ڈاکٹر کشن چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ چوک انارکلی لاہور
ہر جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ ایجنسی حاصل کرنے کے لئے ہم سے خط و کتابت کریں
ماڈرن کیمیکل ورکس پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱ لاہور
آنکھ کا پھولا زائل ہو گیا
ریڈیم آئی ڈراپس کے استعمال سے میرے لڑکے کی آنکھ کا پھولا بالکل زائل ہو گیا۔ اس خوشی میں مبلغ چھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج رہا ہوں میری طرف سے دو شیشی ریڈیم آئی ڈراپس مستحق مریضوں میں مفت تقسیم کر دیں
موتیابند سے نجات
ہیر عالد کی آنکھوں میں موتیابند اتر آیا تھا۔ ریڈیم آئی ڈراپس کے استعمال سے افاقہ ہو گیا ہے خدا آپکو جزائے خیر دے اس سے زیادہ کیا عرض کروں۔ عبدالحمید
اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر مظفر پور
حوصلہ افزا نتائج
آپکا تیار کردہ ریڈیم آئی ڈراپس
ہمارے ہاں اکثر مریضوں کو دیا گیا
اس سے نہایت حوصلہ افزا نتائج
ظاہر ہوئے ہیں۔ براہ کرم مزید
ضرورت کیلئے ایک درجن شیشی
بذریعہ وی۔ پی بھیجدیں۔
مینجنگ پروپرائٹر
زنانہ دواخانہ دہلی
ککرے دور ہو گئے
میں علاج سے مایوس ہو چکا تھا کہ ایک دوست کے مشورہ پر ریڈیم آئی ڈراپس استعمال کرنے پر مجبور ہو گیا صرف چند روزہ استعمال سے سرخی الحمد کہ ککروں کی شکایت جاتی رہی لہذا ایک شیشی قیمتی تین روپیہ مزید بھیجیے
کنہیا لال ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ
لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
ریڈیم آئی ڈراپس کو ہر گھر میں موجود رہنا چاہیئے
ریڈیم آئی ڈراپس استعمال کرنیوالوں کی نگاہ کبھی خراب نہیں ہو سکتی

اپنے ایک عزیز نوجوان دوست کی عجیب و غریب سرگذشت جو اب ملک کے نامور ادیب ہیں

سامنے والے دریچے میں روشنی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی عارف نے محسوس کیا جیسے کسی کی دو تیز نگاہیں فضا میں تیرتی ہوئی آئیں۔ اور اُس کے جسم میں اس طرح داخل ہو گئیں جیسے بجلی کی رَو تانبے کے تاروں پر دوڑ جائے۔ اس نے اپنی نظریں کتاب پر جما دیں اور زیر لب لاحول پڑھنے لگا۔ تین چار روز سے برابر یہی قصہ ہو رہا تھا۔ جوں ہی رات کو مطالعہ کے لئے وہ اپنے کمرے میں آ بیٹھتا۔ سامنے والے دریچے میں پُراسرار واقعات ظہور پذیر ہونے لگتے، مثلاً زم زم قہقہے، ہلکی ہلکی سسکیاں، دھیمی روشنی . . . . . اس مکان میں عرصے سے ریلوے کے ایک ملازم بابو لطیف کرایہ دار کے رہتے تھے۔ وہ غالباً پنجاب کے کسی ضلع کے رہنے والے تھے۔ عارف سے بھی اُن کی صاحب سلامت تھی۔ بلکہ بابو جی عارف، یا مولانا ابوالمکارم عارف . . . . کیونکہ وہ اپنے آپ کو اسی لقب سے ملقب کرنا زیادہ پسند کرتا تھا . . . . . کے زہد و تقویٰ سے کافی مرعوب بھی تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ :-

عارف صاحب ماشاء اللہ ایک نوجوان صالح اور اپنے ہم چشموں میں ہر اعتبار سے ممتاز ہیں۔

صرف بابو صاحب ہی نہیں بلکہ محلہ میں ہر شخص کی یہی رائے تھی۔ کیوں نہ ہوتی جبکہ عنفوان شباب میں عارف نے درس نظامیہ ختم کرکے فقہ و کلام کا بطور خود مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ وہ کتابوں کا کیڑا مشہور تھا۔ اور اُس کی دینی حمیت اور مذہبی غیرت کے لوگوں میں چرچے تھے۔ یہ عمر اور یہ کردار۔ لوگ تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ماشاء اللہ یہ نوجوان سلف صالحین کا نمونہ ہے۔ عارف کو بھی اپنی ان خصوصیات کا علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زہد و تقوے کی نمائش اور حمیت و تقشف کے مظاہرے میں کبھی کوتاہی نہ کرتا۔ گھٹا ہوا سر ترشی ہوئی لبیں، بڑھی ہوئی داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، چہرے پر خشونت و کرختگی، لبوں پر عربی کے ضخیم الفاظ ———— یہ تھے حضرت مولانا ابوالمکارم عارف ارشدی سلمہ الرحمٰن۔ جن کا سن شریف ہنوز تیس برس سے متجاوز نہ تھا۔

عارف جہاں اپنے معمولات و وظائف میں شدت پسند تھا، وہاں وہ دوسروں کے ساتھ بھی رعایت و حسن سلوک پسند نہ کرتا تھا۔ گھر تو گھر محلہ بھر میں کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ تفریحی مشاغل میں حصہ لے سکے۔ سینما، تھیٹر اور ریڈیو تو خیر بڑی چیزیں ہیں۔ اگر کنبہ کی لڑکیاں کبھی کبھار گڑیا کے بیاہ کے گیت گانے بیٹھ جاتیں تو مولانا عارف "لاحول ولا قوۃ" کے ہتھیار اور "نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات" کے پتھرے کر اس بُری طرح پھیلتے کہ قیامت آجاتی۔ عارف کو کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ اُس کے خیال میں یہ چیز حلم و متانت کے خلاف تھی۔ دوستوں سے ملنا جلنا لہو و لعب میں داخل تھا۔

کہیں آنا جانا ضیاعِ وقت سے کم نہ تھا۔ وہ اپنی عمرِ عزیز کو ان لغویات و خرافات میں برباد کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ خوشباشی زندہ دلی، شاعری، بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی اور جدت پسندی سے عارف کو وہی نسبت تھی جو کسی نوجوان شاعر کو سنجیدگی خشکی خودداری اور قدامت پسندی سے ہو سکتی ہے۔ . . .

نہ معلوم ظالم نے کرم خوردہ کتابوں کا ایک ڈھیر کہاں سے جمع کر لیا تھا۔ . . . . بس وہ تھا اور دیمک زدہ پشتارلوں کا انبار . . . . ظاہر ہے کہ اس وضع اور قماش کے آدمی پر تیر اندازی کی مشق کرنے کے لئے ایک کیوپڈ نہیں اگر دس ہزار کیوپڈ بھی اپنے بازوؤں کا تمامی زور اور اپنی قادر اندازی کی آخری طاقت صرف کر دیں۔ تب بھی کامیاب نہیں ہو سکتے یہی وجہ تھی کہ حضرت مولانا عارف الرشدی ابھی تک بھی بچے اور حوا کی کسی دختر نیک اختر کو یہ شرف حاصل نہ ہوا تھا کہ وہ ان کے کاشانۂ اقدس میں باریاب ہو کر خداوندِ علم و عرفان سے ایوار پا سکے۔ عارف کو اپنی خلوت و بیگانگی خود بھی عزیز تھی۔ صبح سے شام تک اس کا محبوب شغل کتابوں کی ورق گردانی اور وعظ دینا تھا۔ رات کو اوراد و وظائف سے فراغت پا کر وہ ایک بغلی حجرے میں چلا جاتا اور بعض کی دھیمی روشنی میں . . . وسیر اور منطق و کلام کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا۔ یہ تاریک حجرہ سامنے والے مکانوں کی لمبی قطار کے متوازی ہو کر تھا۔ اور پیش رو یہ دریچے کے بالکل مقابل واقع ہوا تھا تین چار روز سے برابر عارف اس تنگ دریچے میں ایک خاموش ہنگامہ محسوس کرتا۔ جیسے کوئی اس کی محویت و استغراق میں خلل انداز ہو رہا ہے۔ کسی کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں وہ اپنی بے تاب داڑھی کھجلا کر اس عقدے پر غور کرتا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ بھلا کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ یوں بے محابا حضرت عارف پر نگاہِ بد ڈال سکے۔ . . . تین چار روز تک وہ یہی خلجان محسوس کرتا رہا۔ آخر ایک روز اس نے ارادہ کیا کہ وہ ہمت کر کے اجنبی مخاطب کا پتہ چلائیگا اور ہو سکیگا تو لاحول کے دو ایک ڈھیلے بھی پھینک ماریگا۔ عارف کے خیال میں ابلیس لعین نے یہ شرارت اس کی توجہ ہٹانے کے لئے کی تھی۔ کیونکہ بچپن ہی سے وہ اس وجودِ گمراہ و خبیث سے ایک خطرۂ شدید و وسوسۂ عظیم محسوس کرتا تھا۔

آج اس نے جلدی جلدی وظائف شام اور معمولات شب سے فراغت حاصل کر لی۔ اور اپنے حجرے میں اس عزمِ محکم اور یقینِ واثق کے ساتھ داخل ہوا کہ وہ بے دھڑک اس شیطان الرجیم کا پتہ چلائے گا جو کئی روز سے دریچے میں چھپکر اسے پریشان کرتا ہے۔ اسے ابھی اپنی کتاب سنبھالے چند ہی لمحے گذرے تھے کہ دریچہ کھلنے کی ہلکی آواز نے غنیم کی آمد سے متنبہ کر دیا۔ وہ ایک مرتبہ کھانسا کھنکھارا اور پھر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اچانک ایک باریک دبی ہوئی ہنسی کی آواز سے اس کے کان کھڑے ہو گئے اور لاحول ولاقوۃ کے زبردست لفظ اس کے ہونٹوں پر آتے آتے رک گئے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ ہنسنے والا تیز نظروں سے اسے گھور رہا ہے۔ اس نے بے محابا پیچھے پھری اور دریچے کی طرف دیکھا۔ . . . ارے سولہ سترہ برس کی خوبصورت لڑکی . . . دریچے میں بیٹھی ہوئی مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی

مولانا کی رگ رگ میں سنسنی سی دوڑ گئی اور لڑکی جھپ سے نیچے بیٹھ گئی۔

لیجئے یہ تھا وہ شیطان رجیم اور ابلیس ملعون جو حضرت مولانا عارف صاحب کا دشمن جانی بنا ہوا تھا۔ عارف نے اپنے دل میں اطمینان و مسرت کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ کیونکہ اب اسکا مقابلہ شیطان سے نہ تھا بلکہ ایک کمزور

لگی ہوئی تھا۔ جس کی صنف کے متعلق عارف کا نظریۂ عمومی یہ تھا کہ اس میں نہ دین ہوتی ہے اور نہ عقل۔ ۔ ۔ ۔ آج عارف خلافِ معمول رات گئے تک حجرے میں بیٹھا ورق گردانی کرتا رہا۔ مگر وہ شریر لڑکی نہ آئی۔ دوسرا دن بھی صاف گذر گیا البتہ تیسرے دن پھر شرارت شروع ہوگئی۔ ۔ ۔ ۔ کسی نے ایک چھوٹا سا ڈھیلا جس پر کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ دریچہ سے تاک کر مارا جو مولانا کے سر و ریش سے ٹکراتا ہوا آغوشِ مبارک میں آگرا۔ یہ ایک رقعہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ صرف چار لفظ۔ ۔ ۔ ۔

حضرت مولانا۔ ۔ ۔ سلام علیکم۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وعلیکم السلام۔ ۔ ۔ ۔ عارف نے اس طرح جواب دیا جیسے سلام کرنے والا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"مزاج مبارک"

اتنا اضافہ خود مولانا نے کر دیا۔ مگر دریچے سے کوئی جواب نہ آیا۔ عارف نے بھی مزید توجہ نہ کی۔ اور رسمی سلام و مزاج پرسی کے بعد یہ عجیب و غریب ملاقات۔ جسے ملاقات کہنا رسمِ ملاقات کا مذاق اڑانا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ختم ہوگئی۔

پھر دو تین روز سناٹا رہا۔ ایک روز جب عارف مایوس ہو کر حجرے سے اٹھنے والا تھا تو عجب تماشا ہوا۔ بن کھلی کلیوں کا ایک خوبصورت ہار فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا مولانا کی پشت سے آ ٹکرایا۔ ۔ ۔ ۔ ہار کے سرے پر ایک پرزۂ کاغذ منسلک تھا

زیارت کی مشتاق ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بسم اللہ! مولانا کی زبان سے نکلا اور آپ تن کر دریچے کی طرف کھڑے ہوگئے۔ ۔ ۔ ۔ ایک خوبصورت چہرہ جو دوشیزگی اور نوجوانی کے رنگ سے گلنار ہو رہا تھا۔ مولانا کی نظرِ انور کے سامنے تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بارک اللہ۔ ۔ ۔ ۔ چشم بد دور۔ ۔ ۔ سبحان اللہ۔ ۔ ۔

عارف کی زبان سے یہ الفاظ اس طرح ادا ہوئے جیسے وہ کسی ضخیم عربی کتاب کو بلند آواز سے پڑھ رہا ہے اور دریچے سے ایک پُرشور قہقہہ بلند ہوا۔ کھڑکی بند ہوگئی۔ عارف حیرت و تعجب سے وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ درحقیقت وہ اس وقت ایک عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ تیس برس کی عمر میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ صنفِ نازک کا کوئی فرد اس سے اس قدر بے حجاب ہو۔ مولانا عارف کے دل پر خانقاہوں جیسا تقدس اور صومعوں جیسی سنگینی تھی۔ اِن سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے معنی یہ تھے جیسے کوئی قدیم عبادت خانوں کے اندر قہقہے مار کر ہنسنے یا کسی تاریخی مقبرے میں عُریاں مذاق اور نوک جھونک شروع کردے عارف نوجوان سہی تاہم علم و متانت کا پیکر تھا۔ اور چونکہ بچپن سے اُس کے کانوں میں نسوانی آواز کے رسیلے نغموں کے بجائے پند و موعظت کے ثقیل الفاظ پڑے تھے اس لئے وہ حیران تھا کہ اس اجنبی شریر دوشیزہ سے کیونکر عہدہ برآ ہو

عارفہ اور عارف کی طبیعتوں کے اختلاف سے غالباً گھر میں، کنبے میں، پاس پڑوس میں اور محلے میں وہی شخص ناواقف ہوگا جو ان دونوں بھائی بہنوں کے وجود سے ہی لاعلم اور بے خبر ہوگا۔ ورنہ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اگر عارف متانت و سنگینی میں ہمالہ ہے تو عارفہ نرمی اور شوخی میں گنگا۔ ادپر تلے کے بہن بھائی مگر مزاج میں زمین آسمان کا فرق۔ عارف سر سے پاؤں تک مولانا اور عارفہ الف سے ے تک شاعرہ! وہ پند و نصائح کے بولتے ہوئے گراموفون اور یہ شوخی و ظرافت کی گنگناتی ہوئی پیٹ۔ عارف دیوبند و ندوۃ العلما کی تہذیب کے پیکر، عارفہ تمدنِ جدید کی ایک شمع تجلی۔ درحقیقت تربیت و ماحول کے اختلاف نے ان دونوں بہن بھائیوں کو ایک دوسرے

سے اس قدر بیگانہ بنا دیا تھا۔ عارف کی ابتدائی تربیت اُس کے نانا شاہ حافظ جمیل احمد صاحب چشتی قادری مرحوم کے زیرِ سایہ ہوئی تھی اور عارفہ کا بچپن اُس کے خالو میاں پروفیسر کے۔ بی نیازی کی گود میں گذرا تھا۔ اِس طرح عارف و عارفہ کا بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ دو مختلف دنیاؤں میں بسر ہوا۔ ایک وہ دنیا جس میں تسبیحوں کی کھٹ کھٹ تھی۔ دوسری وہ دنیا جہاں نرم و گرم قہقہوں کی گونج۔ اور جب یہ دونوں اپنے اپنے ماحول کے رنگ میں خوب خوب رنج گئے تو پھر تقدیر نے انھیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ خود عارف کے والدین ایک معتدل و محتاط مزاج و رجحان کے مالک تھے۔ وہ نہ نرے "ملا" تھے اور نہ کھرے "مسٹر"۔ عارف کے والد ماجد چنداں نماز و روزہ کے بھی مقید نہ تھے۔ البتہ انھیں اپنے ہونہار طولعمرہ کی ملائیت اور قدوسیت سے کبھی شکوہ نہ تھا۔ ساتھ ہی انھیں عارفہ کی جدت نوازیوں اور آزاد خیالیوں سے بھی للّٰہی بَیر نہ تھا۔ مگر باپ کی مرنجان مرنج پالیسی عارف اور عارفہ کی جابجا حکمت عملی سے قطعی جداگانہ تھی۔ یہ دونوں نوجوان تھے اور شعلہ مزاج۔ عارف اپنے معمولات میں سخت گیر عارفہ اپنے خیالات میں شدت پسند۔ جب وہ اپنے بھائی کے چہرے پر سیہ تاب داڑھی کے گھنے بالوں کو اِدھر اُدھر بلتا دیکھتی تو اُس کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتے اور جب خود عارف اپنی ہمشیرہ عزیزہ کو نئی نئی وضع کے ملبوسات میں محوِ آرائش پاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے اُس کے منہ پر تھپیڑ کھینچ مارا ہو۔ لیکن عارفہ پر مولانا کا ندر نہ چلتا تھا۔ گھر بھر عارف کی ملائیت کا احترام کرتا تھا لیکن اٹھارہ انیس برس کی ایک شوخ لڑکی اُس کی حکومت کے دائرے سے باہر تھی۔ ہرچند عارف نے اپنی مقدس داڑھی، اپنی نورانی صورت، اپنی پاکیزہ زندگی اور تشدد پسند مولویت سے اسے مرعوب کرنا چاہا۔ مگر وہ اللہ کی بندی نہ پگھلی۔ وہ بہشتی زیور، راہِ نجات، تاریخ الانبیاء، سفینۃ التقویٰ، توبۃ النصوح اور مشیرِ نسواں کے بجائے رینالڈز کے ناولوں، منشی پریم چند کے افسانوں، جوش کی نظموں اور تازہ بتازہ بالتصویر رسالوں سے دلچسپی لیتی نظر آتی ۔ ۔ ۔ ۔ عارف کی ذاتی رائے تو یہ تھی کہ بہن کی شادی ملّا غلام رسول مرحوم کے صاحبزادے مولانا عبد النبی کے ساتھ کی جائے جو عربی کے فارغ التحصیل، عارف کے ہم درس اور شہر کی جامع مسجد میں ملّا صاحب مرحوم کے بجائے امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مگر خود عارفہ اپنی رفاقت حیات کے لئے اپنے خالہ زاد بھائی جمیل کو منتخب کر چکی تھی۔ جو علی گڑھ سے اپنی تعلیم ختم کر کے بی۔ سی۔ ایس میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ اور اب عارفہ کا طلبگار تھا۔ جہاں تک مالی حالت کا تعلق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ملّا عبد النبی بھی نرے امام مسجد نہ تھے۔ بلکہ چند لاوارث اوقاف کے متولی اور چند قومی اداروں کے خزانچی بھی تھے۔ اور اسلئے اُن کی نجی زندگی ریاسانہ تھی۔ ایک اعتبار سے وہ قومی لیڈروں میں بھی شمار کئے جاتے تھے کیونکہ شہر کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے اُن کے ظاہر و باطن تعلقات تھے۔ عارفہ بھی ملّا عبد النبی کی اِن خصوصیات سے واقف تھی۔ اس نے دو ایک مرتبہ ملّا صاحب کی تقاریر، خطبات اور وعظ بھی سنے تھے۔ اسی لئے وہ جانتی تھی کہ پستہ قد، مضبوط جسم، عریض و وسیع توند، گنجان و سیاہ داڑھی، خشک و بے نمک خد و خال اور مولویانہ و لیڈرانہ نقش و نگار رکھنے والا یہ ہیبتناک انسان حقوقِ زوجیت و فرائضِ شوہریت کی ادائیگی میں کچھ کم مستبد و پُر جوش ثابت نہ ہوگا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ملّا عبد النبی کا خیال آتے ہی اُس کی نفاست پسند طبیعت کو ابکائیاں

آنے لگتیں اور وہ حیران رہ جاتی کہ آخر عارف نے ہم دونوں میں کیا ایسی مشترک خصوصیت دیکھ پائی ہے جو وہ اسقدر شدت واصرار سے دونوں کو ازدواج و مناکحت کی زنجیروں میں جکڑ دینے کا حامی ہے۔

تجویز یہ تھی کہ پہلے حضرت مولانا عارف کے شرعی فرض سے سبکدوشی حاصل کی جائے اور اس کے بعد عارفہ کی زندگی کا مسئلہ طے کیا جائے۔ عارف صاحب کی منگنی ابھی کہیں نہ ہوئی تھی مگر سب لوگ جانتے تھے کہ ملا عبدالغنی صاحب کی بیوہ بہن اس عزت سے سرفراز ہوگی۔ ہر چند کہ ابھی عارف اس فرض کی ادائیگی پر طیار نہ تھا۔ مگر ایک تو ملا صاحب کا اصرار دوسرے خود عارف کا یہ ارادہ کہ ازدواج و مناکحت سے فارغ ہو کر وہ عالم اسلام کی سیاحت کے لئے روانہ ہو جائے۔ یہ چند در چند مصلحتیں تھیں جنکی بنا پر عارف کی شادی کا مسئلہ پورے زور شور سے چھڑ گیا۔ عارفہ نے گھر میں جو بھائی کی شادی کے تذکرے سنے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جس روز عارف کی شادی ملا عبدالغنی کی بہن سے ہوئی۔ خود ملا صاحب کے پیام اسکے لئے آجائینگے اور پھر مشکل ہی سے وہ اپنی جان بچا سکیگی، یہ تھے وہ پس پردہ واقعات، جنھوں نے عارف و عارفہ کو سخت ترین کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ عارفہ کی تمام تر توجہات جمیل کی ذات پر مرکوز تھیں۔ اور مولانا عارف کی . . . . ؟ ہاں اب ان کی توجہات کا نقطہ ایک پر اسرار دریچہ . . . . ایک دھندلی جھلک . . . . ایک حسین چہرہ . . . . اور ایک متبسم پردہ نشین تھی۔ . . . . جو ان کے تصورات کے افق پر ایک جگمگاتے ہوئے ستارے کی طرح نہیں بلکہ ایک چنچل بجلی کی طرح چمک کر ظاہر ہوئی تھی۔ . . . . مولانا کو اس کے متعلق کچھ علم نہ تھا . . . . مگر یہ کہ وہ اُن کی ذات سے غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے۔ مولانا نے چند مرتبہ اس معاملے میں آئینے سے مشورہ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جسمانی تناسب اور ساخت سے محروم نہ تھے۔ کہا جاتا تھا کہ اُن کی آنکھوں میں روحانی جلال کی جھلکیاں نظر آتی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ جوانی کے رنگین اثرات تھے۔ اگر اُن کے خوبصورت رخساروں پر داڑھی نے اُگ کر چہرے کی دلربائی اور رعنائی پر جھاڑو نہ پھیری ہوتی تو بلاشبہ وہ ایک وجیہہ انسان گنے جاتے۔ وہ خوش وضع بھی تھے اور شاندار بھی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہر جمعہ کو پابندی سے حجام کا استرا اُن کے سر مبارک کی وسعتوں کا جائزہ لیتا اور جب وہ سر منڈا کر غسل سے فارغ ہوتے تو اُن کی ہیئت کذائی قابل دید ہوتی۔ . . . . مولانا نے آئینہ میں متعدد بار اپنے جلوۂ جہاں آرا کی زیارت کی۔ مگر وہ کسی مرتبہ بھی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ آیا عہد حاضر کی ایک فیشن ایبل دوشیزہ ان میں اپنی نگاہوں کے لئے کوئی دلچسپی اور سامان تسکین پا سکتی ہے؟ - آخر انھوں نے اس معاملہ کا فیصلہ اُسی ستم ظریف لڑکی پر چھوڑ دیا۔ جو اس شد و مد سے ان پر حملہ آور ہوئی تھی۔ . . . . مولانا نے ایک پرچۂ کاغذ پر چند لفظ لکھ کر شام کو جب "دریچے والی حور" (مولانا اگر شاعری کرتے تو غالباً اُس شوخ تتلی کو اسی نام سے یاد کرتے) اُن کو ستانے اور چھیڑنے کے لئے بالائے بام آگئی تھی۔ . . . . اُس طرف پھینک دئے۔ الفاظ بہت معمولی تھے۔ مگر ان کے پس پردہ مولانا کے زبردست جذبات لہریں لے رہے تھے۔

کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ . . . . مجھ سے آپ کا کیا مطلب ہے . . . . ؟

کچھ نہیں صرف زیارت . . . . !

تاکہ کیونکر ممکن ہے . . . . مولانا کا جواب تھا۔

یہ تو آپ ہی جانیں . . . .

انشاء اللہ میں کوئی صورت نکالوں گا . . . . . .

مولانا عارف نے اپنی عقیدتمند طالبہ کی تسکین کے لئے یہی پیرایۂ بیان زیادہ مناسب سمجھا۔

اور واقعی عارف صاحب نے ملاقات کی صورت نکال لی۔ رات کے بارہ بجے دو گز چوڑی گلی میں ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ اُس روز مولانا نے اپنی روایتی کاہلی اور سستی کو خیرباد کہہ کر صبح ہی صبح غسل کیا۔ داڑھی کو حنا آلود کیا گیا۔ لباس کے معاملہ میں بھی خاص اہتمام ملحوظ رکھا گیا جب عارفہ نے ہنس کر دریافت کیا . . . . .

بھیا! آج کیسی طیاریاں ہیں۔

تو مولانا نے پوری متانت سے جواب دیا۔

شکرِ نعمت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ نعمتِ الٰہی سے فائدہ اُٹھایا جائے

مگر دن بھر عارف صاحب عجب اُدھیڑبن میں مبتلا رہے۔ رات کا خیال آتے ہی اُن کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔ ضمیر و نفس اور دل و دماغ میں شدید ترین کشمکش برپا تھی۔ آخر وہ تمام رکاوٹوں پر غالب آئے اور جب اُن کے مردانہ مکان کا بھاری بھرکم گھنٹہ بارہ بجا رہا تھا تو وہ چوروں کی طرح گلی میں چھپے ہوئے اس کی ضربات گن رہے تھے . . . . ایک . . . . دو . . . . تین .

. . . . پورے بارہ پر سامنے والے مکان کے دروازے کے کواڑ ایک مدھم آواز کے ساتھ کھل گئے اور ایک سایہ سا نمودار ہوا۔ اگر آپ مولانا پہلے مولانا ہوتے تو وہ اِس موقعہ پر ایک زبردست قسم کی "لاحول ولاقوۃ" پڑھے بغیر نہ رہتے۔ مگر عارف کی دنیا بدل چکی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں اب دوسری دنیا کے بجائے یہی دنیا جنت کا نمونہ تھی۔ وہ اب حوروں سے زیادہ آدم و حوا کی بیٹیوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ پہلے اُسے ہر وقت موت کا خیال رہتا تھا۔ مگر اب وہ زندہ رہنے میں زیادہ مسرت محسوس کرتا تھا . . . . . ہاں تو حضرتِ مولانا نے ایک خوبصورت قسم کے سایہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا وہ ششدر رہ گئے۔ انھیں اپنے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور سینے میں دل اس زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل پڑیگا چند لمحے تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ آخر وہ سایہ بولتا ہوا محسوس ہوا۔

میرا آداب قبول فرمائیے۔

آداب . . . . مولانا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔ اور وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔ لیجئے وہ پراسرار سایہ اب بے نقاب مولانا کے روبرو تھا . . . . خود عارف کے الفاظ میں سنئے . . . . میں نے دیکھا ایک تیز حمالہ (ایک برقی تپارا) اور ایک جلوۂ بے قرار میرے روبرو ہے۔ فوراً مجھے اُس صانع حقیقی اور احسن الخالقین کی بیتاب صنعت گریوں کا خیال آگیا اور جی چاہا کہ سجدۂ شکر میں عمر گذار دوں . . . . غرضیکہ عارف اس سے زیادہ موزوں پیرائے میں اپنے تاثرات ظاہر کر ہی نہ سکتا تھا۔ ایک مولانا کی زبان سے حسن کی یہ تعریف بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔

. . . . رفتہ رفتہ اُس سائے نے اپنی سیاہ چمکیلی آنکھیں مولانا کے چہرے پر جمادیں اور دل نواز پیرائے میں کہا۔

میں آپ کی زیارت کی بہت مشتاق تھی

عارف کو ایسا محسوس ہوا جیسے الفاظ اس کی زبان

سے پھسلے جا رہے ہیں ۔ وہ بمشکل صرف اتنا کہہ سکا ۔

. . . . یاد آوری کا شکریہ ۔

مگر یہ آپ نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے ۔ خدا کے لئے اپنے علم وفضل کا لحاظ فرمائیے ۔ یہ آپ کی داڑھی ، یہ منڈا ہوا سر یہ آنکھوں میں سرمہ اور . . . . یہ . . . . . عارف کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے داڑھی اُس کے حلق میں پھنسی جا رہی ہے ۔ اور منڈے ہوئے سر پر کوئی ہولے ہولے چپت رسید کر رہا ہے . . . . یہ پُر اسرار سایہ (عارف کے الفاظ میں) بدستور اپنی تقریر میں محو تھا . . . . آپ ہمارے پیشوا ہیں ، آپ کا فرض ہے کہ ہمارے لئے نمونہ بنیں ۔ یہ خشک چہرہ جس پر اعوذ باللہ کی گُلکاریاں ہو رہی ہیں ۔ یہ سوکھے ہوئے ہونٹ جس پر استغفراللہ کی پھلجھڑیاں لگی ہوئی ہیں اور یہ نرمی و ملاطفت سے خالی آنکھیں جن سے لاحول کی چنگاریاں نکل رہی ہیں . . . عارف صاحب معاف کیجئے ، میں ان تمام باتوں کو برداشت نہیں کر سکتی . . . . مولانا نے اسکا کیا جواب دیا ، اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں اور آخر کار یہ عجیب و غریب ملاقات ختم ہوگئی ۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد جو حضرت مولانا عارف الرشدی سلمہ الرحمٰن سے میری ملاقات ہوئی تو دنیا ہی دوسری دیکھی اب وہ صرف پروفیسر رشدی (عربی لیکچرر) تھے یہ تو نہیں کہ داڑھی سے اُن کے رخسار ہائے مبارک بالکل خالی ہوں ، البتہ داڑھی ، سرمہ ، لاحول ، استغفراللہ اور مولویت کا وہ زور شور نہ تھا . . . . مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے خود عارفہ کی شادی جمیل سے کرادی ہے ۔ دو ایک مرتبہ لوگوں نے کہا بھی تو پروفیسر رشدی نے یہی جواب دیا کہ :-

اماں عبدالنبی ! لاحول ولا قوۃ ، وہ تو مال وقف کھا کھا کر موٹا ہوگیا ہے ، اُسے عالم و مولوی کس مسخرے نے بنایا ؟

سب سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ وہ اپنی بیگم صاحبہ کا اصلی نام کسی کو نہیں بتاتے بلکہ آپ صرف توبہ شکن کہہ کر یاد کرتے ہیں . . . . . . توبہ شکن . . . . لیکن عارفہ کا بیان ہے کہ اُس کی سہیلی ممتاز جہاں نے عارف کے سر سے مولویت کا جن خوب اُتارا ۔ اور اپنا پارٹ بخوبی انجام دیا ۔ گو اُس کے نتیجے میں ممتاز جہاں اور عارف عقد و مناکحت کے رشتہ میں بھی منسلک ہوگئے ۔

چاندنی

ظلمت یاس میں شعاعِ امید

دفعتہً اس طرح جھلکتی ہے

جس طرح سے اندھیری راتوں میں

یک بیک چاندنی چھٹکتی ہے

غم کے طوفان میں کشتیٔ امید

دل بیمار کو دکھاتی ہے

بحر ظلمات میں بادِ صبا

جس طرح شمع جھلملاتی ہے

محترمہ سعیدہ مظہر حیدرآبادی

کاش میں عورت نہ ہوتی

ایک ہندوستانی عورت کی دردناک کہانی

وہ رو رہی تھی اور اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ بہن اگر میں عورت نہ ہوتی تو اچھا تھا یا اگر عورت بنی تھی تو پھر مجھ میں شرم کرنیکی عادت نہ ہوتی۔ آج سات سال ہوگئے۔ میری زندگی تمام ہوئی جاتی ہے۔ اور تمہارے بھائی کو کچھ خبر نہیں، کہ میں مر رہی ہوں۔ بس وہ یہ دریافت کرکے چپ ہو رہتے ہیں کہ "آپ زیادہ ترلیٹی کیوں رہتی ہیں"؟ پیاری بہن! تم ہی بتاؤ میں کس منھ سے کہوں کہ میں کیا بیمار ہوں۔ مجھے تو اپنی زبان سے کہتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے کہ میں ماہواری کی بیماری میں مبتلا ہوں اور مجھے اس زمانے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا تم کسی ذریعہ "اُن" تک یہ بات پہنچا دو۔ شاید وہ میرا علاج کرادیں۔

سہیلی نے جواب دیا۔ پیاری بہن! اب ہمیں اپنے مردوں تک ایسی بات پہنچانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے بہت سے اخباروں میں پڑھا ہے کہ عورتوں کی تمام خفیہ بیماریوں کی بہترین دوائیاں دہلی کے "زنانہ دواخانہ" میں ملتی ہیں۔ اور مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ اس دواخانہ کی ہر دوا نہایت عجیب اثر رکھتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عورتوں کی بیماریوں کو عورتیں ہی بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دواخانہ کی دوا "**کورس**" بہت عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی عورت ماہواری کی بیماری میں مبتلا ہو، کپڑے کم آتے ہوں یا رک رک کر اور تکلیف کے ساتھ آتے ہوں۔ یا زیادہ آتے ہوں، یا مہینہ میں دو تین دفعہ آجاتے ہوں یا بالکل نہ آتے ہوں۔ یا ماہواری کی اور کوئی خرابی ہو بہرصورت یہ دوا اپنا اثر کرتی ہے۔ اور خواہ کیسی ہی کمی زیادتی ہو اس دوا کو استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ بالکل صحیح وقت پر اپنی مقررہ تعداد میں بغیر کسی درد اور تکلیف کے ایام ماہواری آنے لگتے ہیں۔ بڑی عجیب دوائی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس دوا کو سینکڑوں بہنوں نے استعمال کرکے اپنی صحت ٹھیک کرلی ہے۔ اسی طرح تم بھی

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ ایم۔ ایس۔ بی ۳۲ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر "کورس" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کرلو تندرست ہوجاؤگی۔ اور ہاں! دوا کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ ایک شیشی "کورس" دو روپے آٹھ آنے کو ملتی ہے۔ اور سات آنے محصول کے خرچ ہوں گے۔ چنانچہ اس بیچاری نے کورس کی شیشی منگا کر استعمال کرلی۔ اب وہ بالکل تندرست ہے۔ ہر ماہ اپنے مقررہ وقت پر وہ ایام سے بغیر کسی درد کے فارغ ہوجاتی ہے۔ پس جو عورتیں اس بیماری میں مبتلا ہیں وہ بھی اس کے استعمال سے تندرستی ٹھیک کرلیں۔ پھر ماہواری بغیر تکلیف کے ہر مہینہ آنے لگے گی۔

ٹیلی فون نمبر ۲۲۶۸   تار کا پتہ "زنانہ دواخانہ" دہلی

عرضِ شوق

یہ کیا ضرور نازِ محبت اٹھاؤ تم
یہ کیا ضرور ذوقِ نظر آزماؤ تم
یہ کیا ضرور خود کو تماشا بناؤ تم
میرے لئے فریبِ محبت نہ کھاؤ تم
سن کر مرا فسانۂ غم مسکراؤ تم
ممکن جو ہو سکے مجھے دل سے بھلاؤ تم

ممکن ہے غم کا بار اٹھایا نہ جا سکے
ممکن ہے دل کا راز چھپایا نہ جا سکے
ممکن ہے پھر تجھے بھی ستایا نہ جا سکے
چھیڑے سازِ غم نہ ابھی گنگناؤ تم
شاید کہ ہو سکے یہی مجھے بھول جاؤ تم
ممکن جو ہو سکے مجھے دل سے بھلاؤ تم

تم میں ابھی تو جرأتِ گفتار بھی نہیں
تم میں ابھی تو جذبۂ خوددار بھی نہیں
تم میں ابھی تو حسن کا پندار بھی نہیں
اچھا ہے ضبطِ غم کے نہ صدمے اٹھاؤ تم
ماضی تو کیا ہے حال کو بھی بھول جاؤ تم
ممکن جو ہو سکے مجھے دل سے بھلاؤ تم

تم سے نہ برہمی کا کبھی شکوہ کرونگا میں ـــــــــــ
تم سے نہ بیرخی کا کبھی شکوہ کرونگا میں ـــــــــــ
تم سے نہ زندگی کا کبھی شکوہ کرونگا میں ـــــــــــ
ـــــــــــ اب آرزوئے دل کو نہ جھولا جھلاؤ تم
ـــــــــــ میں چاہتا ہوں اور ابھی مسکراؤ تم
ـــــــــــ ممکن جو ہو سکے مجھے دل سے بھلاؤ تم

تم اور اٹھاؤ منت و احسانِ آرزو ـــــــــــ
ہو تم تو خود ہی شمع شبستانِ آرزو ـــــــــــ
معلوم ہے تمہیں کہ ہو تم جانِ آرزو ـــــــــــ
ـــــــــــ خود کو نہ آرزوؤں کا خوگر بناؤ تم
ـــــــــــ کوشش کرو کہ اب مجھے یاد آؤ تم
ـــــــــــ ممکن جو ہو سکے مجھے دل سے بھلاؤ تم

گر ہو سکو نہ دل سے بھلانے میں کامیاب ـــــــــــ
پژمردہ روح ناز کو دو اذنِ انقلاب ـــــــــــ
کہہ دو نہ چمکے سینۂ مشرق سے آفتاب ـــــــــــ
ـــــــــــ ہاں مطلعِ امید پہ خود جگمگاؤ تم
ـــــــــــ دانستہ ہر نگاہ سے محشر اٹھاؤ تم
ـــــــــــ میں تم کو یاد آؤں مجھے یاد آؤ تم

وہ چالیس برس سے دینا پور اسٹیشن پر قلی تھا۔ یوں سمجھئے کہ قلی گیری کرتے کرتے اس کی عمر کا بہترین حصہ گذر چکا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں اس نے قلی کا کام شروع کیا تھا اور چوّن برس کی عمر تک وہ قلی ہی رہا تھا۔ اس کے لنگوٹیے ہی ساتھی دوسرے مشغلوں میں پھنس گئے تھے۔ بعض ورکشاپ میں مستری بن گئے تھے۔ کچھ انجن میں کوئلہ جھونکنے لگے تھے بہت سے بیرا اور خانساماں گیری کرنے لگے تھے۔ مگر سجنو ابھی تک قلی تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ فطرۃً قلی پیدا ہوا تھا۔ قلیوں میں جو نرمی، خاکساری اور بردباری پائی جاتی ہے وہ اس میں پوری طرح موجود تھی۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی . . . کیونکہ اس کی نرمی میں شکستگی، اس کی خاکساری میں بیچارگی اور اس کی بردباری میں ایک غم آلود مایوسی پائی جاتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بےجان مجسمہ ہے۔ کسی نے اسے ہنستے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ سجنو کی خاموشی ہر شخص کے لئے معمہ تھی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہر انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے تو ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ وہ انسان نہ تھا کچھ اور تھا کیونکہ پرشور انجنوں، غل مچاتی ہوئی گاڑیوں اور بھیڑ بھاڑ سے گھرے ہوئے پلیٹ فارموں پر بھی وہ ساکت اور حلیم نظر آتا تھا۔ اسٹیشن پر چالیس برس تک رہتے ہوئے اس میں ذرا بھی پھرتی اور چستی نہ پیدا ہوئی تھی۔ . . . . دینا پور اسٹیشن پر کوئی بارہ بجے کے قریب پنجاب میل آتا تھا اور پندرہ منٹ کے قریب ٹھہرتا تھا۔ اس وقت البتہ سجنو کے وجود میں ایک ہل چل سی مچ جاتی تھی۔ وہ اس بیتابی سے میل کا انتظار کیا کرتا تھا۔ جیسے کوئی اسکا مدت سے بچھڑا ہوا عزیز کہیں دور سے آرہا ہے۔ بعض اوقات تو فرطِ بیتابی سے اس کی یہ حالت ہو جاتی کہ وہ سگنل کے قریب جا کھڑا ہوتا اور گردن اٹھا اٹھا کر دور سے گاڑی کو آتا ہوا دیکھتا۔ یہ بات تعجب انگیز تھی کہ سجنو کو چالیس برس تک دینا پور اسٹیشن پر کام کرنے کے باوجود پنجاب میل کی آمد کا صحیح وقت معلوم نہ تھا میل پورے بارہ بجے دینا پور پہونچ جاتا تھا۔ مگر سویرے دس بجے سے ہی اس کی بےقراری ناقابل دید ہوتی۔ کتنی مرتبہ وہ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کی کھڑکی پر نظر ڈال کر سامنے والے گھنٹہ کو دیکھتا اور پھر سکنڈوں، منٹوں اور گھنٹوں کا شمار کیا کرتا۔ اس کے ساتھی قلی اس کے اس بھولے پن پر ہنستے۔ وہ تعجب کرتے کہ سجنو کس قدر مورکھ اور ناسمجھ ہے کہ اسٹیشن کا سب سے پرانا باشندہ ہونے کے باوجود اسے اسٹیشن کی زندگی کے سب سے اہم واقعہ . . . . یعنی پنجاب میل کی آمد کا بھی صحیح علم نہیں۔ سجنو روزانہ اس قسم کی باتیں سنتا مگر کسی نے جواب میں اس کے ہونٹوں کو ہلتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ سنکی اور چڑچڑا ہے، کچھ کا خیال تھا کہ وہ قدرتاً خاموش مزاج اور حلیم واقع ہوا ہے۔ بعض منچلے تو اسے پاگل تک کہنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ مگر وہ ان سب تعریفوں اور تعریضوں سے بے پروا تھا۔ جس طرح سنگین چٹان سے ٹکرا کر تھپیڑے پلٹ آتے ہیں اسی طرح لوگوں

کے طعنے اُس پر بے اثر رہتے تھے۔ بعض زیادہ دور اندیش لوگوں کا خیال تھا کہ سجنو کی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ پنجاب میل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور غالباً یہی خیال سب سے زیادہ اغلب اور قرین قیاس تھا۔ کیونکہ اِس خیال کو باور کر لینے کے لئے چند در چند دلائل موجود تھے۔ کئی مرتبہ خود سجنو سے اِس کے متعلق دریافت کیا گیا تو اُس نے کچھ عجب گول مول جواب دیا۔ جس سے نہ اِس خیال کی تائید ہوتی تھی اور نہ تردید۔ لیکن پھر بھی کہنے والوں کی زبان بند نہ ہوئی تھی وہ ہر مرتبہ یہی کہتے تھے کہ سجنو اور پنجاب میل۔ اِن دونوں کے درمیان کوئی گہرا، اٹل اور خفیہ تعلق ہے۔ اور واقعی یہ خفیہ تعلق تھا بھی۔ لوگوں کا خیال غلط نہ تھا۔ مگر یہ تعلق کیا تھا سجنو کے اپنے الفاظ یہ تھے:۔

مجھے ابھی دینا پور اسٹیشن پر کام کرتے ہوئے دو برس ہی گذرے تھے کہ وہ میرے دل کے چور دروازے سے میری روح میں داخل ہوگئی اور اِس ویران بستی میں اُس نے اپنا مسکن بنا لیا۔ آج تک یہ گھر اسی کا ہے۔ اس گھر کے ہر کونے اور ہر گوشے میں اُس کی چہل پہل ہے۔ چالیس برس ہوگئے مگر اس گھر کی چہل پہل اور اس بستی کی بھیڑ بھاڑ کم نہیں ہوئی بلکہ شاید میری موت کے بعد بھی یہ دنیا آباد رہے۔ . . . .

سجنو ان شاعرانہ لفظوں میں اُس نہ بھلائے جانے والے واقعہ کی طرف اشارہ کیا کرتا تھا۔ جو چالیس برس سے اُسکی زندگی پہ سایہ ڈالے ہوئے تھا . . . . بارش کے دن تھے اور نیلی اُودی، بھوری، کالی، سُرمئی گھٹائیں آسمان پر لدی ہوئی تھیں۔ دینا پور اسٹیشن کے چاروں طرف ہریالی اور تراوٹ کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ وہ برسات کی رُت تھی اور شدید مینہ کی وجہ سے تمام گاڑیوں کا پروگرام اُلٹ پلٹ

گیا تھا۔ صبح سے موسلا دھار پانی پڑ رہا تھا اور دُور تک لائن زیر آب تھی۔ . . . . پلوں پر پانی اس طرح لہریں لے رہا تھا۔ جس طرح بیچ دھار میں دریا گرگرا کر بہے۔ ٹریفک کنٹرولر نے تار کے ذریعہ لائن کی خرابی اور خطرے کی اطلاع دیدی تھی۔ بہت سی گاڑیاں لیٹ تھیں اور ہزاروں مسافر مختلف اسٹیشنوں پر روک لئے گئے تھے۔ پنجاب میل بھی دیناپور اسٹیشن پر آکر معطل ہو گیا تھا۔ کئی گھنٹے سے وہ بھیگا ہوا سہما ہوا اور خاموش . . . . . اس طرح شیڈ میں کھڑا تھا جس طرح کسی زبردست اژدھے کی لاش نمائش کے لئے زمین پر پھیلا دی جائے۔ اور اسکے مسافر . . . ؟ اُس کے مسافروں کا بُرا حال تھا انجینئر نے آئندہ بارہ گھنٹے تک بھی لائن کی درستی اور میل کی روانگی کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا تھا۔ سیکڑوں تھکے ہوئے مسافر بڑبڑاتے ہوئے اور ریلوے والوں کو دل ہی دل میں کوسنے ہوئے اسٹیشن کے ہر گوشے میں پھیل گئے تھے۔ کتنے ہی ہر منٹ کے بعد آسمان کو دیکھ لیتے تھے تاکہ گھٹاؤں کی رنگت اور موسم کے صاف ہونے کی علامتیں دیکھ سکیں۔ بہت سے خوش باش چاء کے اسٹالوں پر چاء پیتے تھے۔ اور ہنس ہنس کر یہ کٹھن وقت گذارنے کی کوشش کر رہے تھے . . . . . الغرض رنگا رنگ مسافروں میں وہ بھی تھی۔ . . . . ایک خوبصورت ساری میں لپٹی ہوئی . . . . . سوٹ کیس ہاتھ میں اُٹھائے . . . . کچھ گھبرائی ہوئی . . . . وضع اور لباس سے وہ ایک دولتمند گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی تھی مگر اُس کے ساتھ کوئی سرونٹ نہ تھا . . . . وہ بالکل تنہا سفر کر رہی تھی۔ . . . قُلی ! قُلی ! ! اِسکی رسیلی آواز میری رُوح کی گہرائیوں میں اُترتی

ں۔ میں فوراً دوڑ کر اُس کے قریب پہونچا اور ادب سے
گیا . . . .

ویٹنگ روم میں کوئی جگہ خالی ہے . . . ؟
نہیں سرکار . . . ہر جگہ مسافر بھرے پڑے ہیں
میں نے دیکھا کہ اُس کی خوبصورت پیشانی پر بل پڑ
ر وہ ایک لمحے ٹھہر کر کہنے لگی

پھر ہم کہاں جائیں . . . ؟
کہاں جائیں . . . . میں اُسکا کیا جواب
. . . . میری نظر میں وہ ایک . . .
در رہتا تھا۔ سیلی ہوئی دیوار . . . اور
رده فرش . . . ایک . . . پرانی زنگ
سی چارپائی پڑی تھی . . . ڈرتے ڈرتے
. . .

آپ چند گھنٹے میرے کوارٹر میں آرام کرسکتی ہیں۔
تمہارے کوارٹر میں . . . ؟ اس نے تعجب سے
یکھا . . . . اچھا چلو وہیں سہی
مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے میرے دل میں بجلی کے پنکھے
لئے۔ یہ بانکی، سندر اور مالدار دیوی . . . میری نیلی
ں میں . . . ؟ اس نے میری بات کو تاڑ لیا اور
ل چھین لینے والی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر نمودار ہوئی
ہمدانہ پیرایہ میں وہ کہنے لگی:۔
گھبراؤ نہیں میں چند گھنٹے سے زیادہ تمہارے کوارٹر
رہونگی۔

اور ہم دونوں آگے پیچھے لائن پار کرکے ریلوے کوارٹر
ٹ آگئے . . . . اُسکا سوٹ کیس میرے ہاتھ میں
ر وہ ہیموں کی طرح تیز تیز میرے آگے چل رہی تھی۔
وٹھری میں پہونچ کر اس نے اپنا بھیگا ہوا برساتی کوٹ

ایک طرف اُتار پھینکا - اب وہ ایک راج کماری کی طرح میرے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی - اُف وہ کتنی خوبصورت اور شاندار نظر آتی تھی - اُس کی ہر بات سے نزاکت اور غرور ٹپکتا تھا . . . . مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دیوی آکاش سے اُتر کر میرے گھر میں آگئی ہے . میں کبھی خواب میں بھی اِسکا تصور نہ کر سکتا تھا کہ میرے اُجڑے ہوئے کوارٹر میں کوئی اتنی خوبصورت ہستی قدم رکھ سکیگی . . . . وہ اِس قدر بے تکلفی سے مجھ سے بات چیت کر رہی تھی جیسے میری اور اُس کی برسوں کی واقفیت اور جان پہچان ہو . . . . کو مدتیں گذر گئیں - پہلے اُس نے میری چھوٹی سی کوٹھری کی جانچ پڑتال کی - . . کوڑا کرکٹ کیسا جمع کر رکھا ہے . . . ؟ دیکھو نا دیواروں پر ہرے بیل بوٹے دار کاغذ کتنے بھلے معلوم ہونگے . . . . اور ہاں ! . . . . یہ تم نے چھت کا کیا حال بنا رکھا ہے . . . .

اُف کیسی بو ہے ؛ دماغ پھٹا جاتا ہے . . . بھلے آدمی چڑیاں تک اپنا گھونسلہ پھول پتوں سے سجاتی ہیں . . . . تم سے اِتنا بھی نہیں ہوتا . . . . وہ یہ باتیں کر رہی تھی اور اِدھر سے اُدھر گھومتی پھر رہی تھی - . . . میں خاموش کھڑا تھا - اُس کی باتوں کا میرے پاس جواب ہی کیا تھا . . . ؟ اچانک اُس نے میری طرف غور سے دیکھا اور اس کے چہرے پر شرم سے سرخی سی دوڑ گئی . . . . تمہارا نام پوچھنا تو میں بھول ہی گئی

میرا نام سجنو ہے دیوی جی !

تو سجنو ! (اس نے ذرا رُک رُک کر کہا) تمہارا بیاہ ہوگیا ؟

ابھی نہیں ہوا سرکار ! (مجھے اِس سوال پر بڑی حیرت ہو رہی تھی)

جب ہی یہ گڑبڑ ہے - گھر تو استری سے بنتا ہے - مرد بیچارا یہ دھندا کیا جانے . . . ؟ ہاں تو سجنو ! تم بیاہ کب تک کروگے . . . . ؟

میں اسکا کیا جواب دیتا وہ ہنسنے لگی ، اُس کی ہنسی میں کتنا رس تھا ؛ اور اس کی باتوں میں کتنی مٹھاس تھی . . . . ؟ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے دنیا کی ہر چیز پر بلا کا سناٹا اور قیامت کی خاموشی چھائی ہوئی ہے . اور اِس بلا خیز سناٹے . . . اور قیامت خیز خاموشی میں اس کی رسیلی منوہر آواز گونج رہی ہے - وہ بولے جارہی تھی اور ہنسے جارہی تھی اور میرے لئے یہ امتیاز کرنا دشوار تھا کہ آیا اس کی ہنسی سے راگ اُبل رہے ہیں یا اُس کے الفاظ سے مسکراہٹیں ٹپک رہی ہیں . . . وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا . . . . یہاں تک کہ اُس کے پپوٹے بھاری ہوگئے اور اُس کی آواز تھرّانے لگی . . . . چند لمحے بعد وہ دیوار سے پشت لگا کر سو گئی . جیسے ارگن باجا بولتے بولتے چُپ ہو جائے . وہ سو رہی تھی اور میں بیٹھا ہوا اُسے تک رہا تھا . . . . باریک تنفس سے اُس کے سینے کا اُبھار . . . . جیسے پہاڑی ندی پر ہوا کی سرسراہٹ سے نازک حباب تھر تھرائیں - میں دور سے بیٹھا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا . . . . دیکھے جا رہا تھا . . . . وہ سو رہی تھی اور سوئے جارہی تھی . . . . یہاں تک کہ . . . . معلوم نہیں کتنی دیر میں اُس کی سندر آنکھوں کی کھڑکیاں کھل گئیں اور اُسکی شفاف روح ان میں اِس طرح مسکرانے لگی جس طرح کسی مقدس مندر کے روشندانوں سے موم بتیوں کی روشنی جھلکنے لگے - اُس نے مجھے دیکھ کر تعجب سے دریافت کیا -

ارے تم ابھی تک ویسے ہی بیٹھے ہو آرام نہیں

کیا تم نے ؟

میں گردن جھکا کر خاموش ہوگیا اور وہ دیر تک مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ اُس کی لمبی سیاہ پلکوں کے سایہ کی دو تیز شعاعیں . . . . تھرتھراتی ہوئی میرے قلب و روح کی گہرائیوں میں اُتر گئیں۔ اور بے اختیار دل کی آخری تہوں سے نکل کر دو گرم بھیگتے ہوئے آنسو آنکھوں میں چھلک آئے جسے اُس نے دیکھ لیا . . . . مگر پی گئی . . .

اَب مطلع صاف ہوچکا تھا اور نیلگوں آسمان دُھلا دُھلا اس طرح چمک رہا تھا جیسے نیلگوں شیشہ کی ایک وسیع چادر پانی میں نکھاری گئی ہو۔ . . . . اُس نے خواب آلود آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

چلو، پلیٹ فارم پر چلیں، وہ دیکھو ریلیف ٹرین مسافروں کو لینے کے لئے اسٹیشن پر آرہی ہے۔

چند گھنٹے قیام کرنے کے بعد وہ میری کوٹھری سے نکلی۔ میری زبان پر اُس وقت تالے لگے ہوئے تھے۔ میری روح میں ایک ہیجان عظیم برپا تھا۔ اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ساری دُنیا میری نگاہوں میں گھوم رہی ہے . . . . آخر ہم دونوں پلیٹ فارم پر آپہونچے۔ قریب کے کسی اسٹیشن سے ایک امدادی ٹرین مسافروں کو واپس لانے کے لئے اسٹیشن پر آچکی تھی۔ اُس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور سرگوشی کے لہجے میں کہا:-

سجنو! اَب ہم جارہے ہیں، مگر تم اطمینان رکھو ہم پھر آئیں گے اور تم سے ملیں گے۔

ہم پھر آئیں گے . . . . یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اور گونجتے رہے جب تک انجن کی تیز سیٹی اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ نے مجھے اُس کی رخصت سے خبردار نہ کردیا . . . . دیکھتا کیا ہوں کہ ٹرین ایک لمبے اژدہے کی طرح بَل کھاتی ہوئی پلیٹ فارم کی حدود سے باہر نکل رہی ہے اور . . . وہ . . . وہ جس کا مجھے نام تک معلوم نہ تھا ٹرین کے ڈبے سے سر نکالے مجھے تک رہی ہے . . . . آہ اُس کی وہ سندر نشیلی آنکھیں۔

یہ تھے سجنو کے الفاظ . . . . اِن الفاظ میں ایک درد تھا، ایک کراہ تھی، ایک تڑپ تھی، ایک سوز تھا بے پایاں . . . . ایک درد تھا بے درماں . . . چالیس برس سے وہ اِسی سوز و کرب میں مبتلا تھا . . . آہ غریب قلی! . . . . اچھا اب اِس کہانی کے مرکزی نقطے پر آیئے

ایک روز ایسا ہی موسم تھا جیسا اُس روز۔ جب سجنو کے جیون میں طوفان آیا تھا۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں لدی ہوئی تھیں، دو روز سے لگاتار بارش ہو رہی تھی اور لائن کو چاروں طرف خطرناک سیلاب نے گھیر لیا تھا کہ دور سے پنجاب میل غُل مچاتا، دھواں اُڑاتا دینا پور اسٹیشن کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اُس روز سجنو سخت پریشان تھا، اُس کی سراسیمگی انتہا سے بڑھی ہوئی تھی وہ ریلوے افسروں پر خفا ہو رہا تھا کہ کیوں وہ ایسے خوفناک طوفانوں میں گاڑیوں کی آمد و رفت کی اجازت دیتے ہیں اور اگر پنجاب میل کو کوئی خطرہ پیش آگیا تو . . . . ؟ ہاں سجنو کی پریشانی قابل دید تھی . . . . مگر تمام دینا پور اسٹیشن ایسے مطمئن تھا جیسے معمولی دنوں میں وہ گاڑی کا انتظار کیا کرتا ہے . . . . ابھی سجنو اسٹیشن ماسٹر سے بحث ہی کر رہا تھا کہ اُس نے پلیٹ فارم پر غیر معمولی چہل پہل دیکھی۔ وہ سمجھ گیا کہ [illegible] اسٹیشن کی [illegible] میں آپہونچا ہے وہ دوڑا کہ گاڑی کو باہر ہی [illegible] ے

کیونکہ اسٹیشن پر تمام لائن زیر آب تھی اور اُس کے دماغ میں وہ تمام حادثے تازہ تھے کہ کس طرح سواریوں سے بھری ہوئی گاڑیاں ذرا سی بے احتیاطی سے تباہ ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کے مسافر۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ ۔ ۔

اُس کی رفتار میں بلا کی تیزی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اِس طرح دوڑ رہا تھا جیسے دو پر اُس کے بازوؤں میں پھوٹ نکلے ہیں۔ لائنوں کو پھاندتا، کھمبوں سے ٹکراتا، مال گاڑیوں کے نیچے سے گذرتا ۔ ۔ ۔ ۔ بیخود ۔ ۔ ۔ ۔ بدحواس ۔ ۔ ۔ ۔ سراسیمہ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سامنے سے پنجاب میل گرجتا ۔ ۔ ۔ ۔ شور مچاتا ۔ ۔ ۔ غل کرتا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دونوں مقابل سمتوں میں دوڑ رہے تھے۔ لوگوں نے غل مچایا قلیوں نے پیچھا کیا ۔ ۔ ۔ مگر دیوانہ انسان اپنی جان پر کھیل چکا تھا۔ یہاں تک کہ پناہ بخدا! ۔ ۔ ۔ ۔ ایک سخت ٹکر ۔ ۔ ۔ ایک ہولناک تصادم۔

پنجاب میل سگنل سے باہر ایک شدید جھٹکے کے بعد کھڑا ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک زخمی انسان انجن کے پہیوں سے ٹکرا کر لائن پر گر پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی رگ رگ مجروح ہو چکی تھی۔ سینے سے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ زبان تالو سے باہر نکل آئی تھی۔ مگر آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ آنکھوں میں ایک لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ اُس کے سامنے سفید ساڑھی میں لپٹی ہوئی ایک غمزدہ سی عورت کھڑی تھی اور وہ ۔ ۔ ۔ ۔ جھک جھک کر اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں آج سجنو کا چالیس برس کا انتظار ختم ہو چکا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ آ گئی تھی ۔ ۔ ۔ سجنو کے جیون کی رانی ۔ ۔ ۔ ۔

الہامِ بشیر

بشیر خاں درانی بشیرؔ جہانگیر آبادی

شگفتگیِ دلِ داغدار کیا کہنا
بہار اور خزاں کی بہار کیا کہنا
ہر ایک زخم ہے جانِ بہار کیا کہنا
دراز دستیِ مژگانِ یار کیا کہنا
اُمیدِ وعدۂ فردا پہ جی رہا ہوں میں
فریبِ زندگیِ مستعار کیا کہنا
یہ ہی شکست کہ عصیاں کا حوصلہ نہ رہا
ہجومِ رحمتِ پروردگار کیا کہنا
بتوں میں رہ کے حقیقت کی جستجو نہ گئی
صداقتِ نگہہِ اعتبار کیا کہنا
مری نظر نہ اُٹھی شکوۂ جفا کر کے
تاثرِ نگہہِ شرمسار کیا کہنا
نیاز و ناز کی خلوت میں کچھ کمی نہ رہی
طلسمِ حسنِ شبِ انتظار کیا کہنا
کبھی بشیرؔ کو محجوبِ التجا نہ کیا
اعانتِ نگہہِ اشکبار کیا کہنا

دل وقفِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
رنگِ سکوں خراب کئے جا رہا ہوں میں
سرکا کے اُن کے چہرۂ پُرنور سے نقاب
فطرت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
اس میں نہیں ہے آپ کی اُلفت کا کچھ قصور
خود زندگی خراب کئے جا رہا ہوں میں
کہہ کہہ کے داستانِ شبِ ہجر حسن کو
مجبورِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
قبلِ بہار، داغِ جگر سے بنا کے پھول
گلشن میں انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
شرما رہا ہوں دیکھ کے دامن کو چاک چاک
وحشت کا سدِّ باب کئے جا رہا ہوں میں
ہمت بڑھا رہا ہوں فتوحاتِ حسن کی
دل کو شکست یاب کئے جا رہا ہوں میں
ہے یہ جنوں کہ غیر تو پھر غیر ہیں سُہاؔ
اپنوں سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

"پیرا ماؤنٹ پکچرز امریکہ کی ایک حسین ترین کامیاب اداکارہ کی ترقی کا راز"

رفعت خیال ایک ایسی صفت ہے جو دنیا سے ... میں بہت کم پائی جاتی ہے مگر یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت آج گلاڈیز کالبرٹ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ... سب سے کامیاب اور ہردلعزیز اداکارہ تصور ... ہے۔

ایک فلم اسٹار کے واسطے جن صفات کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہیں۔ مثلاً حسن صورت اور سیرت ذہانت اور قابلیت، جسم کی صباحت اور موزونیت مکمل ... اور ... منظر۔ مگر اس کے علاوہ مس کالبرٹ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ وہ حزنیہ اور مزاحیہ اداکاری میں یکساں طور پر کامیاب ہے۔ جو شہرت صرف معدودے چند اداکاروں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

اگرچہ اب تک وہ متعدد ... کامیابی سے ادا کر چکی ہے تاہم بہت سے نقادوں کا اب بھی یہی خیال ہے کہ گلاڈیز کے حقیقی جوہروں کا امتحان ... ہے اور اس بارے میں خود مس کالبرٹ کی رائے ... اس سے آپ اُس کے معیار کا ... اندازہ ... اُس کا بیان ہے کہ:

"مجھے یہ پروا نہیں ہوتی کہ میرے لئے کوئی ... قسم کا کردار تجویز کیا جائے۔ اچھا یا برا، شریف یا بدمعاش کمزور یا طاقتور ... اس ... کیوں نہ ہو میں اس کے لئے تیار رہتی ہوں۔ جب میں اپنا پارٹ ادا کرتی ہوں تو مجھے اُس کی ڈرامائی خصوصیت کی تلاش رہتی ہے۔ اور میں یہ سوچا کرتی ہوں کہ کون سے پارٹ میں مجھے اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ مل سکتا ہے صرف یہی ایک سوال ہے جو کسی پارٹ کو قبول کرتے وقت میں اپنے دل سے کرتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ "سکائی لارک" میں اداکاری کے لئے میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں "سکائی لارک" آجکل نہایت کامیاب اسٹیج ڈراما ہے۔

مس کالبرٹ نے ایک جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے پیراماؤنٹ پکچر کے مشہور فلم ARISE MY LOVE میں ریمیلنڈ RAY MILAND کے ساتھ جس کامیاب طریقے سے کام کیا ہے وہ ہر طرح تعریف کے قابل ہے اور اسی لئے وہ پبلک سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔

مس کالبرٹ اپنے بیان کے دوران میں یہ بھی کہتی ہے کہ جب کوئی ڈرامہ نویس دو ایسے نسوانی کردار شناس کرتا ہے جن کو برابر کی اہمیت حاصل ہوتی ہے مگر جو کردار کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور ان دونوں میں ڈرامائی حیثیت سے برابر کے مواقع مل سکتے ہیں تو ایک شریف خوش اخلاق اور ہردلعزیز عورت کے

پارٹ کے بجائے میں بدمزاج اور چڑچڑی عورت کا پارٹ ادا کرنا زیادہ پسند کرتی ہوں مگر بدقسمتی سے مجھے ہر بار ایسا موقعہ نہیں ملتا کہ اپنی مرضی کے مطابق پارٹ حاصل کرسکوں۔

فلم میں اور اسٹیج پر دونوں صورتوں میں کئی برس تک مجھے شریف عورت کا پارٹ ادا کرنا پڑا۔ میرا اصول ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اداکاری میں واقفیت کا اظہار ہو اور شریف عورت کی شرافت میں کچھ ایسی خوبیاں بھی دکھائی جائیں جو کسی شریف عورت میں نہ پائی گئی ہوں۔

لباس کے معاملے میں بھی مس کالبرٹ کو خصوصیت حاصل ہے اُس کی طبیعت میں بلا کی جدت ہے اور اگرچہ اُسے قطعیٔ طور پر جدید فیشن کا موجد تو نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ اِس اعزاز کے لئے ایک نہایت ہی موزوں امیدوار ضرور ہے۔ اِسی لئے پیراماؤنٹ اسٹوڈیوز نے اُسے لباس کے معاملہ میں خود مختار بنا دیا ہے۔ اور یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر دفعہ اُس کا لباس سادگی کے ساتھ ساتھ دلنواز اور جاذب توجہ ہوتا ہے۔

مس کالبرٹ میں ایک صفت اور بھی ہے۔ جو آج کل دوسرے اداکاروں میں بہت کم پائی جاتی ہے ہر ایک کام جو اُس کے پیش نظر ہوتا ہے اُس کے تمام پہلوؤں پر فوری نظر ڈال کر حالات و کوائف کا اندازہ کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اِس کے لئے اُسے دماغ پر زور دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اُس کا دماغ خود بخود اُس طرف رجوع ہوتا ہے۔

آرٹ اور لٹریچر کے علاوہ ڈرامے کے طور طریق کے متعلق بھی اُسکا ذہن رسا غور کر لیتا ہے اور وہ جلد ہی اِن کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کی قابل ہو جاتی ہے پبلک کی رائے سے قطع نظر صورتِ حالات پر غور کرتی ہے اور اس کے متعلق اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتی ہے جو زیادہ ترصحیح ہوتی ہے۔ وہ یہ چاہتی ہے کہ کبھی کبھی اُس کی رائے غلط ثابت ہو۔ تاکہ اپنی غلطی کے وجوہ پر غور کرنے کا بھی اُسے موقعہ مِل جائے۔

اِس اداکارہ کی رائے میں انسان کو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ترقی اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی تدبیر یہ ضرورت ہے اور وہ ہے احساسِ کمتری پر غالب آجانا۔ اُس کے بعد نہایت ہی محنت اور جاں فشانی سے کام کرنے پر دنیا کی کوئی طاقت اُسکا راستہ نہیں رُوک سکتی۔

گو وہ پیرس میں پیدا ہوئی تھی لیکن جیسا کہ اُس کے مدح سراؤں کا خیال ہے وہ غیر ملکی جنس نہیں ہے اداکاری کے تمام مراحل اُس نے نیویارک اور ہالی وُڈ میں طے کئے ہیں۔

اُسکا مسیحی نام کلاڈیٔ ہے لیکن پیار و محبت کی بنا پر اس کا باپ اُسے "للی" "لا لا" کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ میں نے اسکا نام تبدیل کر دیا ہے۔ جب وہ اپنے والدین کے ساتھ نیویارک میں وارد ہوئی تو اُس کی عمر تیرہ برس کی تھی اور اُسکا نام "للی چوچوئن" تھا۔ جس میں اسٹیج پر نمودار ہونے سے قبل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

کلاڈیٔ کالبرٹ کا ارادہ تو یہ تھا کہ وہ یا تو مصوری سیکھنا شروع کرے یا لباس کے لئے فیشن ایجاد کرے لیکن اُس کی یہ آرزو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے پائی تھی کہ ایک دن ایک اجنبی مہمان چائے پر آ پہونچا اور دورانِ گفتگو میں خوش مذاقی سے کام لیتے ہوئے اُس نے مس

کالبرٹ کے لئے اسٹیج کی زندگی تجویز کردی جس نے سنجیدگی کا پہلو اختیار کرکے مس کالبرٹ کو اس کے لئے قطعی مائل کردیا۔ این ۔ لسن ایک مشہور ڈرامہ نگار ہے اس کی ایک دوست لیڈی نے للی کو اسٹیج کے متعلق رائے دی اور اگرچہ یہ محض سرسری گفتگو تھی لیکن للی پر اسکا بہت زیادہ اثر ہوا۔ اور ایک نہایت ہی پُر لطف مگر حجاب آلود انداز میں اُس نے وعدہ کیا کہ وہ اِسکے لئے کوشش کریگی۔ مس مورلسن کی دوست نے اُس کی امداد کا وعدہ کیا۔ اور آخرکار اُس کی خدمات ڈرامہ نولیس کی خدمت میں پیش کردی گئیں جس نے پہلی دفعہ اپنی فلم "ویسٹ کوٹس" (WEST COTTS) میں ایک مختصر سا پارٹ اُسے دیدیا

فلم اسٹار کا بیان ہے کہ اُس کے بعد یکے بعد دیگرے امید اور کامیابی کی شعاعیں میرے نصیب کو منور کرنے لگیں اور میں یہ ضرور کہونگی کہ اس میں میری حاضر دماغی نے بہت مدد دی۔ ممکن ہے اس صفت کو حاضر دماغی نہ کہا جاسکے ممکن ہے یہ سب فریب اور دھوکا ہو لیکن یہ ہم سب لوگوں کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی گریگ پیپرٹن کے مشہور فلم دی میرلونیٹی مین —— THE MARIONETTE MAN میں ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے کے لئے میری سفارش کی گئی۔ اور جب میں نے اُس سے کہا کہ میرا تجربہ کئی سال کا ہے تو مجھے یہ پارٹ مل گیا۔ اگرچہ اُس کے فیصلہ کی تہ میں یہ راز تھا کہ وہ مجھے اپنے ڈرامے کی لاطینی ہیروئن سے بہت کچھ مشابہ پاتا تھا واشنگٹن میں یہ ڈرامہ ناکام رہا اور ایک ناقد نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ڈرامہ تو فضول تھا ہی مگر کالبرٹ کی اداکاری بدترین تھی۔ بعد میں پیپرٹن نے مجھے بتایا کہ اُس ڈرامے کی ناکامی سے اُس نے اِس قدر سبق حاصل کیا تھا جتنا اُسکی کامیابی سے اُسے ہرگز نہیں مل سکتا تھا۔ اور خود میری بھی یہی کیفیت تھی، اُس کے بعد اور ڈرامے سامنے آئے اس وقت تک میں اپنے دل میں آئندہ زندگی کے متعلق قطعی فیصلہ کرچکی تھی اور اسٹیج کو اپنے لئے تجویز کرلیا تھا شکاگو میں لیسلی ہوورڈ (LESLIE HOWARD) سے ملاقات ہوئی تو اُس نے منیجروں اور ایکٹروں کے متعلق تمام حالات سے مجھے آگاہ کردیا۔ اور وہاں سے نیویارک واپس آکر میں مسٹر آل ووڈز ALLWOODS سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہوگئی۔

اُس کے دفتر میں پہونچنے کے لئے مجھے کچھ دقت اُٹھانی نہیں پڑی، اور جب اُس نے میری جائے پیدائش معلوم کی اور میں نے جواب میں پیرس کہا تو وہ اُچھل پڑا کیونکہ وہ خود بھی وہیں کا رہنے والا تھا۔ . . . اِس طرح ہماری جس دوستی کی بنیاد رکھی گئی —— وہ کافی طویل اور سودمند ثابت ہوچکی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ مسٹر ووڈز کو بھی میری ملاقات پر تاسف نہیں ہوا۔

خوش رنگ، خوش مزاج اور بامذاق ہونے کے علاوہ بھوری، بھوری سیاہ مگر چمکدار آنکھیں اور مخمل کی طرح نرم و نازک بال مس کالبرٹ کا طرۂ امتیاز ہیں اس کا جسم نہایت ہی مناسب اور موزوں ہے اُسکا قد ۵ فیٹ ۴ ½ انچ اور وزن ۱۰۸ پونڈ ہے۔ وہ اپنا وزن ۱۱۴ پونڈ تک بڑھانا چاہتی ہے مگر ایک فلم اداکارہ کی حیثیت سے یہ امید موہوم ابھی تک پوری نہیں ہوسکی۔

ایک مدت سے وہ پیراماؤنٹ پکچرز میں کام کررہی ہے اور اُس نے اپنی تصویروں میں نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان میں سے

تجلیاتِ شیرلنگ

نذیر قادری بدایونی

حریمِ ناز میں وارفتۂ فغاں ہوں میں،
جسے نہ سن سکے کوئی وہ داستاں ہوں میں
ادائے حسن یہ کہتی ہے بدگماں ہوں میں
نگاہِ شوق یہ کہتی ہے نوجواں ہوں میں
نظر تو دیر و حرم پر بھی اب نہیں رکتی
کہاں نصیب نے پہونچا دیا کہاں ہوں میں
تماشہ باب ہے اب تک مرے تصور میں
تری قسم کہ ترا اب بھی رازداں ہوں میں
ہزار شکوۂ فرقت کریں تو کیا حاصل
غرورِ حسن یہ کہتا ہے سرگراں ہوں میں
ہر ایک پردے میں در پردہ میری جلوہ گری
ہر ایک قطرے میں چھپ چھپ کے بیکراں ہوں میں
وہی نظر، وہی حسنِ جلوہ گر کا شباب
جہانِ کہنہ میں تیری قسم جواں ہوں میں
ہزار نغمے نہاں ہیں مری خموشی میں
زبانِ حال سے کہتا ہوں بے زباں ہوں میں
نگاہ و دل کی بلندی سے دہر میں نذیر
زمینِ شعر پہ ہمدوشِ آسماں ہوں میں

سلطان میاں سندھی (دہلی)

اگر جذبۂ کامرانی نہیں ہے
تو پھر کچھ بہارِ جوانی نہیں ہے
جوانی کا مقصد ہے جہدِ مسلسل
وہ جہدِ مسلسل کہ فانی نہیں ہے
عمل زندگی کی ہے میزانِ اصلی
عمل کے سوا زندگانی نہیں ہے
بہار اُس چمن میں نہ آئی نہ آئے
جہاں قلم کی گلفشانی نہیں ہے
حرارت نہیں کس لئے قومیت کی؟
رگوں میں اگر خون پانی نہیں ہے
حیاتِ ابد علم و عرفاں سے حاصل
وگرنہ کوئی جاودانی نہیں ہے
نہ قومی حمیت، نہ دینی حرارت
جوانوں میں شانِ جوانی نہیں ہے
حقیقت میں ہے زندگی بے حقیقت
اگر مقصدِ زندگانی نہیں ہے
میں سلطان ہوں ترجمانِ جوانی
مرا کام جادو بیانی نہیں ہے

مشورہ

نسوانی حسن و شباب کی رنگینیاں اور صحت و
جوانی کی رعنائیاں برقرار رکھنے کیلئے

بہار شاہی بال صفا
صابون و پاوڈر

استعمال میں لانا چاہیئے جو نرم و نازک جلد کیلئے نہ صرف یہ
کہ حد درجہ خوشگوار اور مفید ہے بلکہ ہر قسم کے نقصان سے
بچاتا ہے۔ خالص سائنٹفک اصول پر قیمتی اور مفید اجزا
سے طیار کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ
میں اس کی حیرت انگیز خوبیوں اور فوائد کا اعتراف کیا گیا
ہے اور اس کے حیرت انگیز اور عظیم الشان فوائد کے پیش
نظر روشن خیال خواتین اور اعلیٰ طبقے کی عورتوں میں یہ روز
بروز مقبولیت اور ہر دلعزیزی اور حقیقی شہرت حاصل کرتا
جا رہا ہے۔ یہ صابون اور پوڈر ہر اعتبار سے اپنی مثال
آپ ہے۔ اپنے شہر کے سوداگروں سے طلب کریں۔

واحد تقسیم کنندگان برائے تمام ہندوستان

کوہ نور کیمیکل کمپنی
صدر بازار دہلی

دھوکے سے بچئے

تاج محل مارکہ حیدرآبادی بٹن کی لازوال شہرت
دیکھتے ہوئے بعض حاسد اور نقال لوگوں نے ع
کو فریب دینے کا ارادہ کیا ہے۔ یہانتک کہ بعض دو کا
خریدار کو حیدرآبادی بٹن کے نام پر گھٹیا یا کس
دوسری جگہ کے بنے ہوئے بٹن دیدیتے ہیں کہ
استعمال کے دوسرے تیسرے روز ہی میلے ہو ج
ہیں اور مینا جو دراصل رنگ ہوتا ہے اُڑ جاتا ہے ا
خریدار کے دل میں حیدرآبادی بٹن کے نام۔
نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ حیدرآبادی بٹن
اس وقت یورپین ممالک تک اپنی مضبوطی پائدا
اور خوشنمائی کی وجہ سے جو نام پایا ہے وہ محتاج بیا
نہیں اسکی مضبوطی خوشنمائی، دلپسند ڈیزائن اور ک
صفت یہ کہ نرخ واجبی اور خاص تعریف یہ کہ ایک
جوڑی خریدنے کے بعد عرصہ دراز تک چھٹی ہو جاتی
یہ خوبیاں صرف تاج محل مارکہ حیدرآبادی بٹن ہی
پائیں گے آپ بھی اپنی ضرورت کے وقت کوٹ واسکوٹ
شیروانی اور قمیصوں کیلئے تاج محل مارکہ حیدرآبادی بٹ
دیکھکر خریدیں اور معمولی سستے کے لالچ میں رقم ضائع نہ

ملنے کا پتہ

ایس ایم شفیع چاؤلہ صدر بازار دہلی

دنیا جہان کے جانوروں کے عجیب و غریب حالات

شتر گاؤ علی پور (کلکتہ) کے عجائب خانۂ حیوانات میں افریقہ سے ایک تین سال کا شتر گاؤ کا معصوم بچہ لایا گیا ہے جسکا سن ابھی خیر سے تین برس سے زیادہ کا، نہیں ہے۔ مگر وزن ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ماشاء اللہ ۲۵ من وزن ہے یہ جانور کینیا (مشرقی افریقہ) سے ہندوستان میں لایا گیا ہے اور اس کی گرفتاری، تلاش اور پھر ہندوستان تک آمد کے سلسلہ میں تقریباً ۸ ہزار میل کا سفر طے کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس دیوزاد حیوان کے اضافۂ وزن کی یہی رفتار رہی تو ہاتھی کسی زمانے میں اس کے سامنے ایسے حقیر نظر آئیں گے جیسے اونٹ کے برابر بکری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا اُسے حیوانات کی نظرِ بد سے بچائے - آمین

گدھ آپ کو معلوم ہے کہ گدھ کس رفتار سے اڑتا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں معلوم! تو سنئے گدھ موج میں اگر ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتا ہے یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ دہلی سے بمبئی تک چند گھنٹے میں پہونچ سکتا ہے۔

دریائی ہاتھی ہاتھی فقط خشکی ہی میں نہیں رہتا بلکہ اس قوم کے کچھ افراد مچھلیوں کی دنیا یعنی سمندر میں بھی رہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ انکے بازوؤں کے اوپر پَر بھی ہوتے ہیں ۔ یہ پَردار ہاتھی، یعنی حیوانات کا معجزہ مگر یہ پَر فقط تیرنے ہی کے کام آتے ہیں - ورنہ اگر کہیں خدانخواستہ یہ اُڑنے میں بھی مدد دیتے تو پرندوں کی کائنات میں زلزلہ آجاتا - یہ اُڑنے والے پہاڑ کیا کیا غضب ڈھاتے؟

مگس خوار آپ بھُنگے سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ نزاکت و کمزوری سموچی مکھی نگل جاتے ہیں ۔ اور جو چیز انسان سے ہضم نہیں ہوتی وہ جناب ڈکار لیتے ہیں -

اژدھا کتنا خطرناک نام؟ کتنا بھیانک جانور؟ ۔ ۔ ۔ حیوانات کی قوم کا دیوزاد فرد - سانپوں اور ناگوں کا جدِّ امجد - ہندوستان میں کشمیر کی طرف ہوتا ہے چنانچہ ابھی "ہواندچولہ گام" (کشمیر) کے علاقہ میں موضع گودر کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک اژدھے کا بچہ پایا گیا جسکا وزن صرف پچاس من تھا - یہ گذشتہ سال ایک گجراتی مزدور کو صفا چٹ کر گیا تھا -

شیر ببر فقط افریقہ کے جنگلوں میں حیوانات کا شہنشاہ اعظم درندوں کا تاجدار اور بہائم و وحوش کا یہ حاکم اکبر یعنی شیر ببر پایا جاتا ہے - ہندوستان میں اس کی قوم کے ذلیل افراد چیتے اور گلدار دستیاب ہوتے ہیں -

بلیوں کی بہشت آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مجمع الجزائر جاپان کے چند جزیرے فقط بلیوں سے مخصوص ہیں، اُن میں کتے کو جانے

کی اجازت نہیں ۔ ان جزیروں کا نام بھی عجیب و غریب ہے "بلیوں کی جنت" ۔ ۔ ۔ ان جزائر میں فقط بلیوں کی حکومت ہے جزیرہ [illegible] میں [illegible] رکھنے سے ممنوع ہے یہ بلیاں ہزاروں کی تعداد میں رہتی ہیں ۔ اور [illegible] پرندوں کے شکار سے دل بہلاتی ہیں ۔ چونکہ ان جزائر میں کبھی کبھی مردے بھی دفنائے جاتے ہیں ۔ اسی لئے ان گربہائے مسکین کو کبھی قحط اور تنگیٔ معاش کی شکایت پیدا نہیں ہوتی

کبوتر

پرندوں کی برادری کا ایک ذہین اصیل زندہ دل اور خوش باش لیکن انداز شاہانہ عادات شاہانہ ۔ دوران پرواز میں کبھی کچھ نہیں کھاتا ۔ اگر فاصلہ طویل ہو تو بغیر دم لئے پرواز کرتا ہے ۔ جب منزل مقصود قریب ہوتی ہے تو [illegible] سے چور چور اور خستگی سے بدحواس ہوتا ہے ۔ منزل پر پہونچ کر خواہ کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو دانہ کی طرف رخ نہیں کرتا صرف پانی کے دو گھونٹ سے روزہ افطار کر سو جاتا ہے ۔ اس کے دو تین گھنٹے بعد غذا کھاتا ہے اسے یہ فخر خصوصی حاصل ہے کہ بیچارے عاشقوں کا قاصد تیز کام بھی ہے

حیوانات بمباری کے دوران میں

جب صحرائے افریقہ پر بمباری کی گئی تو حیوانات پر اس کے ردِ عمل کے اثرات کا دلچسپ اندازہ کیا گیا ۔ معلوم ہوا کہ طیاروں کی بھنبھناہٹ اور گولوں کی گرج سے شیر جھنجھلانے لگتا ہے اور خوف سے نہیں بلکہ غصے سے کانپنے لگتا ہے ۔ اس عالم پُر آشوب میں لومڑیاں، خرگوش، گیدڑ، جنگلی بلیاں، گوہ، خارپشت وغیرہ بلوں میں جا چھپتے ہیں، ریچھ درخت پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے البتہ بموں کی اس بارش میں بیچارے گدھے کی ذات ہے کہ بیچ میدان میں کھڑے ہو کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتی ہے ۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہے مجھ پر کر لو ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوں کو جانے دو ۔

ریچھ

غالباً حیوانات میں سب سے زیادہ سنجیدہ مزاج کوئی جانور اگر ہوتا ہے تو ریچھ ہوتا ہے ۔ اور مصیبت یہ ہے کہ اس ظالم کو محبت بھی [illegible] ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ [illegible] ۔ ۔ ۔

دل وہاں آیا جہاں امکانِ دلداری نہیں

اس سلسلہ میں شیخو پورہ (پنجاب) میں ایک دلچسپ محبت رونما ہوا ۔ صورت یہ ہوئی کہ شیخو پورہ کے [illegible] سے جھنگا نامی ایک شخص اپنی انیس سالہ نوجوان حیات کو لئے ہوئے اپنے گاؤں واپس آ رہا تھا موضع جاگو والہ کے قریب جنگل میں پہونچا تو اس شخص کا بیان ہے کہ ایک خونخوار قسم کا ریچھ اچانک جنگل سے نکل آیا ۔ میری استری خوبصورت اور سرخ کپڑے پہنے تھی، سب سے پہلے اس سفاک نے مجھ پر حملہ کیا ۔ میں گھبرا گیا اب جو دیکھتا ہوں تو عورت غائب ۔ ۔ یا [illegible] ظاہر ہے کہ میرا کیا حال ہو گا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ میں دیوانہ وار چاروں طرف اس کی تلاش میں پھرنے لگا ۔ آپ یقین کیجئے دو روز اسی سرگردانی میں گذر گئے ۔ بارے کے بعد ایک سنجیدہ مزاج ریچھ جنگل سے نکلا اور آ کر میرا دامن پکڑ کر کھینچا ۔ میں جان سے عاری تھا اس کے ساتھ ہو لیا ۔ ریچھ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے ۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک غار میں پہونچے ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک درجن ریچھ میری عورت کے گرد بیٹھے ہیں اور اسے چاٹ رہے ہیں ۔ عورت کے آس پاس طرح طرح کے [illegible] پڑے ہیں ۔ مجھے دیکھ کر ریچھ ادھر ادھر ہٹ گئے اور عورت مجھ سے لپٹ گئی ۔ اس کی بوسیدہ قمیص میں دو سو روپے بندھے

عرق اکسیر اعظم
رجسٹرڈ
پیٹ کے بیماری کی دوا
مثلاً پیٹ درد کرنا پیٹ پھولنا پیٹ میں میٹھا میٹھا
درد رہنا پیٹ میں گڑگڑاہٹ بےچینی ہونا قبض رہنا پتلا
دست آنا کلیجہ میں درد اٹھنا معدہ کی کمزوری کی وجہ سے غذا
ہضم نہ ہونا، بھوک نہ لگنا سینہ کا جلن ہونا ورم جگر ہونا
تلی کا بڑھ جانا پیشاب زیادہ آنا یا رک رک کر آنا جسکو ذیابیطس
کہتے ہیں، دست اور متلی کے ساتھ قے آنا جسکو ہیضہ کالرا
کہتے ہیں۔ موسمی بخار کا آنا یا معدہ کی خرابی سے کوئی دوسری
بیماری ہو جانا مرض نیا ہو یا پرانا خدا کے فضل سے
عرق اکسیر اعظم استعمال کرنے سے بالکل اچھا ہو جاتا ہے
قیمت فی شیشی ایک روپیہ۔ تین شیشی کی قیمت
دو روپے بارہ آنے محصول علاوہ۔
جناب ڈاکٹر صاحب کی قیمتی رائے ملاحظہ فرمایئے
جناب ڈاکٹر عبد السمیع صاحب دہلی سے رقمطراز ہیں کہ آپکی دوا
عرق اکسیر اعظم کو پیٹ کے مختلف امراض کے بیماروں پر آزمایا
بہت ہی مفید پایا - واقعی اچھی دوا ہے۔
النسوانی
رجسٹرڈ
عورتوں کی پرسوت کے بیماری کی مفید دوا
آجکل ہر گھر میں عورتوں کو سفید رطوبت مثل دھات یا
مٹیالے رنگ کا گاڑھی لیس آنے رہنے کی شکایت
ہو جاتی ہے جسکی وجہ سے بدن کمزور رنگ پیلا ہاتھ پیر
میں جلن دماغ میں چکر آنکھ تلے اندھیرا آجایا کرتا ہے یا
ٹانگ میں درد کمر میں درد۔ بھوک بند طبیعت میں سستی
بے عمل گر جانے مردے گھرانے کمزور اولاد پیدا ہونے
کی شکایت رہتی ہے۔
النسوانی ایسی مجرب آزمائی ہوئی لاثانی دوا ہے کہ عورتوں
کی جملہ بیماری کی شکایت انشاء اللہ دور ہو جائیگی۔
قیمت فی شیشی ایک روپیہ
تین شیشی کی قیمت دو روپیہ بارہ آنے محصول علاوہ
سرٹیفکیٹ (بانجھ عورت کو حمل قرار پا گیا
ملنے کا پتہ:- ایس کے بی بخشی کمپنی ۳۲ کوٹھی والی کوٹھی کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ

A MODERN and economical package—half-pound net Airtight Cartons. Will keep Biscuits fresh and crisp and save the cost of the tins. The following kinds are now obtainable in Airtight Cartons:

DIGESTIVE	CREAM CRACKERS
BARLEY CREAM	PETIT BEURRE
GINGER NUT	NICE
ROMA	THIN ARROWROOT
RICH CREAM	BABY ARROWROOT
Custard Cream	Chocolate Cream Sandwich

CALCUTTA BOMBAY